مطالعۂ تہذیب

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

قرطاس

ڈاکٹر اقبال محمدی کے لیے

گر قبول افتد.......

۷ جنوری ۲۰۱۱ء

کراچی

مطالعۂ تہذیب

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

قرطاس

قرطاس

سلسلہ مطبوعات ۶۲

ربیع الاول ۱۴۲۸ھ/اپریل ۲۰۰۷ء

طبع اول: جون ۱۹۹۳ء

قیمت مجلد/۲۰۰ روپے

زیر اہتمام

قرطاس

پوسٹ بکس نمبر 8453

کراچی یونیورسٹی، کراچی۔ 75270

موبائل: 0300-9245853

ای میل: nigarszaheer@yahoo.com

ISBN

978-969-8448-71-4

انتساب

امی جان

اور

ابو جان

کے

نام

فہرست مضامین

باب اول:	انسان کی تاریخ	۹
باب دوم:	تہذیب کیا ہے	۱۷
باب سوم:	تہذیب کے عناصر ترکیبی	۲۳
باب چہارم:	ہندوستانی تہذیب	۳۸
باب پنجم:	ایرانی تہذیب	۶۵
باب ششم:	یونانی تہذیب	۹۳
باب ہفتم:	رومی تہذیب	۱۰۳
باب ہشتم:	عربی تہذیب	۱۲۴
باب نہم:	اسلامی تہذیب	۱۵۰
باب دہم:	اسلامی تہذیب کی بنیادیں	۱۵۶
باب یازدہم:	توحید	۱۶۱
باب دوازدہم:	رسالت	۱۷۷
باب سیزدہم:	آخرت	۱۹۲

باب چہاردہم:	عبادات	۲۰۶
باب پانزدہم:	نماز	۲۱۲
باب شانزدہم:	زکوٰۃ	۲۲۵
باب ہفدہم:	روزہ	۲۳۶
باب ہیجدہم:	حج	۲۴۷
	نظام ہائے حیات	۲۶۳
باب نوزدہم:	اسلام کا اخلاقی نظام	۲۶۴
باب بیستم:	اسلام کا معاشرتی نظام	۲۷۵
باب بیست ویکم:	اسلام کا سیاسی نظام	۲۹۱
باب بیست ودوم:	اسلام کا اقتصادی نظام	۳۱۵
کتابیات		۳۳۳

باب اول

انسان کی تاریخ

پہلے انسان کے بارے میں سائنس ابھی تک کوئی حتمی اور شافی جواب فراہم نہیں کر سکی ہے۔ اولین انسان تو رہا ایک طرف' سائنس ابھی تک اولین جرثومہ حیات تک کا پتہ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ یورپ' امریکہ اور جدید علوم و فنون کے ماہر ممالک ابھی تک پہلے انسان کی بابت تلاش میں سرگرداں ہیں وہ کون تھا؟ اس کی پیدائش کیسے عمل میں آئی؟ اور کب یہ واقعہ یا حادثہ یا اتفاق رونما ہوا؟

سائنس کے اس عقدہ لاینحل کو قرآن چودہ سو سال قبل آشکارا کر چکا ہے۔ لہٰذا پہلے انسان اور اس کی تخلیق کے بارے میں ہماری معلومات نہایت واضح اور مکمل ہیں۔ پہلا انسان آدم تھا[1] جنہیں اسی وجہ سے ابوالبشر کہا جاتا ہے اور جو خلیفتہ اللہ فی الارض اور پہلے نبی بھی تھے۔

جنات اور ملائکہ کی تخلیق آدم سے قبل ہو چکی تھی۔ آدم کا قالب خشک گارے کی سیاہ مٹی سے تیار کیا گیا تھا جو ہر طرح کا تطور قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور پھر پختہ ہونے پر اس میں اللہ کی روح سے جان پھونک دی گئی۔ وہ عنصر جس سے آدم خاکی کی تخلیق عمل میں آئی مٹی ہے یا ایسا مادہ جو زمین سے حاصل کیا گیا ہو۔ قرآن مجید میں تخلیق انسانی کے مختلف مراتب جو مختلف جگہوں پر بیان کئے گئے ہیں ان کی سلسلہ وار ترتیب مختلف مقامات کی تصریحات کو جمع کرنے سے یوں بنتی ہے۔

تراب[2] : یعنی مٹی یا خاک

طین[3] : یعنی گارا جو مٹی میں ملا کر بنایا جاتا ہے

طین لازب[4] : لیس دار گارا جس کے اندر باسی ہونے کے سبب لیس پیدا ہو جائے

حماء مسنون ص۵ : وہ گارا جس کے اندر بو پیدا ہو جائے

صلصال من حماء مسنون کالفخار ص۲۶ : یعنی وہ سڑا ہوا گارا جو سوکھنے کے بعد پکی ہوئی مٹی کے ٹھیکرے جیسا ہو جائے۔

بشر ص۲۸ : جو مٹی کی اس آخری صورت سے بنایا گیا۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص روح پھونکی اور جس کو فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا۔

جب مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد آدم کی تخلیق مکمل ہو گئی تو انہیں اشیاء کا علم دیا گیا یہ اللہ کی ایسی نعمت تھی جو آدم کو عطا کی گئی' فرشتوں کو نصیب نہیں تھی۔ کچھ عرصہ آدم تنہا زندگی بسر کرتے رہے تاہم فطری طور پر وہ اپنے کسی ہم جنس کی ضرورت محسوس کرتے تھے لہٰذا اس ضرورت کو بھی اللہ نے پورا کیا اور دوسرا انسان جو تخلیق ہوا وہ جسمانی تغیر کے ساتھ بی بی حوا (Eve) تھیں

"وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے" (الاعراف)

حوا کی تخلیق کے بارے میں قرآن تفصیل نہیں بتاتا۔ اس ضمن میں دو آراء ملتی ہیں۔ ایک رائے جو کہ بائبل میں مذکور ہے یہ ہے کہ حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا بخاری اور مسلم کی روائتوں میں بھی یہ حدیث بیان ہوئی ہے کہ عورت کو پسلی سے پیدا کیا گیا ہے

"عورتوں کے ساتھ نرمی اور خیر خواہی سے پیش آؤ اس لئے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔" (حدیث)

اس حدیث کا مطلب ابن اسحاق نے یہ بیان کیا ہے کہ حوا' آدم کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں۔ مگر ابن اسحق سے زیادہ محقق اور نقاد علامہ قرطبی نے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ اس حدیث میں دراصل عورت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ اس کا حال بھی پسلی جیسا ہی ہے اگر اس کی کجی کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی تو جس طرح پسلی کے ترچھے پن کے باوجود اس سے کام لیا جاتا ہے اور اس کے خم کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی اسی طرح عورتوں کے ساتھ نرمی اور رفق کا

معاملہ کرنا چاہئے۔[صد ۸]

اس سلسلے کی دوسری رائے یہ ہے' اور بیشتر محققین اسی رائے کی طرف مائل ہیں کہ آدم ہی کی طرز پر اس کے جوڑے کے طور پر اللہ نے ہی حوا کو بھی تخلیق کیا ہو۔ آدم و حوا' یعنی پہلے اور دوسرے انسان کی تخلیق کے بعد' اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت ان کے اندر رکھ دی کہ ان سے افزائش کا سلسلہ چلے۔ لہٰذا تب سے آج تک نسل انسانی کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔

"اس نے انسان کی تخلیق کی ابتداء گارے سے کی' پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔" (السجدہ)

یہ اور اسی طرح کے دوسرے قرآنی بیانات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کو براہ راست تخلیقی عمل (Direct Creation) سے پیدا کیا گیا اور اس کے بعد خود اسی انسان کے اندر یہ صلاحیت اور طاقت رکھ دی گئی کہ اس کے نطفے سے ویسے ہی انسان پیدا ہوتے چلے جائیں۔

ڈارون کی تھیوری کے بعد بظاہر یہ ایک غیر سائنٹفک نظریہ معلوم ہوتا ہے لیکن اولین جرثومہ حیات کی تخلیق —— یہ ایک ایسا نکتہ ہے جہاں آکر سائنس کی گاڑی رک جاتی ہے۔ اس اولین براہ راست تخلیق کو اگر نہ مانا جائے تو پھر یہ احمقانہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ زندگی کی ابتداء محض ایک حادثے کے طور پر ہوئی ہے۔ حالانکہ انسان تو رہا ایک طرف اگر ہم کسی ایک خلیہ جاندار (Uni Cellular) کو ہی دیکھیں تو زندگی کی یہ سادہ ترین صورت بھی اس قدر پیچیدہ باریکیوں اور نازک حکمتوں سے لبریز ہے کہ اسے محض ایک حادثہ یا اتفاق قرار دینا قطعی ناقابل یقین ہے۔ اگر ایک دفعہ آدمی یہ بات مان لے کہ حیات کا پہلا جرثومہ براہ راست تخلیق سے وجود میں آیا تھا تو پھر آخری بات ماننے میں کیا قباحت ہے کہ ہر نوع حیوانی کا پہلا فرد خالق کے براہ راست تخلیقی عمل سے پیدا ہوا اور پھر اس کی نسل' تناسل (Procreation) کی مختلف صورتوں سے چلی۔[صد ۹]

یہ درست ہے کہ سائنس دان ابھی پوری طرح اس بات کا ادراک نہیں کر سکے

ہیں کہ مواد ارضی سے بشر کس طرح بنایا گیا؟ پھر اس کی صورت گری اور تعدیل کس طرح ہوئی؟ اور اس کے اندر روح پھونکنے کی نوعیت کیا تھی؟ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز آج سائنسی ادراک کی گرفت میں نہ ہو اس کے ساتھ کل بھی یہی معاملہ ہو' ہو سکتا ہے کہ آئندہ آنے والی صدیوں میں سائنس اس عقدہ کو حل کرلے۔ لیکن کسی ایک آفاقی نظریئے کو ہم محض اس لئے نہیں جھٹلا سکتے کہ وہ سائنس کی پہنچ سے ہنوز باہر ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے طاعون کی بیماری قدیم زمانے میں بھی موجود تھی لیکن لوگ اسے بیماری کے طور پر نہیں بلکہ "عذاب الٰہی" کے طور پر جانتے تھے۔ لیکن چودھویں صدی عیسوئی میں اسے مسلمان طبیبوں نے متعدی مرض قرار دیا' اس کی علامات' احتیاطی تدابیر' اور علاج وغیرہ تجویز کئے[1] طاعون جسے میڈیکل سائنس نے متعدی مرض کے طور پر چودھویں صدی عیسوئی میں متعارف کرایا کیا اس سے قبل دنیا میں موجود نہیں تھا؟ یقیناً تھا' سائنس نے اس کا ادراک دیر سے کیا اسی طرح یہ قرآنی نظریات' مزید سائنسی دریافتوں' ایجادوں اور انکشافات کے بعد زیادہ بہتر طریقے سے سمجھے جا سکیں گے۔

آدم و حوا سے جس نسل انسانی کی ابتداء ہوئی وہ بتدریج بڑھتی اور پھیلتی رہی جس کے نتیجے میں مختلف خاندان اور قبائل وجود میں آتے رہے اور زمین آہستہ آہستہ ان سے آباد ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ اولاد آدم میں بگاڑ پیدا ہونے لگا اور انہوں نے بتوں کو پوجنا اور شرک کرنا عام کر دیا اور من حیث القوم دیگر اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہو گئے تو ان کی ہدایت کے لئے حضرت ادریسؑ کو منتخب کیا گیا انہوں نے پھر سے اولاد آدم کو توحید کا پیغام دیا۔ نسل انسانی نے ان کی اطاعت قبول کر کے اللہ کی بندگی اختیار کر لی۔ وہ ۳۵۳ سال تک نسل انسانی پر حکمران رہے[11] ان کی حکومت انصاف اور حق پرستی کی حکومت تھی ان کے عہد میں تمدن نے خاص ترقی بھی کی۔

چند صدیوں میں نسل آدم میں پھر گمراہی اور بے راہروی پیدا ہونے لگی حضرت ادریسؑ کی پھیلائی ہوئی توحید کی جگہ خود ساختہ بتوں نے لے لی' ایک اللہ کے بجائے غیر اللہ کی اطاعت و پرستش قومی شعار بننے لگا لہٰذا سنت اللہ کے مطابق' ان کی ہدایت

کے لئے انہی میں سے حضرت نوحؑ کو مبعوث کیا گیا' جنھوں نے جادہ حق کی طرف اپنی قوم کی راہنمائی کی لیکن ان کی قوم نے انہیں جھٹلایا' اور ان کی تکذیب و تحقیر کا کوئی پہلو باقی نہ چھوڑا تو طوفان بلاخیز کی صورت میں عذاب خداوندی نے ان کو آلیا اور وہ سب غرق کر دیے گئے سوائے ان چالیس ہدایت یافتہ لوگوں کے جنھوں نے کشتی نوح پر پناہ لی۔ اسی کشتی پر اللہ کے حکم کے مطابق حضرت نوح نے ہر جاندار کا ایک ایک جوڑا بھی رکھ لیا تھا۔

گویا اولاد آدم کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا ان کرتوتوں کے عوض جو انہوں نے اپنا رکھے تھے۔ اور اس دنیا کو دوبارا سے آباد کیا گیا ان چالیس مرد و زن سے جو اہل ایمان تھے اور ان جانوروں کے جوڑوں سے جنہیں حضرت نوحؑ بچا لائے تھے۔ اسی لئے حضرت نوحؑ کو "آدم ثانی" بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت نوحؑ کے تین بیٹے حام' سام اور یافث تین بنیادی انسانی نسلوں کے بانی تھے۔ ابتداء میں ان کا مسکن ایک تھا۔ ان کے خاندانوں کے مجموعوں نے معاشروں کی شکل اختیار کر لی تھی لیکن پھر رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی آبادی کے دباو کی وجہ سے' تیز بہتر تلاش معاش کی غرض سے مختلف خاندانوں نے زمین کے مختلف خطوں کی طرف مہاجرت کی سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنے قدیم وطن کو خیرباد کہا وہ غالبا حامی نسل (Hamitic) کے لوگ تھے۔ اس کے بعد یافثی نسل (Japhetic) کا ایک خاندان جو تورانی کہلاتا تھا۔ اپنے ابتدائی مسکن سے نکلا' ان میں سے بعض شمال کی طرف گئے اور پھر مشرق میں پھیل کر موجودہ منگولی (Mongolian) شاخ کے مورث اعلیٰ بنے۔ اسی کی ایک اور شاخ مغرب کی طرف نکلی اور آذربائیجان' ہمدان اور گیلان میں آباد ہو گئی' جو بحیرہ خزر کے جنوب مغرب میں ہیں اور جو قدیم تاریخ میں ماد (Media) کے نام سے زیادہ معروف ہیں۔ اس شاخ کے ایک حصے نے کچھ مدت کے بعد سرزمین بابل کے زرخیز میدانوں میں جا کر اپنے سے پہلے کی حامی نو آبادیوں کو مسخر کیا اور رفتہ رفتہ ان میں مل جل کر اکادی قوم (Accadian) کی شکل اختیار کر لی جسے یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابوں میں کوشی (Kushite) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

اس مخلوط نسل نے بابل کی بنیاد ڈالی اور ایک ایسا مذہب ایجاد کیا جو اپنی بلند سطح پر فطرت پرستانہ وحدت الوجودیت سے مشابہہ تھا لیکن زیریں سطحوں پر اس میں ہمہ یزدات کا عقیدہ تھا' اور سورج اور چاند دیوتاؤں کی پوجا تھی۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ لنگ پوجا تھی' جنسی خواہشوں کی تسکین کرنے والی رسمیں تھی' بچوں کی قربانیاں اور کنواری لڑکیوں کو بھینٹ چڑھانے کی رسمیں تھیں۔ چنانچہ بابل کا مذہب ایک ایسے معاشرے کا مذہب تھا جس میں ایک طرف تو اعلیٰ درجہ کی مادی ترقی تھی اور دوسری طرف پرلے درجے کی نفسانیت پرستی اور خون آشامی' جسے مذہب کی سند قبول حاصل تھی۔ ص۱۴

اس کے بعد جس شاخ نے اپنے ابتدائی مسکن (باختر' ام البلاد) سے کوچ کیا وہ سامی نسل (SEMITIC) تھی۔ یہ بھی تورانیوں کے نقش قدم پر چل کر مغرب کی طرف گئے اور اغلب ہے کہ (MESOPOTAMIA) بین النہرین کے ڈیلٹے کے شمالی حصہ میں آباد ہو گئے۔ بہت جلد انھوں نے تعداد اور قوت میں ترقی کر کے سلطنت بابل کا خاتمہ کر دیا اور اس کی جگہ ایک وسیع سلطنت قائم کی جس کا سکہ تمام ہمسایہ ملکوں میں چلتا تھا۔ اشوریوں کی اس سلطنت میں جو مذہب رائج تھا وہ کبھی کبھی ایک مثبت تصور توحید کی بلندی تک جا پہنچتا تھا۔ ان میں ایک افضل و اعلیٰ ہستی کے صریح اعتراف کے نشان ملتے ہیں۔ ص۱۵

سب سے آخر میں جس شاخ نے اپنے تنے سے جدا ہونا منظور کیا وہ نسل یافث تھی۔ جو حامی اور سامی خاندانوں کے چلے جانے کے باوجود اپنے اصل وطن میں مقیم رہی اور اپنے طور پر نشوونما پاتی رہی تھی۔ پھر ان میں مہاجرت کی حرکت دکھائی دیتی ہے۔ یافث نسل کے مختلف خاندان یکے بعد دیگرے ام البلاد سے نکلے اور بالا خر صرف خالص آریا لوگ اپنے قدیم مسکن میں باقی رہ گئے۔ ص۱۶

اس طرح اولاد آدم خدا کی زمین کے مختلف خطوں میں آباد ہوتی چلی گئی۔ جنہوں نے مختلف معاشروں کی بنیاد رکھی اور ان معاشروں میں مختلف النوع تہذیبوں کو جنم دیا۔ ابتدائی مذہب اسلام نے متعدد شکلیں بدلیں۔ ہر دفعہ جب بھی اولاد آدم بگاڑ کا

شکار ہوتی' اس پر انبیاء مبعوث کیئے جاتے رہے۔ جو جادہ حق کی طرف ان کی راہنمائی کرتے' قومیں کچھ عرصہ صراط مستقیم پر رہتیں' پھر ان میں بگاڑ پیدا ہونے لگتا۔ پھر کوئی ڈرانے والا اور خبردار کرنے والا معبوث کیا جاتا' یوں زمانوں پر زمانے اور صدیوں پر صدیاں گزرتی رہیں یہاں تک کہ چھٹی صدی عیسوی آ گئی' یہ صدی بھی بدقسمتی سے قومی' معاشرتی اور مذہبی انتشار کی صدی تھی (جس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں تفصیل سے کیا جائے گا) اور جو ایک سراج منیر کی متقاضی تھی۔

حواشی و حوالہ جات

(۱) محمد عبدہ اپنی تفسیر المنار میں اس امر کی طرف اشارا کرتے ہیں کہ بنی نوع انسان اس خطہ زمین پر ہبوط آدم سے قبل بھی موجود تھے اور ان میں خونریزی اور فساد رواج پا چکا تھا جس کی طرف ملا ئکہ نے اشارہ کیا تھا۔ لیکن قرآنی آیات سے ایسے کسی نتیجے پر پہنچنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن خود اس پر شاہد ہے کہ آدم اولین تخلیق تھے مثلاً قرآن کہتا ہے۔ "ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتداء کی پھر تمہاری صورت بنائی پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو" (الاعراف ۱۱)

اس نوعیت کا بیان سورۃ حجر میں بھی ہے۔ "اور بلا شبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے اور ہم "جن" کو اس سے قبل جلتی ہوئی ہوا کی گرمی سے پیدا کر چکے تھے۔" (سورۃ الحجر)

اگر آدم سے قبل نوع انسانی وجود میں آ چکی تھی تو قرآن اس کی بھی ضرور وضاحت کرتا جس طرح جنوں اور ملا ئکہ کی ضمن میں وضاحت ملتی ہے کہ وہ تخلیق آدم سے قبل وجود میں آ چکے تھے۔

۲ :	القرآن	آل عمران	:	۵۹
۳ :	ایضاً	السجدہ	:	۷
۴ :	ایضاً	الصافات	:	۱۱
۵ :	ایضاً	الحجر	:	۲۸-۲۹

۶ : ایضاً الرحمٰن : ۴۴

۷ : ایضاً ص : ۷۲-۷۱

(۸) سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن ص ۳۰ (بحوالہ فتح الباری)

(۹) مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن جلد ۴ ص ۴۰

(۱۰) ٹی - آرنلڈ، دی لگیسی آف اسلام، لندن ص ۴۷۵ (مشہور عرب مدبر، مورخ اور طبیب ابن خطیب غرناطی (۷۴۳ء - ۱۳۱۳ء) نے اپنے مشہور رسالہ "طاعون" میں اس وبا کی پوری کیفیت لکھی ہے۔)

(۱۱) حضرت ادریسؑ کے زمانے کے بارے میں اختلاف ہے بعض انہیں حضرت نوحؑ سے متقدم مانتے ہیں اور بعض انہیں حضرت نوحؑ کے بعد کے زمانے کا بتاتے ہیں۔ تاہم مفسرین کا عام خیال یہ ہے کہ بائبل میں جن بزرگ کا نام حنوک یا اخنوخ (ENOCH) بتایا گیا ہے وہ یہی حضرت ادریسؑ ہیں۔ حضرت ادریسؑ کا (اگر ان کا عبرانی نام (ENOCH) تسلیم کرلیا جائے) حضرت آدمؑ کی ساتویں پشت میں ہونا، حضرت نوحؑ کا آٹھواں پردادا ہونا، اور ۳۶۵ سال کی عمر پانا بائبل سے ماخوذ ہے۔ قرآن پاک میں حضرت ادریسؑ کا تذکرہ دو مقامات پر آیا ہے۔ سورہ مریم اور سورہ انبیاء میں، ان قرآنی بیانات سے ان کی نبوت کا پتہ تو چلتا ہے لیکن ان کا عرصہ متعین نہیں ہوپاتا۔

(۱۲) قرآن حکیم : سورہ ہود

(۱۳) امیر علی سید، سپرٹ آف اسلام ص ۷ "باختر" (BACTRIA) کی سطح مرتفع کو، جسے عرب جغرافیہ دانوں نے "ام البلاد" کا موزوں نام دیا، نوع انسانی کا گہوارہ، مذہبوں اور قوموں کا مرزبوم خیال کی جاتی ہے۔"

(۱۴) امیر علی، سید سپرٹ آف اسلام، اردو ترجمہ روح الاسلام، مترجم محمد ہادی حسین، لاہور ۱۹۸۷ء - ص ۸

(۱۵) ایضاً (حضرت ابراہیم بھی اشوری النسل تھے۔)

(۱۶) ایضاً ص ۹

باب دوم

تہذیب کیا ہے؟

تہذیب، تمدن اور ثقافت عربی زبان کے ایسے الفاظ ہیں جو بعینہٖ اردو زبان میں بھی مستعمل ہیں۔ لفظ تہذیب کا مادہ ہ ذ ب ہے۔ ھذب کے معنی صاف کرنا، درست کرنا، پودوں اور درختوں کی شاخ تراشی کرنا، ھذب الشعر یعنی شعر کی اصلاح کرنا، ھذب الرجل یعنی پاکیزہ اخلاق والا بنانا[1]، مہذب یعنی پاکیزہ اخلاق والا۔ اس عربی لفظ کو اردو زبان نے اس کے معنوں سمیت اختیار کیا ہے۔ لہٰذا اردو زبان میں بھی تہذیب کے معنی پاک کرنا، اصلاح کرنا، درستگی، آراستگی، شائستگی اور خوش اخلاقی وغیرہ کے لئے جاتے ہیں۔

اصطلاحاً تہذیب سے مراد انسان کا نظام فکر ہے یعنی انسان کے وہ عقائد، نظریات وافکار ہیں جن سے اس کی شخصیت بنتی اور سنورتی ہے اس کے خیالات جتنے زیادہ پاکیزہ روشن اور سلجھے ہوئے ہوں گے وہ معاشرے کا اتنا ہی مہذب شخص متصور ہوگا۔ تہذیب کا تعلق انسانی فکر و خیال اور ذہن سے ہوتا ہے اس اعتبار سے تہذیب کی کیفیت نظریاتی، فکری، روحانی اور غیرمادی ہوتی ہے۔

تہذیب کے مترادف ایک اور لفظ "ثقافت" استعمال ہوتا ہے۔ تاہم اس کے لغوی معنوں میں تھوڑا فرق ہے۔ ثقف معنی ذہین ہونا، ہوشیار و دانا ہونا۔ ثقف الولد معنی لڑکے کو مہذب بنانا، تربیت دینا، تعلیم دینا، اسی طرح امراۃ (ثقاف) معنی بہت ذہین عورت کے ہیں[2]۔ اس لفظ کو بھی اردو زبان نے تقریباً انہی معنوں میں اپنالیا ہے لہٰذا اردو میں اس کے معنی عقل مند ہونے کے ہیں۔ یوں ثقافت کا تعلق بھی براہ راست ذہن سے بنتا ہے اور اصطلاحاً یہ لفظ تہذیب کے مترادف استعمال کیا جاسکتا

ہے۔ بعض علماء ان دونوں الفاظوں کو ایک دوسرے کے متقابل سمجھتے ہیں جیسے کہ جمیل جالبی تہذیب کا تعلق انسان کے ظاہر سے بتاتے ہیں اور ثقافت کو روحانی اور باطنی حیثیت دیتے ہیں گویا ان کے نزدیک تہذیب' ثقافت کے بر عکس ہے[3] حالانکہ اگر دونوں کے لغوی معنوں پر غور کیا جائے تو یہ تضاد غلط نظر آتا ہے۔ لسان العرب' میں بھی ثقافت کے معنی علوم و فنون و ادبیات پر قدرت و مہارت' کسی چیز کو تیزی سے سمجھ لینے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے بتائے گئے ہیں۔ اس لفظ کا تعلق بھی 'تہذیب' کی طرح انسانی ذہن کے کارناموں سے ہے۔

تہذیب و ثقافت کے مقابل تمدن اور حضارت کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ تمدن' کا مادہ م د ن ہے۔ مدن کے معنی قیام کرنا اور مدن کے معنی شہر بنانا یا شہر آباد کرنا اور تمدن کے معنی شائستہ و مہذب ہونا[4] تمدن کا لفظ اردو میں بھی انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی مل کر رہنے کا طریقہ۔ طرز معاشرت' یا انسان کا بڑے بڑے گروہوں میں مل کر ایک نظام کے تحت زندگی بسر کرنا تمدن کہلاتا ہے۔

اصطلاحاً تمدن کی یہ تعریف کی جاسکتی ہے کہ تمدن وہ نظام عمل ہے جو انسان کے نظام فکر (تہذیب) کے تابع ہوتا ہے۔ تمدن کا تعلق چونکہ انسانی افکار و خیال کے تحت سرزد ہونے والے ظاہری اعمال سے ہے لہٰذا اس کی حیثیت عملی' ظاہری اور مادی ہوتی ہے۔

تمدن کے مترادف دوسرا لفظ "حضارت" ہے۔ اس کا مادہ ح ض ر ہے۔ حضر معنی موجود ہونا' حاضر ہونا اور حضارہ کے معنی شہر میں رہنے کے ہیں اور حضارہ یعنی شہر کی بود و باش[5] اردو زبان نے اس لفظ کو بھی انہی معنوں سمیت اپنے اندر سمیٹ لیا ہے لہٰذا اردو میں بھی "حضارت" کا لفظ شہری زندگی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ شہر بنانے اور بسانے کا تعلق براہ راست عمل سے ہے لہٰذا تمدن و حضارت کی کیفیت یہ ہے کہ یہ نظر آنے والی وہ عملی اور مادی چیز ہے جس کا انسان مشاہدہ کر سکتا ہے جب کہ تہذیب کو یا تو محسوس کیا جاسکتا ہے یا سمجھا جاسکتا ہے مشاہدہ کی گرفت میں نہیں لایا جاسکتا۔

اب تک کی بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تہذیب (و ثقافت) اور تمدن (و حضارہ) میں ایک اعتبار سے فرق ہے۔ تہذیب کا تعلق انسانی فکر و خیال اور عقائد و نظریات سے ہے جب کہ تمدن کا تعلق ظاہری اعمال سے ہے۔ تاہم تہذیب و تمدن ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور تلازمہ کی یہ صفت ان کو ایک کردیتی ہے۔ تمدن دراصل تہذیب کا نتیجہ ہے' بالفاظ دیگر' تمدن' تہذیب کا عملی مظاہرہ ہے جب تک تہذیب (نظام فکر) نہیں ہوگی تب تک تمدن (نظام عمل) کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ روح اور جسم کے مانند ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور تلازمہ کی یہی صفت ان کو ایک کردیتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تہذیب و تمدن کے لئے ہم ایک ہی لفظ اختیار کرسکتے ہیں؟ میرے خیال میں اس کا جواب اثبات میں ہونا چاہئے۔ اور وہ لفظ "تہذیب" ہے جس میں مادی اور غیرمادی دونوں پہلو شامل ہوں گے۔

انگریزی زبان میں تہذیب کے مترادف کلچر (Culture) اور تمدن کے مترادف (Civilization) کے الفاظ مستعمل ہیں۔ لفظ کلچر ابتدا میں صرف کاشتکاری کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ سترہویں صدی عیسوی تک یہ لفظ درختوں کی نشوونما اور کاشتکاری کے لئے استعمال ہوتا رہا۔[۶] اس کے بعد یہ جانوروں اور قدرتی پیداوار جیسے ریشم (Silk) کی نشوو ارتقاء کے لئے استعمال ہونے لگا۔[۷] اس کے بعد اس لفظ کے معنوں میں مزید تبدیلی آئی اور یہ انسانی جسم کی تربیت کے معنوں میں استعمال کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی میں اس لفظ کے وہ معنی اختیار کئے گئے جو آج بھی ہیں یعنی کلچر کا لفظ تہذیب کے معنوں میں استعمال ہونے لگا[۸] اصطلاحا کلچر کی جو تعریف بیان کی گئی ہے وہ بھی تہذیب کی اصطلاحی تعریف کے قریب قریب ہے۔

ماہرین عمرانیات نے کلچر کی کئی تعریفیں بیان کی ہیں تاہم E.B.Tylor کی بیان کردہ تعریف سے بیشتر ماہرین عمرانیات مطمئن نظر آتے ہیں جو انیسویں صدی کے آخری ربع میں وضع کی گئی تھی جس کی رو سے "کلچر ایسا مرکب ہے جس میں علم' عقیدہ' فن' اخلاق' قانون' رسم و رواج اور دوسری ہر قسم کی صلاحیتیں اور عادتیں جن کا

اکتساب انسان، معاشرے کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے کرتا ہے، موجود ہیں"۔[9]

تاہم میرے خیال میں اس سے زیادہ سادہ مگر وسیع المعنی تعریف خود Robert Bierstedt کرتا ہے۔

"کلچر وہ مرکب ہے جو ہمارے نظام فکر، نظام عمل اور ہر اس چیز پر مشتمل ہے جو معاشرے کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے ہم میں موجود ہے"۔[10]

کلچر کی طرح ہی لفظ Civilization میں بھی معنوں کے اعتبار سے واضح ارتقائی منازل نظر آتی ہیں۔ یہ لفظ اٹھارویں صدی تک "قانون یا انصاف" کے لئے بولا جاتا تھا اس کے بعد یہ لفظ "انسانی معاشرے کی ترقی یافتہ شکل" (A developed or advanced state of human society) کے طور پر بولا جانے لگا۔[11] ان معنوں میں Civilization کا لفظ تمدن کے مترادف نظر آتا ہے۔

جس طرح ہم نے تہذیب اور تمدن کے لئے ایک ہی لفظ "تہذیب" منتخب کر لیا ہے اسی طرح اب ماہرین عمرانیات کلچر اور سویلائزیشن کے لئے ایک ہی لفظ "کلچر" استعمال کرنے لگے ہیں کیونکہ ان کے خیال کے مطابق کلچر، سویلائزیشن کی ترقی یافتہ شکل ہے اور تمدن رفتہ رفتہ تہذیب میں ڈھل جاتا ہے۔

"تہذیب، ترقی یافتہ تمدن کے اس خاص پہلو کا نام ہے۔ جس کا تعلق حسن، ہم آہنگی، ستھراپن اور پاکیزگی سے ہے"۔[12]

اس بیان کے مطابق جب تمدن بہت زیادہ ترقی یافتہ ہو جائے اور اس میں حسن و خوبی نظر آنے لگے تو اس پر تہذیب کا اطلاق ہوگا۔ لیکن یہ بہت مبہم سا وصف اشتراک ہے کیونکہ حسن، خوبی اور پاکیزگی کی تعریف اور اس کے مفہوم جدا جدا ہیں چنانچہ اس کا حکم لگانا کہ کہاں پر پہنچ کر تمدن، تہذیب کے سانچے میں ڈھل گیا نہایت مشکل ہے۔

جدید ماہرین عمرانیات کلچر اور سویلائزیشن کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم گردانتے ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کی کوئی قیمت اور اہمیت نہیں ہے۔ ہرٹن ہنٹ کلچر کو غیرمادی (non - material) سمجھتا ہے اور سویلائزیشن کو مادی

(Material سمجھتا ہے جو کہ ایک دوسرے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اپنی اس بات کو وہ بیس بال کے کھیل کی مثال سے واضح کرتا ہے۔ یعنی بیس بال کے کھیل میں دستانے' بیٹ اور کھلاڑی کا لباس وغیرہ مادی کلچر کے کچھ عناصر ہیں جب کہ کھیل کا طرز' کھلاڑی کی توانائیاں' ان کی حکمت عملی اور خاص روایتی انداز غیرمادی کلچر کے عناصر ہیں۔ اب اگر بیس بال کے "کھیل" کو بھلا دیا جائے تو بلا (bat) محض لکڑی کا ایک ٹکڑا رہ جائے گا۔ ص[13]

اس اعتبار سے سویلائزیشن (مادی کلچر) منطقی نتیجہ ہے کلچر (غیرمادی کلچر) کا اور دونوں ایک دوسرے کے بغیر بے معنی ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

(۱) المنجد، دارالاشاعت، کراچی، جولائی ۱۹۷۵ء ص ۴۳۲

(۲) ایضاً ص ۱۳۵

(۳) جمیل جالبی، پاکستانی کلچر ص ۴۳

(۴) المنجد ص ۹۵۲

(۵) المنجد ص ۲۱۷

(۶) دی آکسفورڈ انگلش ڈکشنری، جلد دوئم، آکسفورڈ ۱۹۷۸ء ص ۳۴۷

(۷) ایضاً

(۸) (The Training' development and refinement

of mind' taste and manners

The intellectual side of civilization)

(۹) ROBERT BIERSTEDT 'THE SOCIAL ORDER 'P.127

(۱۰) دی سوشل آرڈر ص ۱۲۷

(۱۱) دی آکسفورڈ انگلش ڈکشنری، جلد دوئم ص ۳۴۸

(۱۲) انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز، نیویارک ۱۹۵۱ء جلد سوئم ص ۶۲۱

(۱۳) ہرٹن ہنٹ، سوشیالوجی، نیویارک، ۱۹۷۲ء

134998

باب سوم

تہذیب کے عناصر ترکیبی

تہذیب کی ایک جامع تعریف کے تعین کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ تہذیبیں کیسے وجود میں آتی ہیں؟ وہ کون سے تکوینی عناصر ہیں جن کے ملنے سے انسانی معاشرے بنتے ہیں اور ان معاشروں میں تہذیب و تمدن پروان چڑھتے ہیں۔ دنیا کی کم و بیش تمام معلوم تہذیبوں کے تشکیلی عناصر تین ہیں۔

۱ جغرافیائی عنصر (Geographical factor)

۲ حیاتیاتی عنصر (Biological factor)

۳ نظریاتی عنصر (Ideological factor)

جغرافیائی عنصر

کسی جگہ یا مقام کی آب و ہوا جائے وقوع، زمین کی ساخت اور معدنی وسائل وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ اسے ماحول یا گردوپیش بھی کہا جا سکتا ہے۔ جغرافیائی ماحول یا گردوپیش انسان کی جسمانی ساخت، اس کے خیالات و اعمال اور معیشت سب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس موضوع پر غالباً سب سے پہلے بقراط نے یہ کہہ کر روشنی ڈالی۔

"اکثر حالتوں میں آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانوں کا جسم اور اس کی سیرت ملک کی نوعیت کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔"[1]

یونانیوں نے نظریہ ماحول کی تائید میں چند محبوب مثالیں دیں مثلاً زیریں وادیٔ نیل کی زندگی نے مصریوں کی جسمانی ساخت، سیرت اور اداروں پر ایک قسم کا اثر ڈالا اور

یوریشیا کے صحرائی علاقے کی زندگی نے [illegible]یوں کی جسمانی ساخت' سیرت اور اداروں پر بالکل مختلف اثر ڈالا۔[1]

بطلیموس نے دنیا کے آباد حصہ زمین کو سات قسموں پر تقسیم کیا تھا جن کو ہفت اقالیم' کا نام دیا جاتا ہے۔ ابن خلدون ان اقالیم پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد یہ ثابت کرتا ہے کہ ان اقالیم کے باشندوں پر مقامی حالات و آب و ہوا کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کے نزدیک گرم اقالیم (یعنی پہلی اور دوسری اقالیم) کے باشندے سیاہ فام گھنے بالوں اور وحشی فطرت کے حامل اس لیئے ہوتے ہیں کہ وہاں سورج انکے سر پر ہوتا ہے اور شدت گرمی کی وجہ سے ان کی کھال سیاہ پڑ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے مزاج میں بھی وحشت اور گرمی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس سرد اقالیم (یعنی چھٹی اور ساتویں اقالیم) کے باشندے رنگ میں سرخ و سفید ہوتے ہیں ان کے بدن پر بال کم' آنکھیں نیلی اور بال بھورے ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہوا شدت برودت کی وجہ سے سرد اور ٹھنڈی رہتی ہے اور زیادہ تر موسموں میں سردی شدید پڑتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان تیسری' چوتھی اور پانچویں اقالیم کو ابن خلدون مجموعی طور سے ''اقالیم معتدلہ'' کا نام دیتا ہے۔ اقالیم معتدلہ کے انسان تو انسان' حیوان تک معتدل مزاج کے ہیں۔ ان اقالیم کی آب و ہوا معتدل اور مثالی ہے حد یہ کہ نبوت بھی انہی اقالیم کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان اقالیم کے باشندے اسی اعتدال مزاجی کے باعث درجہ کمال پر ہوتے ہیں۔[2]

کسی ملک کی طبعی حالت کا اثر وہاں کی معیشت پر بھی پڑتا ہے مثال کے طور پر ہندوستان کے جغرافیائی حالات میں سب سے نمایاں چیز یہ ہے کہ شمالی سرحد کے کوہستانی علاقے اور جنوبی جزیرہ نما کے مغربی اور مشرقی گھاٹوں کو چھوڑ کر تقریباً سارا ملک مسطح یا کسی قدر مرتفع میدانوں پر مشتمل ہے۔ جنہیں بڑے بڑے دریا سیراب کرتے ہیں۔ چند سرد خطوں سے قطع نظر موسم سال کے ایک حصہ میں معتدل اور دوسرے حصے میں گرم رہتا ہے۔ بارشوں کی کمی نہیں۔ ملک کے بڑے حصے کی آب و ہوا یکساں کہی جاسکتی ہے لیکن پورے ملک میں سرد ترین سے لے کر گرم ترین اور

مرطوب ترین سے لے کر خشک ترین تک ہر قسم کی آب و ہوا موجود ہے اور زمین کی حالت میں بھی اتنا تنوع ہے کہ قریب قریب ہر قسم کی نباتاتی اور معدنی پیداوار ملک کے اندر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے جس ملک میں میدانوں کی کثرت ہو، پانی افراط سے ہو اور سورج سال کے بڑے حصے میں زمین کو حرارت اور زندگی بخشتا ہو وہ زراعت کے لئے خاص طور پر موزوں ہوگا چنانچہ ابتداء سے ہندوستان کا پیشہ زراعت ہے۔[3] بلکہ علم الاقوام کی تحقیقات کے بعد بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے زراعت ہندوستان میں ہی شروع ہوئی۔[4] گویا کہ ہندوستان کی طبعی ساخت کا اثر وہاں کے ذریعہ معاش پر پڑا اور اس معیشت کا براہ راست اثر ہندوستانیوں کی تہذیب و تمدن پر پڑا۔ ظاہر ہے کسانوں کی تہذیب، شکاریوں کی تہذیب سے بہت مختلف ہوتی ہے اور ترقی کی ہر منزل پر وہ امن کو جنگ پر اور تعمیر کو تخریب پر ترجیح دیتی ہے۔

پھر یہی نہیں جغرافیائی عنصر کو، تہذیب انسانی کی تشکیل میں اس وقت فیصلہ کن اہمیت حاصل ہو جاتی ہے جب "قومی تہذیب" کا مسئلہ درپیش ہو۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کا کہنا ہے:

"تہذیب کا ترکیبی عنصر جو طبعی ماحول اور سماجی حالات پر مشتمل ہے خواہ نظریاتی عنصر کے مقابلے میں زیادہ اہم ہو یا نہ ہو لیکن تہذیب میں مقامی رنگ یہی پیدا کرتا ہے۔[5]

جغرافیائی عنصر وہ طاقتور عنصر ہے جو انسانی فکر کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس کی بہت عام اور مقبول مثال "وطنیت" (Nationalism) کی ہے۔ ایشیا کے مقابلے میں یورپ میں وطنیت زیادہ قوی اور عام کیوں ہے۔؟ اس کی وجوہات میں سے ایک وجہ یورپ کے جغرافیائی حالات بھی ہیں۔ ایشیا میں طبعی علاقے زیادہ وسیع، مختلف قسم کی آب و ہوا اور پہاڑوں کی مختلف قسم پر مشتمل ہیں یہ علاقے زیادہ زرخیز ہیں اور ان میں وسائل حیات کی فراوانی ہے۔ اس بناء پر براعظم ایشیا میں مملکت کا میلان فطری طور پر وسعت اور عمومیت کی طرف ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ اس خطہ زمین پر دنیا کی وسیع ترین سلطنتیں قائم ہوئیں۔ اس کے برخلاف یورپ میں زندگی کی کشمکش، تنازع للبقاء

شدید ہے۔ اس کی آبادی گنجان، علاقے تنگ اور وسائل معیشت محدود ہیں۔ پہاڑوں اور دریاؤں کی طبعی سرحدوں نے مغربی اقوام کو مستقلاً تنگ فطری دائروں میں محصور کردیا ہے۔ خصوصاً یورپ کا وسطی، مغربی اور جنوبی حصہ وسیع ریاستوں کی نشوونما کے لئے موزوں نہیں۔ اس لئے قدیم یورپ میں بھی سیاسی تصور، شہری ریاست (City State) سے آگے نہیں بڑھ سکا جن کا رقبہ چند میل سے زیادہ وسیع نہیں ہوتا تھا۔ لیکن وہ بالکل خود مختار ہوتی تھیں اس کی اہم مثال یونان ہے یہاں قدیم ترین عہد سے بیسوں چھوٹے چھوٹے خود مختار شہروں کا تذکرہ ملتا ہے۔[ص۶]

اس ضمن میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ماحول کوئی ساکن عامل نہیں جیسا کہ بعض یونانی دانشور سمجھتے تھے۔[ص۸] بلکہ آب و ہوا، علاقے کے جغرافیائی حالات اور زمین کی ساخت وغیرہ میں تبدیلی آتی رہتی ہے گوکہ تبدیلی کا یہ عمل بہت سست اور صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ افریقہ کا جو صحرا آج ہمیں جھلسا ہوا نظر آتا ہے وہ برفانی دور میں باقاعدہ سیراب ہوتا تھا۔[ص۲] پہاڑ شکست وریخت کے عمل سے گذرتے رہتے ہیں، دریا اپنی گذرگاہیں تبدیل کرتا رہتا ہے، سمندر اپنی حدود بدلتا رہتا ہے لیکن یہ سب دنوں مہینوں میں نہیں بلکہ صدیوں میں ہوتا ہے۔ ان جغرافیائی تبدیلیوں کا اثر مقامی تہذیبوں میں بھی تبدیلی لاتا ہے۔

بعض ماہرین نے تہذیب کے عناصر تکوینی میں معاشی عنصر (ECONOMICAL FACTOR) کو بھی شامل کیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت اس عنصر کی کوئی جداگانہ حیثیت نہیں ہے بلکہ اس کو جغرافیائی عامل کے تحت لیا جانا چاہئے کیونکہ کسی ملک کی معیشت کیا ہوسکتی ہے اس کا فیصلہ انسان نہیں قدرت کرتی ہے، انسان قدرت کے اس فیصلے کو تبدیل تو کرسکتا ہے لیکن قدرت کے فیصلوں میں اتنی منفعت ہوتی ہے کہ انسان خود ہی اس کو تبدیل نہیں کرتا اور قبول کرلیتا ہے۔ ہندوستان قبل مسیح میں بھی ایک زرعی ملک تھا آج ایٹمی طاقت بن جانے کے باوجود اس کی زرعی حیثیت مسلمہ ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ ملک کی طبعی حالت ہی ایسی ہے کہ اس کو ایک زرعی ملک ہونا چاہئے۔

حیاتیاتی عنصر :- اسے نسلی عامل بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں رنگ، نسل، زبان اور تمام تر وراثتی اور نسلی صلاحیتیں، عادتیں اور قابلیتیں شامل ہوتی ہیں جو کہ رسوم و رواج کی صورت میں نسل در نسل چلتی ہیں۔ ٹائن بی ان کی تعریف یوں کرتا ہے۔"نسل کی اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کے خاص گروہوں میں چند امتیازی وصف ہیں جو ان کے جانشینوں میں بطور میراث منتقل ہوجاتے ہیں[24]۔" امتیازی وصف سے مراد محض نفسی خصائص ہی نہیں بلکہ بدنی جسمانی خصائص بھی ہیں۔

ابن خلدون کا خیال ہے کہ کسی خاندان کے اوصاف چار پشتوں تک چلتے ہیں کوئی خاندان مسلسل شرف و نسب کا مالک نہیں رہتا۔ لیکن ابن خلدون اس امر کی بھی وضاحت کرتا ہے کہ شرف و حسب کی زندگی وبقا کے لئے چار پشتوں کی حد کوئی قاعدہ کلیہ نہیں، کوئی خاندان اپنا شرف چار پشتوں تک بھی برقرار نہیں رکھ سکتا اور کوئی خاندان یہ سلسلہ پانچویں اور چھٹی پشت تک کھینچ لے جاتا ہے لیکن چار پشتوں کے بعد زوال ضرور شروع ہو جاتا ہے[25]۔

بہرحال مختلف خاندان یا قبیلے یا نسلیں اپنی جبلی عادتوں، خصلتوں اور قابلیتوں سے تکوین تہذیب کا باعث ہوتی ہیں۔ جس طرح جغرافیائی عامل کسی تہذیب کو مقامی رنگ عطا کرتا ہے اسی طرح حیاتیاتی عنصر کسی تہذیب کو دوسری تہذیب سے نمایاں اور ممتاز کرتا ہے۔

جس جسمانی خصوصیت پر نسلی نظریات کے مغربی داعی بطور خاص زور دیتے ہیں وہ رنگ ہے۔ سفید رنگ کو برتری کا نشان سمجھا جاتا رہا۔ شاید اسی لئے ہندوستان میں آنے والے آریاؤں نے ہندوستان کے مقامی لوگوں کو نیچ اور کمتر سمجھا، کیونکہ وہ نہ گورے چٹے تھے اور نہ آریاؤں کی طرح لمبے چوڑے اور بعد میں منوشاستر میں ان کو مستقلاً شودر کا درجہ دے دیا گیا۔ تہذیب کے جدید نسلی نظریات میں سب سے ہردلعزیز نظریہ وہ ہے جس میں سفید فام نسل کے سنہرے بالوں، بھوری آنکھوں اور لمبوتر ے

سر والے لوگوں کو تخت برتری پر بٹھایا گیا۔[۱۲] جنگ عظیم اول کے بعد بھی اسی قسم کے رجحانات کی لہر نے جرمنوں سے دعویٰ کروایا کہ وہ دنیا کی سب سے برتر اور عظیم قوم ہیں۔ اور اس دعویٰ نے ان کے اندر من حیث القوم ایک طرح کا (NATIONAL SENTIMENT) پیدا کیا۔[۱۳]

جس طرح سے یورپ کا دعویٰ سفید رنگ کی وجہ سے برتری کا تھا۔ اسی طرح جاپانیوں نے اس غرض کے لئے بالکل مختلف جسمانی معیار مقرر کیا۔ اتفاق یہ ہے کہ جاپانیوں کے جسم غیر معمولی طور پر بالوں سے پاک ہوتے ہیں اور ان کے پڑوس میں شمالی جزیرے میں بالکل مختلف قسم کی قدیم قوم آباد ہے جس کا جسمانی نمونہ عام اہل یورپ سے ایک حد تک ملتا جلتا ہے انہیں "بالوں والے آئینو" کہا جاتا ہے۔ اس بناء پر جاپانیوں نے طبعاً بالوں کے نہ ہونے کو روحانی برتری کا نشان قرار دے لیا۔ اگرچہ ان کا یہ دعویٰ ویسا ہی بے بنیاد ہے جیسا سفید رنگ کی برتری کا مغربی دعویٰ لیکن سطحی طور پر ان کا دعویٰ ٹائن بی کو زیادہ معقول نظر آتا ہے اس لئے کہ جس انسان کے جسم پر بال نہ ہوں وہ اپنے اس بھائی کے مقابلے میں بندر سے زیادہ دور ہے جس کے بدن پر تھوڑے بہت بال ہوں۔[۱۴]

اس قسم کے نسلی نظریات کو کوئی مانے یا نہ مانے لیکن اس امر سے انکار دشوار ہے کہ یہ عامل تکوین تہذیب کا باعث ہوتا ہے۔ کسی خاندان یا قبیلے یا نسل میں احساس کمتری یا احساس برتری کے مہلک جراثیم اس عامل کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جس کا اثر ان کے پورے نظام حیات پر پڑتا ہے۔ گویا ایک طرف تو یہ عامل کچھ خیالات وافکار اور کچھ عادات و اطوار اپنے آنے والی نسل کو دیتا ہے جس سے خیالات کی ایک خاص فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ عنصر کسی بھی اجنبی کی شناخت کا ذریعہ بن سکتا ہے اگر پاکستانی معاشرے میں ایک بوٹے قد' پیلی رنگت' چھوٹی مگر کھلی آنکھیں اور چپٹی ناک والا اجنبی آجائے تو دیکھنے والا جان سکتا ہے کہ یہ چینی تہذیب کا ایک فرد ہے۔

نیز یہ عنصر انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان رسوم ورواج' اعراف و اقدار کا جو

اس کو وراثتی طور پر ملے ہیں' احترام کرے۔ معاشرہ قوت نافذہ کے طور پر کام کرتا ہے اور قوانین کی عدم موجودگی کے باوجود افراد ان رسوم و رواج کی پابندی کرتے ہیں اور ان کا ضمیر اس پر مطمئن ہوتا ہے۔

حیاتیاتی عنصر میں ہم زبان کو بھی شامل کرسکتے ہیں جسے تہذیب کا ایک اٹوٹ حصہ سمجھا گیا ہے۔[15] زبان جو کہ انسان کو موروثی طور پر اپنے والدین سے ملتی ہے نہ صرف اس کی شناخت کا ذریعہ ہے بلکہ یہ تہذیب کو بھی زندہ رکھتی ہے کیونکہ تہذیبوں کے حالات' ان کی ادبیات اور دیگر ایجادات زبان ہی کی وجہ سے محفوظ رہتی ہیں۔ جو زبانیں آج فنا ہو چکی ہیں ان کی تہذیبوں کا بھی نام و نشان مٹ چکا ہے۔

نسلی یا حیاتیاتی عنصر ساکن عامل نہیں ہے لہٰذا نسلوں اور قوموں میں رنگ' زبان' اور عادات و خصائل کے اعتبار سے تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور اب دنیا میں کوئی قوم یا نسل خالص ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ بین الاقوامی جنگیں ' شادیاں' مہاجرت اور غلامی وغیرہ ایسے بے رحم عوامل ہیں جنہوں نے رنگ و خون اور زبانوں میں زبردست آمیزش پیدا کردی۔[16] نسلوں کے خالص ہونے کا تصور بہت ہی ابتدائی زمانوں میں تو تسلیم کیا جاسکتا ہے یا پھر بہت ہی الگ تھلگ معاشروں (ISOLATED SOCIETIES) میں اس کے وجود کو منطقی سمجھا جاسکتا ہے ورنہ ہر قوم اور ہر نسل زبان' رنگ' خون اور عادات و خصائل کے اعتبار سے تبدیلیوں سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔

حیاتیاتی عنصر نسبتاً کمزور عنصر ہے اور بعض ماہرین کے نزدیک اس کی کوئی جداگانہ حیثیت بھی نہیں کیونکہ اگر ہم "نسل" کے سلسلہ میں ٹائن بی کی تعریف[17] کو معیار قرار دیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "امتیازی وصف" سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد ان کے رسوم و رواج اور عادات و خصائل ہیں جو ان میں من حیث القوم پائے جاتے ہیں تب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عادات و خصائل کس کے عطا کردہ ہیں؟ کیا ان کو ان کے طبعی ماحول نے یہ عادات اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ یا پھر ان کو ان کے عقائد و نظریات نے یہ امتیازی وصف عطا کیا۔ ان دونوں صورتوں میں حیاتیاتی عنصر کی جداگانہ

حیثیت پر ضرب لگتی ہے۔

اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ حیاتیاتی عنصر کی اس وقت جداگانہ حیثیت ہو جاتی ہے جب یہ جغرافیائی اور نظریاتی عناصر کے مجموعی اثرات کو قبول کرتے ہوئے وجود میں آتا ہے۔ جس طرح ایک نوزائیدہ بچہ' جوان و توانا ہونے پر اپنے الگ خاندان کی بناء ڈالتا ہے۔

نظریاتی عنصر :۔

تکوین تہذیب کا یہ انتہائی بنیادی اور اہم ترین عنصر ہے اس میں انسان کا پورا نظام فکر' یعنی حیات و کائنات کے بارے میں اس کے نظریات' اعتقادات اور خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ اعتقادات و نظریات انسانی بھی ہو سکتے ہیں اور الہامی بھی دونوں صورتوں میں اس کو مذہب بھی کہا جا سکتا ہے۔ مذہب کا معاملہ تہذیب کے سلسلہ میں بڑا پیچیدہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ مذہب ایک معنی میں تو کل تہذیب پر حاوی ہے اور اس کی تکوین کرتا ہے۔ اور ایک دوسرے معنی میں مذہب محض تہذیب کا ایک جزو ہے۔ اگر مذہب شخصی سطح پر چند رسوم و عادات کا مجموعہ ہو تو وہ تہذیب کا محض ایک جزو ہو گا۔ یہ جزو اہم بھی ہو سکتا ہے اور غیر اہم بھی۔ لیکن اگر مذہب کو اس کے حقیقی معنوں میں لیا جائے جو کہ انسان کو انفرادی طور پر ہی نہیں بلکہ اجتماعی طور پر پوری زندگی کے تمام شعبہ ہائے حیات میں راہنمائی کرتا ہے تب یہ تہذیب کا ایک اہم ترین تکوینی عنصر ہو گا۔

آغاز تہذیب کی بابت دو نظریات ملتے ہیں ایک "عینی نظریہ" دوسرا "مادی نظریہ"" عینی نظریہ' یہ ہے کہ دنیا کے ارتقاء کی کسی منزل میں ایک شخص یا کئی اشخاص کو ایک برتر قوت کی طرف سے وحی یا الہام کے ذریعہ سے اقدار اعلیٰ یا اعیان[صث] کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔ یا وہ اپنے وجدان صحیح سے خود دیکھنے لگتے ہیں۔ پھر اسی سماجی ماحول میں جو ان کے ارد گرد موجود ہے یہ مشاہدہ ایک "معروضی ذہنی[صث]" شکل اختیار کر لیتا ہے اور جماعت کا نصب العین بن جاتا ہے اور یہ نصب العین اس طبعی

ماحول میں، جس میں یہ جماعت رہتی ہے ایک خاص نفسی یا مادی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً اس نظریئے کے مطابق ویدک زمانے میں چند رشیوں کو الہام یا وجدان سے 'اعیان' کی ایک جھلک نظر آئی۔ جس نے آریا قوم کی اجتماعی حالت اور صلاحیت کے مطابق ایک نصب العین کی شکل اختیار کر لی۔ اس نصب العین کو وادیٔ سندھ اور وادیٔ گنگا کے طبعی ماحول میں حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور وہ تصورات و ادارات وجود میں آئے جو مجموعی طور پر ویدک تہذیب کہلاتے ہیں۔[20]

دوسری طرف مادی نظریہ یہ ہے کہ اصل چیز طبعی ماحول ہے، پہلے انسان کی اجتماعی زندگی آب و ہوا، مادی وسائل اور ان آلات کے اثر سے جو پیدائش دولت کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی بناء پر اصول و ضوابط منضبط ہوتے ہیں اور پھر ان سے عمل تجرید کے ذریعہ اقدار کے مجرد تصورات بنتے ہیں۔ جن کا مستقل وجود فرض کر کے ہم انہیں "اعیان" کہنے لگتے ہیں۔ مثلاً اسی ویدک تہذیب کے بارے میں مادیین یہ کہیں گے کہ اس کی بنیاد وہ جغرافیائی ماحول خصوصاً وہ زراعتی طرز زندگی تھا جس سے خانہ بدوش آریاؤں کو ہندوستان پہنچ کر سابقہ پڑا اور اسی پر رفتہ رفتہ ان کے مذہب اور سماجی نظام کی عمارت تعمیر ہوئی۔[21]

آغاز تہذیب سے متعلق مندرجہ بالا دونوں نظریات میں نظریاتی، حیاتیاتی اور جغرافیائی عناصر کو تہذیب انسانی کے تشکیلی عوامل کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔ فرق صرف تقدم کا ہے۔ یعنی نظریہ میں نظریاتی عنصر کو اولیت اور تقدم حاصل ہے تو مادی نظریہ میں جغرافیائی عامل کو نظریاتی عامل سے زیادہ تقدم اور اہمیت ملی ہے۔

اس ضمن میں ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ جس طرح جغرافیائی عنصر کسی تہذیب میں مقامیت پیدا کرتا ہے وہیں نظریاتی عامل، تہذیبوں میں، آفاقیت پیدا کرتا ہے کیونکہ یہ تصوراتی یا فکری عنصر جو ان خیالات، نظریات اور اصولوں پر مشتمل ہوتا ہے، جو اقدار اعلیٰ کے شعور سے پیدا ہوتے ہیں، مقام کا پابند نہیں ہوتا بلکہ ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک قوم سے دوسری قوم میں پہنچ سکتا ہے۔ قدیم اور جدید تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ ایک تہذیب یا فلسفہ زندگی یا

سیاسی اصول یا معاشی نظریات پہلے دنیا کے کسی خطے میں جنم لیتا ہے اور پھر دوسرے حصوں میں پھیلتا چلا جاتا ہے۔ مختلف آب و ہوا میں رہنے والی، مختلف نسلی امتیازات رکھنے والی قومیں اسے کلی یا جزوی طور پر اختیار کر لیتی ہیں، تاہم جن مذاہب، یا فلسفہ یا اصول و نظریات کا درجہ زیادہ بلند نہیں ہوتا یا وہ زیادہ ہمہ گیر نوعیت کی نہیں ہوتیں وہ طبعامقامی ہی رہ جاتے ہیں۔ یہ نظریات قبیلوں یا چھوٹی ریاستوں کو مطمئن کر سکتے ہیں۔

نظریاتی عنصر تہذیب کی تشکیل اس طرح کرتا ہے کہ وہ براہ راست انسانی فکر پر اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ کوئی فلسفہ یا مذہب انسان اور کائنات کے تمام عقدہ ہائے لاینحل کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے مخاطب کو بتاتا ہے کہ فی الواقع وہ کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ اس کائنات کی حقیقت اور اس میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟ اور اس اعتبار سے اس کی زندگی کا نصب العین کیا ہونا چاہئے؟ فکر انسانی ان نظریات سے متاثر ہوتی ہے جس کا براہ راست اثر اس کے اعمال پر پڑتا ہے جس کا مشاہدہ اس کی روز مرہ کی زندگی میں کیا جا سکتا ہے۔

اگر کوئی مذہبی نظام ہمہ گیر نوعیت کا ہو تو اس کا اثر تمام شعبہ ہائے زندگی پر پڑتا ہے اور اگر یہ اثرات نتائج کے اعتبار سے بہترین ہوں تو دوسری قومیں بتدریج اس کو اپنا لیتی ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی فلسفہ محض کسی خاص شعبہ سے متعلق ہو تو اس کا اثر اس شعبے پر خصوصیت سے پڑے گا جس طرح سے سوشلزم مارکس اور اینجل کے ان معاشی خیالات پر مبنی ہے جس کی اشاعت انہوں نے حالت جلا وطنی میں لندن میں بیٹھ کر کی۔

یورپ کی جس عظیم صنعتی زندگی کو ٹائن بی مسیحیت کی راہبیت کی ایک ضمنی پیداوار سمجھتا ہے اس کے خیال میں اس عظیم الشان مادی عمارت کی نفسیاتی بنیاد و اساس یہ عقیدہ ہے کہ جسمانی ریاضت و محنت ایک فریضہ ہے اور اس ریاضت کا اعزاز و احترام لازمی ہے۔ اس کے برخلاف محنت کے متعلق یونانی تصور یہ تھا کہ یہ پایہ ثقافت سے گرا ہوا مشغلہ ہے اور اس میں انسان کی تذلیل ہوتی ہے۔[صـ ۲۲]

اسی طرح ہندوستان میں زراعت کی طرف زبردست رغبت اور بحری تجارت سے احتراز کی ایک وجہ تو وہاں کا مخصوص طبعی ماحول تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مقامی ہندوؤں کے نزدیک بحری سفر خلاف عقیدہ تھا۔ اس لئے بھی بحری تجارت کو ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاتھوں فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ یہاں بحری تجارت شروع کرنے والے زیادہ تر عرب یا دوسرے غیر ملکی تھے۔

اسی طرح مذہب کا اثر فنون لطیفہ اور تعمیرات تک پر بھی پڑتا ہے اسلام ایک سیدھا سادا روشن مذہب ہے۔ یہ سادگی مسلمانوں کے فن تعمیر میں بھی نظر آتی ہے دوسرے مذاہب کے معابد میں پراسرار ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کہیں بالکل اندھیرا ہوتا ہے تو کہیں سورج کو رنگے ہوئے شیشوں سے گزارا جاتا ہے تاکہ دماغ پر ایک مخصوص قسم کی اجنبیت اور ہیبت پیدا ہو سکے۔ اسلامی عمارات خصوصا مساجد میں ایسی بازی گری مطلق روا نہیں رکھی جاتی۔ مسجد کی سب سے عام چیز صحن ہے جہاں زیادہ سے زیادہ روشنی اور ہوا آتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کا سارا فلسفہ زندگی ابہام اور رمزیت سے دور ہے لہذا اسلامی عمارت کے نقشے سیدھے سادھے ہوتے ہیں اور یہ عمارت ہندو یا گوتھک عمارتوں کی طرح بھول بھلیاں بھی نہیں ہوتیں۔ [ص ۲۳]

ٹائن بی کا نظریہ تکوین تہذیب

آرنلڈ ' جے ' ٹائن بی اپنی شہرہ آفاق کتاب Study of history (مطالعہ تاریخ) میں ان تکوینی عناصر کا جائزہ پیش کرتا ہے جو انسانی تہذیبوں کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور اس ضمن میں وہ پہلے ماحول اور پھر نسل پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد انہیں تکوینی عناصر کے طور پر قبول نہیں کرتا۔ البتہ مذہب کی تکوینی حیثیت کا قائل ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس باب میں اس ضمن میں اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ غلط یا متنازعہ ہے۔

ٹائن بی دراصل جب لفظ "تہذیب" استعمال کرتا ہے تو اس سے اس کا مطلب

"عظیم تہذیب" ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنے نظریہ میں دراصل تہذیب کی تکوین کی بات نہیں کرتا بلکہ تہذیب کی انتہائی ترقی یافتہ شکل کی تکوین کی بات کرتا ہے اور یوں اس کا موضوع اس موضوع سے بالکل مختلف قرار پاتا ہے۔ جن معاشروں نے ترقی نہیں کی اور تہذیب کی اوج پر نہیں پہنچے انہیں وہ "تہذیب" نہیں مانتا اور نہ ہی انہیں موضوع بحث بناتا ہے۔ جب کہ ہمارا موضوع کسی بھی تہذیب کے تکوینی عوامل سے ہے خواہ وہ عظیم تہذیبیں بن سکی ہوں یا نہیں۔ اسی طرح سے وہ نسل اور ماحول کو بالکل رد نہیں کرتا بلکہ انہیں نئی روشنی میں دیکھتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ مختصراً ٹائن بی کے نظریہ تکوین تہذیب پر روشنی ڈال دی جائے۔ اس ضمن میں ٹائن بی دعوت مقابلہ اور جواب Challenges and response کا نظریہ پیش کرتا ہے اور اسی کو (عظیم) تہذیب کا تکوینی عنصر قرار دیتا ہے۔ یعنی اس کے نزدیک نسل (حیاتیاتی عنصر) اور ماحول (جغرافیائی عنصر) الگ الگ تہذیب کی تکوین نہیں کرسکتے بلکہ تہذیب کی تکوین ان عناصر کے باہمی تعامل میں پوشیدہ ہے۔ وہ اس طرح کہ جب ماحول دعوت مقابلہ دے (یعنی ماحول ناموافق حالات پیدا کردے) اور انسان اپنی قوت اور عقل و دانائی سے اس کا موثر جواب دے تب متمدن معاشرے وجود میں آتے ہیں۔ ماحول "دعوت مقابلہ" دریا، جنگلات، شدید حرارت، طوفان، قحط، خوفناک سمندر، ناموافق آب و ہوا یا بنجر مٹی کی صورت میں دے سکتا ہے۔ اگر انسان اپنی قوتوں سے ان ناموافق حالتوں سے نمٹ لے تو عظیم تہذیب وجود میں آتی ہے۔

اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے ٹائن بی تقریباً تمام بڑی تہذیبوں کی مثال دیتا ہے طوالت کے خوف سے ہم صرف مصری تہذیب کا حوالہ دے کر باب ختم کرتے ہیں۔

مصری تہذیب کی تکوین کی صورت یہ ہوئی کہ برفانی دور کے اختتام پر افریشیا کے خطے میں گہرا طبعی تغیر شروع ہوا یعنی اس میں خشکی پیدا ہونے لگی۔ جب اس علاقے کے لوگوں کو شدید خشک سالی سے سابقہ پڑا تو متاثرہ علاقے کی شکار پر گزر بسر کرنے والی آبادی کے سامنے تین راستے تھے۔ اول یہ کہ وہ اپنے شکار کے پیچھے پیچھے شمال یا جنوب

کی طرف نکل جائیں اور اس طرح ان خطوں میں پہنچ جائیں جہاں کی آب و ہوا ویسی ہی بن گئی تھی جس کے وہ عادی تھے۔ دوئم یہ کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں اور جو تھوڑے بہت جانور خشک سالی سے بچ رہے تھے ان کے شکار پر جوں توں کر کے بسر اوقات کریں۔ سوئم یہ کہ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں لیکن جانور پال کر کھیتی باڑی کر کے حالات پر قابو پائیں۔

یہ حالت پیش آنے پر جن لوگوں نے نہ وطن چھوڑا نہ طرز بود و باش بدلا یعنی دوسرا طریقہ اختیار کیا وہ تو صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ خشک سالی نے انہیں دعوت مقابلہ دی لیکن وہ اس کا مناسب جواب دینے میں ناکام رہے۔

جن لوگوں نے وطن نہ چھوڑا اپنا طرز معاشرت بدل لیا (یعنی تیسرا طریقہ اختیار کیا) وہ شکار کو چھوڑ کر گلہ بانی میں لگ گئے اور صحرائے افریشیا کے خانہ بدوش بن گئے۔

جن لوگوں نے اپنی جائے سکونت بدل لی اور طریق بود و باش نہ چھوڑا وہ خشک سالی سے بچنے کے لئے شمال کی جانب بارانی ہواؤں والے خطے میں چلے گئے۔ اس طرح انہیں بلا ارادہ ایک نئی دعوت مقابلہ سے دوچار ہونا پڑا جو لوگ اس شدید سرد موسم سے بچ گئے ان میں ایک نئی تخلیقی قوت حرکت میں آ گئی۔

جو لوگ خشک سالی سے بچنے کے لئے جنوب کی سمت چلے گئے جہاں بارشیں ہوتی تھیں، وہ منطقہ حارہ کی یکساں اور بے رنگ آب و ہوا سے پیدا ہونے والے روح فرسا اثرات کے ماتحت آ گئے لوگوں کا پانچواں اور آخری گروہ وہ تھا جس نے خشک سالی کی دعوت مقابلہ میں اپنی جائے سکونت بھی بدل لی اور طریق معاشرت بھی بدل لیا اس نادر دوگونہ رد عمل کے باعث افریشیا کے بتدریج معدوم ہونے والے مرغزاروں کے بعض قدیم معاشروں سے مصر اور سمیریا کی تہذیبیں معرض وجود میں آ گئیں۔

حواشی و حوالہ جات

(۱) ٹائن بی، آرنلڈ جے مطالعہ تاریخ جلد اول ص ۱۱
(۲) تلخیص ڈی - سی - سومرویل، ترجمہ غلام رسول مہر، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۴ء
(۳) ابن خلدون "مقدمہ"
(۴) ڈاکٹر سید عابد حسین، قومی تہذیب کا مسئلہ
(۵) ایضاً
(۶) ایضاً
(۷) ندوی، سید ابوالحسن علی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، کراچی ۱۹۷۶ء ص ۲۴۱
(۸) ٹائن بی ص ۱۰۴
(۹) ایضاً ص ۱۳۱
(۱۰) ٹائن بی ص ۱۰۴
(۱۱) ابن خلدون، ص ۱۶۲
(۱۲) ٹائن بی ص ۱۰۵
(۱۳) ایڈولف ہٹلر Mein Kampf، بوسٹن ص ۴۲۶
(۱۴) ٹائن بی ص ۱۰۵
(۱۵) انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز جلد ۳ ص ۶۲۲
(۱۶) ROBERT BIERSTEDT ص ۳۷
(۱۷) "نسل کی اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کے خاص گروہوں میں چند امتیازی وصف ہیں جو ان کے جانشینوں میں بطور میراث منتقل ہو جاتے ہیں (ٹائن بی ص ۱۰۴)
(۱۸) (اعیان)، دراصل ایک تشریح طلب اصطلاح ہے جو افلاطون کی وضع کردہ ہے افلاطون اور بعض فلسفیوں کے خیال میں وجود کی کئی قسموں میں سے ایک قسم "عینی" ہوتی ہے۔ اس میں وہ مثالی نمونے یا معیار داخل ہیں جن پر ہم پوری زندگی کے ہر ہر اصول و فعل کو پرکھتے ہیں اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں۔ ان اعیان کو "اقدار اعلیٰ" بھی کہا جا سکتا ہے۔ جن میں حق، حسن اور انصاف وغیرہ شامل ہیں۔ (قومی تہذیب کا مسئلہ ص ۶)
(۱۹) "معروضی ذہنی" یہ بھی وجود کی ایک قسم ہے اس کی تشریح یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ خیالات،

متعقدات اور اصول جو صرف ایک فرد کے نفس تک محدود نہ ہوں بلکہ بہت سے افراد میں مشترک ہوں اور ایک پود سے دوسری پود میں منتقل ہوتے رہیں مثلاً مذہب، قانون، ریاست (مجرد معنوں میں) وغیرہ --- فلسفیوں نے اس قسم کے وجود کا نام "ذہنی معروضی" وجود رکھا ہے۔ (قومی تہذیب کا مسئلہ ص ۶ - ۵

(۲۰) قومی تہذیب کا مسئلہ ص ۲۷

(۲۱) قومی تہذیب کا مسئلہ ص ۲۷

(۲۲) مطالعہ تاریخ، ٹائن بی ص ۴۳۸

(۲۳) صدیقی، عبدالحمید، عقیدہ ختم نبوت کے چند عمرانی پہلو، مرکز مطبوعات اسلامیہ لاہور، ۱۹۷۴ء طبع اول ص ۳۲

باب چہارم

ہندوستانی تہذیب

ہندوستانی تہذیب دنیا کی قدیم ترین اور کئی اعتبار سے منفرد تہذیب ہے۔ منفرد ان معنوں میں کہ گو کہ یہ تمدن نہایت قدیم ہے مگر اب تک زندہ سلامت ہے اور یہاں ہمیں تہذیبی ارتقاء کے تمام مدارج نظر آتے ہیں نیز یہ تہذیب کسی ایک قوم کی تہذیب نہیں ہے بلکہ یہ زمین مختلف اقوام و ملل کا گہوارہ رہی ہے۔ مختلف قوموں اور ملتوں نے اس زمین کو اپنا وطن بنایا' اپنی تہذیب متعارف کرائی' یہاں کی مقامی تہذیب سے متاثر ہوئیں اور یوں یہاں بیک وقت مختلف مذاہب اور تہذیبیں نظر آتی ہیں۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستانی تہذیب کی تاریخ دراصل تہذیب عالم کی تاریخ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

پھر اپنے حدود اربعہ اور آب و ہوا کے اعتبار سے بھی ہندوستان بجائے خود ایک دنیا ہے۔ مثلث نما یہ وسیع و عریض ایشیائی ملک اپنے جنوب' جنوب مغرب اور جنوب مشرق میں گہرے سمندر میں گھرا ہوا ہے تو اس کے شمال' شمال مغرب اور شمال مشرق میں سربفلک پہاڑوں کا طویل سلسلہ ہے ان پہاڑوں اور سمندروں نے ہندوستان کو وسط ایشیا کے دوسرے ممالک سے بالکل جدا کر رکھا ہے۔ البتہ شمال مغرب پہاڑی سلسلہ میں متعدد کشادہ درے ہیں مثلاً درہ خیبر' درہ ٹوچی' درہ بولان اور درہ مکران وغیرہ یہ کشادہ درے ہی وہ راستے ہیں جن سے گزر کر مختلف زمانوں میں مختلف اقوام ہندوستان میں داخل ہوتی رہیں۔

مورخین کے خیال کے مطابق ہندوستانی تہذیب آٹھ واضح ادوار میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

۱ - وادی سندھ کی قدیم تہذیب
۲ - رگ ویدی تہذیب
۳ - دور شجاعت کی تہذیب (۱۵۰۰ق-م تا ۱۰۰۰ق-م)
۴ - برہمنی تہذیب (۱۰۰۰ق-م تا ۳۰۰ق-م)
۵ - بدھ تہذیب (۳۲۰ق-م تا ۵۰۰ء)
۶ - پرانک یا جدید برہمنی تہذیب (۵۰۰ء تا ۱۰۰۰ء)
۷ - اسلامی تہذیب
۸ - یورپی تہذیب

اس میں آخر الذکر دو ادوار ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہیں لہٰذا ہم آئندہ صفحات میں ہندوستانی تہذیب کے ابتدائی چھ ادوار پر روشنی ڈالیں گے۔

وادی سندھ کی قدیم تہذیب :-

اگرچہ ہندوستان میں قدیم ترین ایام ہی سے متعدد قوموں اور نسلوں کے قبیلے، تاجر اور حملہ آور شمال مغربی دروں کے راستے آ آکر آباد ہوتے رہے تاہم وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہاں انسانی معاشرے کی بنیاد کب پڑی۔ راولپنڈی کے نواح میں پتھر کے بعض اوزار زمین سے نکلے ہیں جنہیں ماہرین علم الاثار دو سے چار لاکھ سال پیشتر کا بتاتے ہیں[ص] لیکن ایک منظم اور باقاعدہ تہذیب کے قدیم ترین آثار موئن جوداڑو (ضلع لاڑکانہ، سندھ) اور ہڑپا (ضلع ساہیوال، پنجاب) میں پائے گئے ہیں۔ ان کھنڈرات سے ملنے والے آثار و شواہد کی روشنی میں جدید خیال یہ ہے کہ دریائے سندھ کے کناروں پر اب سے چھ سات ہزار سال قبل (یعنی تقریباً پانچ ہزار سال قبل مسیح) انسانی تہذیب کی ابتداء ہو چکی تھی[ص]۔ اور یہ تہذیب، علم الاثار کے محققین کے خیال کے مطابق تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل اپنے عروج پر تھی[ص]۔
وادی سندھ کی تہذیب سمیر کی اولین تہذیب اور ایلام و میسوپٹامیہ کے طوفان

نوح سے قبل کے دور کے تہذیب کے نہ صرف ہمعصر تھی بلکہ کئی اعتبار سے ان سے برتر بھی تھی نیز یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ عہد ما قبل تاریخ میں وادی سندھ کے لوگوں کے وادی دجلہ و فرات کے لوگوں سے تجارتی تعلقات قائم تھے اور ان کے مابین آمدورفت کا سلسلہ عام تھا۔[5]

وادی سندھ کی یہ تہذیب ایک ہزار میل سے زائد وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھی جو رقبہ میں بابل سے چار گنا اور مصر سے دوگنا ہے[6] قیاس ہے کہ اس زمانے کے یہ لوگ دراوڑی نسل کے تھے (جو ہندوستان کے اصلی باشندے تھے) اس خیال کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ بلوچستان میں بروہی قبیلے کے لوگ اب بھی "براہوی" بولتے ہیں جو دراوڑی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔[7] یہ قوم مہذب' متمدن اور ترقی یافتہ تھی اور آریاؤں کے دور سے قبل ہندوستان کے شمال اور شمال مغربی حصوں میں ان کی تہذیب عروج پر تھی۔

یہ ایک مکمل شہری تہذیب تھی جہاں صفائی' حفظان صحت' اور نکاسی آب کا انتہائی معیاری انتظام تھا۔ تعمیرات کے معاملہ میں بھی وہ اپنی ہم عصر تہذیبوں سے بہت آگے تھے بلکہ یکتا تھے۔[8]

یہ لوگ دیوی دیوتاؤں کو پوجتے تھے۔ موئن جوداڑو کے کھنڈرات سے ماتا دیوی کے مجسمے کثرت سے ملے ہیں (برصغیر میں آج بھی ماتا دیوی کے مندر اور معبد تقریبا ہر گاؤں اور ہر شہر میں پائے جاتے ہیں) اس کے ساتھ ساتھ ایک دیوتا کا مجسمہ بھی ملا ہے جسے سرجان مارشل "شیو" کا مماثل سمجھتے ہیں۔[9] اس کے علاوہ یہ لوگ درختوں' جانوروں' پتھروں کے علاوہ مرد و عورت کے مخصوص اعضاء کے مجسموں کی بھی پوجا کرتے تھے۔ جواہر لعل نہرو نے اپنی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" میں لکھا ہے کہ ہرچند کہ وادی سندھ میں مذہب کا عنصر موجود تھا مگر وہ بہت طاقتور عنصر نہیں تھا اور مجموعی طور پر وادی سندھ کی تہذیب ایک لادین تہذیب تھی[10] اس خیال سے اتفاق نہایت دشوار ہے کیونکہ قرائن و آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مذہبی عقائد نے ان کے آرٹ' موسیقی اور طرز معاشرت سب کو براہ راست متاثر کیا تھا اور ان کی تہذیب

میں مذہب کا عنصر نہایت قوی تھا خواہ یہ مذہب اوہام کا مجموعہ ہی کیوں نہ رہا ہو۔

رگ ویدی تہذیب

دراوڑوں (DRAVIDIANS) کا یہ اعلیٰ تمدن جب اپنے عروج پر پہنچا تو یہاں آریوں کا ورود ہوا۔ ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ سفید جلد' دراز قامت اور سیاہ بالوں والے آریاؤں کے مختلف قبیلوں نے یکے بعد دیگرے شمال مغربی دروں سے داخل ہو کر ہندوستان میں آباد ہونا شروع کیا آریا کافی مدت تک پنجاب اور وادی سندھ کے علاقوں میں آباد رہے اس کے بعد یہ موجودہ اتر پردیش کے مغربی علاقوں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔

آریا مختلف قبائل میں بٹے ہوئے تھے جو ہمیشہ باہم نبرد آزما رہتے۔ اسی عدم اتحاد کی وجہ سے انہوں نے اپنے الگ الگ علاقے آباد کیے۔ ان قبیلوں میں کچھ حضری تھے اور کچھ بدوی ان کی ابتدائی آبادیاں گاؤں یا چھوٹے قصبوں کے طرز پر تھیں اور بیشتر دریا کے کنارے تھیں۔

انہیں فن زراعت کا علم تھا اور اکثر ابتدائی اقوام کی طرح ان کا متخیلہ نہایت زبردست تھا تاہم لوگ ابھی تک فن تحریر سے آشنا نہیں تھے اور ان کا جتنا علم تھا وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا تھا۔ ان لوگوں میں مردوں کو دفن کرنے اور جلانے دونوں کا رواج تھا۔ وہ عموماً سبزی' دودھ اور گوشت استعمال کرتے تھے۔ شکار' بیل گاڑیوں کی دوڑ' موسیقی اور رقص کا انہیں خاص طور سے شوق تھا ان کی اجتماعی زندگی کی تنظیم بڑی سادہ تھی وہ گاؤں میں رہتے تھے اور قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔[ص۱۱] اس دور میں کسی قسم کے سیاسی اتحاد یا کسی حکومت کا مطلق پتہ نہیں چلتا ان کی معاشرت کی بنیاد خاندان پر تھی۔ خاندان ان کے نزدیک سب سے بنیادی اور اہم ادارہ اور دنیا و عقبیٰ کی ساری نعمتوں کا مرکز تھا[ص۱۲] ہندو معاشرے کی وہ واضح نسلی تفریق جو بعد کے زمانے میں نظر آتی ہے اس عہد میں مفقود تھی اگرچہ رگ وید کے آخری بھجنوں (سوکتوں) میں سے ایک میں برہمن' کشتری اور ویش کے نام آئے ہیں۔[ص۱۳] لیکن اس سے زیادہ

نہیں' اس عہد میں معاشرتی طور پر مکمل سماجی مساوات قائم تھی عورتوں کو معاشرے میں قابل تعظیم درجہ حاصل تھا۔ وحدۃ الازواج کی روایت تھی اور لڑکیوں کو اپنے شوہروں کے انتخاب کی پوری آزادی حاصل تھی۔[13]

فنون میں ان کے پاس صرف شاعری کا فن تھا فن تعمیر سے نابلد تھے نہ مندر تھے نہ معبد اور نہ ہی اصنام پرستی بلکہ آریا سرے سے بتوں کے تصور سے ہی ناآشنا تھے۔ آریا جو مذہب اپنے قدیم وطن سے اپنے ساتھ لائے تھے وہ زیادہ تر دو چیزوں پر مشتمل تھا یعنی اجداد (پرکھوں) کی ارواح کی پرستش اور مظاہر فطرت کی پرستش[15] گویا قدرت کے مظاہر کو انہوں نے دیوتاؤں کی شکل عطا کر کے ان کی پوجا شروع کر دی' دیاؤس (آسمان دیوتا) اور پرتھوی (زمین دیوتا) آریاؤں کے غالباً سب سے قدیم معبود تھے جن کا ذکر کثرت سے رگ وید میں آیا ہے۔[16] اس کے علاوہ سوریہ (سورج دیوتا) اور اگنی (آگ دیوتا) کا بھی کافی تذکرہ ہے بحیثیت مجموعی رگ وید میں ۳۳ دیوتاؤں کا پتہ چلتا ہے۔

"رگ وید" ان کی قدیم ترین مذہبی کتاب تھی۔ یہ ۱۰۱۷ یا ۱۰۲۸ "اشلوکوں" پر مشتمل ہے جو دس "منڈلوں" میں بٹا ہوا ہے۔ آریاؤں کی قدیم تہذیب و تمدن' خانہ جنگیوں' "سپت سندھو" کے طبعی خدو خال اور مذہب کے متعلق اس کتاب میں خاطر خواہ مواد موجود ہے اور اس عہد کی تاریخ کے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ تین اور ویدیں "سام وید" "یجروید" اور "اتھروید" بھی ہیں جو ہندوؤں کے نزدیک الہامی کتابیں ہیں اور جو آریہ رشیوں پر نازل ہوئیں۔

دیوتاؤں کی پوجا کا طریقہ سادہ تھا یعنی منتروں کا پڑھنا' دیوتا پر سوم رس چڑھانا اور قربانی کرنا عبادت تھا۔ مذہب کی یہ نوعیت بڑی مادی اور تجارتی تھی یعنی یہ دیوتاؤں کی مدح سرائیاں کرتے ان کو سوم رس' دودھ اور شہد کے چڑھاوے چڑھاتے' بعض اوقات جانوروں کی قربانیاں کرتے اور اس کے عوض دیوتا انہیں مال مویشی اور دشمنوں پر فتح عطا کرتے۔ ان کے خاندان کی حفاظت کرتے' امراض سے بچاتے' ان کے کھیتوں میں پانی برساتے اور ان کی گایوں کو گابھن بناتے۔[17] آریوں میں اخلاقی

زتی کم ہے۔ ویدوں میں صرف تین اخلاقی باتوں کی تلقین کی گئی ہے۔ خیرات' حیوانوں پر مہربانی اور دوستوں کے ساتھ وفاداری۔

دور شجاعت کی تہذیب :۔ (۱۵۰۰ق۔م تا ۱۰۰۰ق۔م)

رگ ویدی تہذیب کے بعد آریائی معاشرہ داخلی اور خارجی اسباب کی بنا پر مختلف پہلوؤں سے متاثر ہوا۔ اس وقت آریا اپنے ابتدائی مسکن "ست سندھو" سے نکل کر سارے شمالی برصغیر میں پھیل چکے تھے اور ان کی تہذیب و تمدن کا مرکز پنجاب سے منتقل ہو کر گنگا اور جمنا کی وادیوں میں پہنچ چکا تھا۔ قدیم اور سادہ آریائی معاشرہ بتدریج تبدیل ہو رہا تھا اور ان کی سیاسی و سماجی زندگی میں اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ دور شجاعت یا رزمیہ عہد ہندو معاشرہ کے لئے ایک عبوری دور تھا۔ اسی زمانے میں ہندو سماج کے عقائد و رسوم نے موجودہ شکل اختیار کی۔ رگ ویدی عہد کی سماجی مساوات رفتہ رفتہ تحلیل ہونے لگی اور ہندو معاشرہ واضح طور پر چار ذاتوں میں تقسیم ہو گیا۔ قبائلی ریاستوں کی جگہ بڑی بڑی سلطنتوں نے لے لی۔ پھر قصبات کے ساتھ ساتھ شہر بھی آباد ہونا شروع ہوئے جو اہم تجارتی اور صنعتی مراکز بھی ہوتے تھے۔ انہی بڑے شہروں میں ایک ٹیکسلا بھی تھا جو ایک اہم منڈی ہونے کے علاوہ علم کا بھی مشہور مرکز تھا۔ [صـ۱۸]

قدیم آریائی معاشرہ میں عورت کو جو عزت و مرتبہ حاصل تھا اگرچہ اس میں تھوڑی کمی آ گئی تھی تاہم پھر بھی وہ اس عہد میں سماج کا باوقار کردار نظر آتی ہے۔ طلاق اور بچپن کی شادی کا رواج نہیں تھا۔ بیوہ کو دوسری شادی اور اونچے گھرانے کی لڑکیوں کو بعض اوقات سوئمبر کے ذریعہ اپنے خاوند کے انتخاب کا حق حاصل تھا۔ ستی کی رسم کا مطلق پتا نہیں چلتا' ہندو عورت پردہ بھی نہیں کرتی تھی صرف سگا بھائی اور باپ محرم سمجھے جاتے تھے[صـ۱۹] عورت اپنے شوہر کے شانہ بشانہ عبادات' پوجا پاٹ اور دیگر سماجی تقریبات میں حصہ لیتی تھی۔

رگ ویدی عہد کی طرح رزمیہ عہد میں بھی کپڑے کی کتائی اور سلائی کا رواج

نہیں تھا۔ لباس کے طور پر عموماً چادریں استعمال کی جاتی تھیں۔ خوراک بھی رگ ویدی عہد کی طرح سادہ تھی البتہ تعلیم کا رواج عام ہونے لگا تھا۔ طلباء کو عموماً ویدوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دیگر علوم ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ آریا سماج میں جیومیٹری اور علم نجوم وغیرہ کی ابتداء اسی عہد میں ہوئی۔

اس عہد میں آریاؤں کے قدیم دیوتا (اندر، سوریہ، اگنی وغیرہ) آہستہ آہستہ غیر مقبول ہوتے جارہے تھے اور ان کی جگہ برہما، وشنو اور شو مقبول ہو گئے گویا یہ ہندوستان کے خانہ زاد معبود تھے اور اس بات کو خارج از امکان نہیں قرار دیا جاسکتا کہ ان معبودوں کی 'تخلیق' میں وادی سندھ کی قدیم تہذیب کے اثرات یا ہندوستان میں پھیلی ہوئی قدیم دراوڑی تہذیب کے اثرات آریاؤں نے قبول کئے ہوں۔ بہر حال وشنو کشتریوں کا خاص دیوتا تھا جس کی بیوی لکشمی دیوی تھی اور شو (زندگی اور موت کا دیوتا) برہمنوں کا خاص دیوتا تھا اور پروتی اس کی بیوی تھی۔ ان دیوتاؤں کے وجود کو رگ ویدی عہد کے اواخر تک تسلیم کیا جاچکا تھا۔ رزمیہ عہد میں یہ زیادہ مقبول ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ انہوں نے قدیم دیوتاؤں کی جگہ لے لی۔ "رامائن" اور "مہا بھارت" میں خصوصیت کے ساتھ وشنو کی عظمت پر زور دیا گیا ہے اور بھگوت گیتا (ہندوؤں کی یہ مقدس نظم مہا بھارت کا اہم حصہ ہے) میں کرشن کو وشنو کا اوتار بنا کر ایک فعال معبود کا نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

رامائن اور مہا بھارت ہندوؤں کی دو نہایت اہم، مقدس رزمیہ نظمیں ہیں جو اس عہد کے واحد تاریخی ماخذ بھی ہیں۔ "مہا بھارت" ہندوؤں کے لٹریچر میں سب سے طویل تالیف ہے اس میں دو لاکھ پندرہ ہزار بیتیں ہیں۔ ہندوؤں کے عقائد کے مطابق یہ کتاب رشی والمیکی (Vaimiki) کی تصنیف ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے یہ نظم صدیوں میں تالیف ہوئی ہے اور اس کا مؤلف کوئی ایک شخص نہیں لہٰذا اس کا زمانہ متعین کرنا بھی ممکن نہیں۔ مہا بھارت کا ایک حصہ تو نہایت قدیم ہے اس میں وقتاً فوقتاً الحاق اور اضافے ہوتے رہے اور اس کے جدید سے جدید حصہ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ تیسری صدی عیسوئی کے مابعد کا ہے ہندوؤں کی نظر میں مہا بھارت کا

درجہ بہت اونچا ہے اور کہا جاتا ہے کہ دیوتاؤں کے سامنے چاروں ویدوں کو ایک پلہ میں اور مہابھارت کو دوسرے پلے میں رکھا گیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ مہابھارت کا پلہ بھاری ہے[ص۲۳]۔ جو کوئی اس کتاب کا ایک حصہ بھی پڑھ لے اس کے تمام گناہ دھل جاتے۔

لفظ مہابھارت کے لفظی معنی خاندان بھارت کی تاریخ کے ہیں[ص۲۴]۔ ہستاپور (جو دہلی کے قریب تھا) آریاؤں کے دو قبیلے کورو اور پانڈو آباد تھے جو آپس میں ایک دوسرے کے رقیب تھے ان دونوں میں جو زبردست جنگ ہوئی اس کی تاریخ مہابھارت میں درج ہے۔ جس میں کچھ افسانویت اور بہت زیادہ رطب ویابس بھی بھرا ہوا ہے۔

"رامائن" جو کئی صدی قبل مسیح کی تالیف ہے ضخامت میں مہابھارت کی ربع ہے[ص۲۵] اس میں صرف ۲۴ ہزار بیتیں ہیں۔ ہندو روایت کے مطابق یہ رشی دیاس (Vyasa) کی تصنیف ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے مہابھارت کی طرح اس کی تالیف بھی صدیوں میں مکمل ہوئی لہٰذا یہ کسی ایک رشی کا کام نہیں نیز اس کا زمانہ تصنیف بھی اسی وجہ سے متعین نہیں کیا جاسکتا تاہم یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ رامائن مہابھارت سے قدیم ہے۔ اس کتاب میں رام چندر جی اور سیتا کی داستان بیان کی گئی ہے۔

مذہبی اعتبار سے اس عہد میں اپنشدوں کو بھی مقبولیت حاصل رہی۔ اپنشد ویدی ادب کا آخری مگر ضخیم حصہ ہے جس میں ہندو مت کا تقریباً پورا فلسفہ سمویا ہوا ہے۔ اس میں ہندوؤں کے مذہبی خیالات اوج کمال پر نظر آتے ہیں اور وہ بلند ترین وحدانیت کے قریب جا پہنچتے ہیں۔ اپنشد خدا کے نفوذ مطلق سے بحث کرتے ہیں جو ایک ایسا تصور ہے جس نے بعد کے زمانوں میں مادی وحدت الوجود کی شکل اختیار کرلی[ص۲۶]۔

رزمیہ عہد میں فلسفے نے کافی ترقی کی تناسخ اور کرم کے نظریات اسی عہد میں اختیار کئے گئے۔ "کرم" کے عقیدہ کے مطابق ہر عمل چھوٹا ہو یا برا' اچھا ہو یا بڑا انسانی روح پر اثر انداز ہوتا ہے اور انسان اپنے عمل (کرم) کے اعتبار سے جزا یا سزا کا مستحق ہوتا ہے اور اچھا یا برا جنم لیتا ہے۔

تناسخ کے عقیدہ کے مطابق انسان کو صرف ایک زندگی نہیں ملتی بلکہ مرنے کے بعد

وہ پھر جنم لیتا ہے۔ ہر موت کے بعد اس کا نامہ اعمال "یامہ (Yama)" یعنی موت کے دیوتا کے سامنے پیش ہوتا ہے جو اس کے مطابق اسے کوئی دوسرا جنم دے کر دنیا کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے اور یہ چکر اس وقت ختم ہوتا ہے جب انسان اچھے اور مقبول اعمال ذخیرہ کرلیتا ہے۔ اس وقت اسے "مکتی" حاصل ہوتی ہے۔ (مکتی کی وضاحت اس عہد میں نہیں ملتی)

اس عہد کے اواخر میں آہستہ آہستہ برہمنوں نے مذہبی فرقہ کے طور پر مذہب و معاشرہ پر اپنی گرفت مضبوط کرلی بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اپنی اجارہ داری مستحکم کرلی اور یوں "دور برہمنیت" کا آغاز ہوا۔

برہمنی تہذیب : - (۱۰۰۰ ق۔م تا ۳۰۰ ق۔م)

اس عہد کو پران و منوسمرتی کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جو صحیح معنوں میں ہندو تہذیب و تمدن کو نمایاں طور پر پیش کرتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی یہ عہد دوسرے ادوار کی بہ نسبت زیادہ صاف اور واضح ہے کیونکہ اس دور سے متعلق کچھ نہ کچھ مستند تاریخی مواد ضرور مل جاتا ہے۔

رگ ویدی تمدن کا مرکز پنجاب تھا۔ (اس کے بعد دور شجاعت میں وہ اپنی توسیع و استحکام میں لگے رہے) اور برہمنی تمدن وادئی گنگا کا تمدن ہے۔ تقریبا ایک ہزار سال کی مدت تک جو ان دونوں تمدنوں کا درمیانی زمانہ ہے آریا قوم برابر مشرق کی طرف بڑھتی رہیں اور تقریبا کل ہندوستان پر قابض ہو گئیں۔ یہاں کے قدیم باشندے لڑائی بھڑائی چھوڑ کر پوری طرح ان کے محکوم ہو چکے تھے اور آریاؤں میں اپنی نسل کو خالص رکھنے کا احساس شدید تر ہو چکا تھا کیونکہ آریاؤں کو معلوم ہو چکا تھا کہ اگر کوئی قلیل التعداد فاتح قوم اپنی پوری حفاظت نہ کرے تو وہ بہت جلد مفتوح اقوام میں کھپ جاتی ہے اور اس کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اگر ماں اور باپ کی نسل ایک نہ ہو تو اولاد نہایت کم درجہ کی پیدا ہوتی ہے[۲۲]۔ چنانچہ انہوں نے "سترہ" تصنیف کئے اور "دھرم ستر" کے اندر مختلف ذاتوں کو مختلف مقام عطا کیا اور اس

تقسیم کو ازلی و بنیادی قرار دیا۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف ذاتوں کی ذمہ داریاں، حقوق و فرائض اور مشاغل متعین کیے۔ "دھرم سترہ" کو ہندو قانون کے ماخذ کی حیثیت حاصل رہی۔ دھرم کے معنی مذہب، فرائض اور اعمال کے ہیں اور "سترہ" کے لفظی معنی تو دھاگہ کے ہیں مگر اصطلاحی معنی "مقدس کتابوں کی طرف راہنمائی کرنے والی بیاض" کے ہوئے۔ ان کی تصنیف چھٹی صدی قبل مسیح کے بعد کی ہے۔[28]

لیکن اس کے باوجود آریاؤں نے محسوس کیا کہ مقامی لوگوں کے ساتھ انجذاب و اتصال (Assimilation) کے عمل کو مکمل طور پر روک دینا دھرم سترہ جیسے قوانین کی موجودگی کے باوجود، ممکن نہیں رہا اور وہ غیر آریائی نظریات و اثرات قبول کرنے لگے ہیں نیز بدھ مت بھی (گوتم بدھ کا ظہور چھٹی صدی قبل مسیح میں ہو چکا تھا اور اس کی تعلیمات عام ہو رہی تھیں) ان کی مذہبی و نسلی برتری اور تفوق و امتیاز کے لئے شدید خطرہ بن کر منڈلا رہا ہے لہٰذا انہوں نے اپنی بالا دستی کو برقرار رکھنے کے لئے ایک نیا قدم یہ اٹھایا کہ "دھرم سترہ" (جو اس وقت کے برہمنی تقاضوں کو پورا نہیں کر رہا تھا) کی تشکیل نو کی جائے۔

چنانچہ انہوں نے دھرم سترہ کی تالیف نو کی اور ان کا نام "دھرم شاستر" رکھا۔ یہ بھی "دھرم سترہ" کی طرح کافی تعداد میں لکھی گئیں۔ مگر ان میں سب سے زیادہ شہرت منوجی کے دھرم شاستر کو حاصل ہوئی۔ چونکہ یہ کتابیں غیر الہامی ہیں اس لئے ان کو الہامی کتابوں یعنی "سروتی" سے ممیز کرنے کے لئے "سمرتی" کہا جانے لگا۔ چنانچہ عام طور پر "منو دھرم شاستر" کے بجائے "منو سمرتی"[29] بولنے لگے۔

منو شاستر یا منو سمرتی تین سو سال قبل مسیح میں تصنیف ہوئی جب کہ ہندوستان میں برہمنی تہذیب اپنے عروج پر تھی اور اس کو بہت جلد ہندوستان بھر کے مدنی و سیاسی قانون کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ نیز اس عہد کے سب سے اہم تاریخی ماخذ کے طور پر بھی منو سمرتی قابل ذکر ہے جو اس عہد کی کماحقہ تصویر کشی کرتی ہے۔

منو شاستر میں ہے : -

"قادر مطلق (برہما) نے دنیا کی بہبودی کے لئے اپنے منہ سے اور اپنے بازوؤں سے

اور اپنی رانوں سے اور اپنے پیروں سے برہمن' کشتری' ویش اور شودر کو پیدا کیا۔"(باب اول۔۳۱)

"اس دنیا کی حفاظت کے لئے اس نے ان میں سے ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ فرائض مقرر کئے۔"(باب اول۔۸۷)

"برہمنوں کے لئے وید کی تعلیم اور خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے دیوتاؤں کو چڑھاوے دینا اور دان لینے دینے کا فرض قرار دیا۔(باب اول۔۸۸)

"کشتری کو اس نے حکم دیا کہ خلقت کی حفاظت کرے۔ دان دے' چڑھاوے چڑھائے' وید پڑھے اور شہوات نفسانی میں نہ پڑے۔"(باب اول۔۸۹)

"ویش کو اس نے یہ حکم دیا کہ مویشی کی سیوا کرے' دان دے' چڑھاوے چڑھائے' تجارت' لین دین زراعت کرے۔"(باب اول۔۹۰)

"شودر کے لئے قادر مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا۔ وہ ان تینوں کی خدمت کرتا ہے۔"(باب اول۔۹۱)

صرف منوشاستر میں ہی نہیں بلکہ تمام دھرم شاستروں کی بنیاد' ذات کی ایسی تفریق پر رکھی گئی ہے۔ اور مقدمہ کے طور پر دو اصولوں کو سب سے پہلے تسلیم کیا گیا ہے۔ اول یہ کہ انسانی آبادی چار ذاتوں کے اندر بٹی ہوئی ہے جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا۔ ان میں سے اول الذکر تین ذاتیں دوج یا دوجَ ہیں۔ یعنی مرنے کے بعد پھر جنم لیتے ہیں لیکن شودر کا صرف ایک جنم ہے۔ دوئم یہ کہ ذاتوں میں برہمن کی ذات سب سے بلند ہے اور اس کی حیثیت دیوتا کی ہے "برہمن کا غضب دیوتا کے غضب سے زیادہ خطرناک ہے۔"(منوسمرتی۔باب ۱۲)

"جب کوئی برہمن پیدا ہوتا ہے تو وہ دنیا میں سب سے اعلیٰ مخلوق ہے۔ وہ بادشاہ ہے کل مخلوقات کا اور اس کا کام ہے شاستر کی حفاظت"(منوسمرتی۔باب اول ۹۹)

برہمنوں کو دیوتاؤں جیسا مقام حاصل تھا انہیں یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ بادشاہ کے مشیر بنتے اور بادشاہوں (جو عموماً کشتری ہوتے) کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ برہمنوں کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کریں۔ ضرورت کے وقت برہمنوں کو جائز تھا کہ وہ کوئی پیشہ

اختیار کرلیں یا تجارت کریں لیکن عموماً ان کی گزر اوقات کشتریوں کی داد و دہش پر ہوا کرتی تھی کیونکہ برہمن کو دان دینا ہندوؤں کے اعلیٰ ترین فرائض میں سے تھا۔[۳۰] نیز برہمن بلا عذر، وقت ضرورت اپنے غلام شودر کا مال بہ جبر لے سکتا تھا کیونکہ غلام صاحب جائیداد نہیں ہو سکتا اس کی کل املاک مالک کا مال ہے۔[۳۱] بادشاہ برہمنوں سے کسی قسم کا Tax یا محصول نہیں لے سکتے تھے۔[۳۲] اسی طرح ان کی سزائیں بھی دوسری ذاتوں کے مقابلے میں بہت ہلکی تھیں۔ البتہ ان غیر معمولی حقوق کے ساتھ ساتھ ان کے فرائض بھی سختی کے ساتھ محدود کر دیئے گئے تھے۔ ان کی زندگی کو چار آشرم کے اندر تقسیم کیا گیا۔

۱ ۔ برہم چاریہ : طفولیت یا زندگی کے ابتدائی پچیس سال جس میں یہ علم حاصل کرتے (خصوصاً ویدوں کا علم) اور خاص استادوں سے مذہب کے اسرار سیکھتے۔

۲ ۔ گرہستھ : جوانی یا پچیس۔ سے پچاس سالہ دور زندگی، جس میں برہمن شادی کرتا اور خانہ داری کے فرائض ادا کرتا۔ جس میں سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ صاحب فرزند ہو۔

۳ ۔ ونا پرستھ : ادھیڑ عمری یا پچاس سے پچھتّر سالہ دور زندگی جس میں برہمن خانہ نشینی اختیار کرتا، اور غور و فکر، مشاہدہ و ریاضت اور عبادت میں مصروف رہتا۔

۴ ۔ سنیاس : بڑھاپے یا زندگی کا آخری حصہ جس میں برہمن کو تارک الدنیا ہو جانے کی ہدایت ہوتی۔ اس دور تک پہنچتے پہنچتے برہمن پختہ کار ہو جاتا اور اس میں ایسی روحانیت آجاتی کہ وہ خدا تک پہنچ جاتا۔ اس دور میں وہ مراقبہ میں موت کی تیاری کرتا۔

آشرم دھرم تینوں دوج ذاتیں اختیار کر سکتی تھیں لیکن خصوصیت سے یہ برہمنوں کے لئے مخصوص تھا جس کے عوض انہیں بے اندازہ حقوق حاصل ہوئے۔ یہاں تک کہ وہ دیوتاؤں کے ہمسر ہو گئے۔ جب کہ معاشرے کی دوسری انتہا پر شودر تھے جن کا

درجہ حیوانوں سے بدتر تھا وہ پیدائشی غلام تھے اور ان کا واحد کام دوج خصوصاً برہمن کی خدمت کرنا تھا۔ شودر مال و دولت نہیں جمع کر سکتا تھا کیونکہ اس طرح وہ برہمن کو دکھ دیتا تھا۔ [صـ۴۳]

دھرم شاستروں میں ہر ذات کے علیحدہ علیحدہ حقوق اور ایک ہی جرم میں ان کے لئے مختلف سزائیں مقرر کی گئی ہیں مثلاً ایک کشتری کو قتل کرنے کا جرمانہ اس جرمانہ کا چوتھائی ہے جو برہمن کے قتل کا ہے۔ اسی طرح ویش کے قتل کا جرمانہ اس کا آٹھواں حصہ ہے اور اگر شودر نیکو کار ہے تو اس کے قتل کا جرمانہ سولھواں حصہ ہے اور اگر شودر نیکو کار نہیں ہے اور قاتل دوج ہے تو قاتل کو سزا نہیں دی جائے گی۔ [صـ۴۴]

"برہمن کو سنگین سے سنگین جرم میں بھی قتل کی سزا نہیں دی جا سکتی کیونکہ اس کے قتل سے زیادہ سنگین کوئی گناہ نہیں ہے"۔ (منوشاستر)

"اگر شودر کسی شودر کو قتل کر دے تو دس گائے برہمن کو دے کر کفارہ ادا کرے۔ اگر ویش کو قتل کر دے تو سو گائے اور اگر کشتری کو تو ہزار گائے برہمن کو دے کر کفارہ ادا کرے اور اگر وہ برہمن کو قتل کرتا ہے تو اسے ہلاک کر دیا جائے گا"۔ (منوشاستر)

"اگر کوئی شودر کسی دوج کے ساتھ ایک ہی جگہ بیٹھنا چاہے تو بادشاہ کو چاہئے کہ اس کے سرین کو دغوا دے اور اسے ملک بدر کر دے"۔ (منوشاستر، باب ہشتم ۲۸۱)

"اگر شودر کسی دوج کی جاتی کا نام بے حرمتی سے لے تو ایک لوہے کی کیل دس انگل لمبی آگ میں سرخ کر کے اس کے منھ میں ڈالی جائے گی"۔ (منوشاستر باب ہشتم ۲۷۱)

اسی ذات پات کی سختی کی وجہ سے عورتوں کی آزادی بھی اس دور میں بالکل سلب کر لی گئی کیونکہ عورت کی بے احتیاطی سے ان اصولوں میں فرق آنے کا احتمال تھا۔ اس برہمنی دور میں عورت کا وہ درجہ نہیں رہا جو ویدی زمانہ میں تھا منو کے قانون میں عورت ہمیشہ کمزور اور بے وفا سمجھی گئی اور اس کا ذکر ہمیشہ حقارت کے ساتھ آیا ہے۔ شوہر مر جاتا تو عورت گویا جیتے جی مر جاتی، نہ وہ دوسری شادی کر سکتی اور نہ ہی اپنی سابقہ حیثیت کو برقرار رکھ پاتی۔ شوہر کے مرتے ہی اس کی حیثیت سسرال کی لونڈی اور

خادمہ کی سی ہو جاتی جو زندگی کی تمام سہولتوں اور آسائشوں سے یک لخت محروم کر دی جاتی یہی وجہ ہے کہ اس دور کی عورت زندگی پر موت کو ترجیح دینے پر مجبور ہو گئی۔ بیواؤں کو اپنے شوہروں کی لاش کے ساتھ جلانے کا ذکر منوشاستر میں نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم ہندوستان میں عام ہو چلی تھی کیونکہ یونانی مورخین نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔[۳۵]

جہاں شوہر کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی بیویوں کو خوش رکھیں' ان کی عزت کریں' اور انہیں گہنوں سے سنواریں[۳۶] وہیں عورت کو ہر حال میں شوہر کی وفاداری کی تلقین اور دوسری صورت میں شدید سزا کی خوشخبری دی گئی ہے۔

"اگرچہ شوہر بدچلن اور اوصاف حمیدہ سے خالی ہو اور عیاش بھی ہو تاہم زوجہ کو چاہئے کہ دیوتا کی طرح اس کی پرستش کرے۔ جو زوجہ شوہر کے فرائض کو پورا نہ کرے وہ مرنے کے بعد رسوا ہوگی اور گیدڑ کے پیٹ میں جنم لے گی۔ اس گناہ کے پاداش میں وہ انواع و اقسام کے امراض میں مبتلا ہوگی"۔ (منوشاستر باب پنجم ۱۵۴۔ ۱۶۴)

اسی سبب سے منوشاستر میں سب سے بڑا جرم زنا کو قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس سے ذات پات کے نظام کے بگڑنے کا خطرہ ہوتا تھا۔

عہد مذکور میں بدھ مت ہندوستان میں پیدا ہو چکا تھا لیکن اس نے ابھی قوت نہیں پکڑی تھی۔ ہندو مت جدید فلسفیانہ مباحث کی وجہ سے انتہائی ناقابل فہم ہو چکا تھا۔ مذہب روحانیت سے خالی تھا۔ ظاہری اعمال یعنی چڑھاوؤں وغیرہ پر اس قدر زور دیا جانے لگا تھا کہ مذہب کی اس شدید سختی نے انسان کو جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ معمولی سے معمولی غلطی کا بھاری کفارہ اور اس کفارے کی ادائیگی کے لئے علیحدہ علیحدہ منتر' چڑھاوے' رسوم اور قربانیوں نے ہندوؤں کو شدید گرانبار کیا ہوا تھا ایسے میں گوتم بدھ نے نجات دہندہ کا کام کیا۔

بدھ تہذیب :- (۳۲۰ق۔م تا ۵۰۰ء)

چھٹی صدی قبل مسیح میں ہندوستان میں ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے جن کا تذکرہ

اوپر بیان کیا گیا جو نئی مذہبی یا اصلاحی تحریکات کا باعث بنے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے حوالے سے بدھ مت اور جین مت جیسی اصلاحی تحریکات قابل ذکر ہیں (یہی وہ زمانہ ہے جب ایران میں زرتشت اور چین میں کنفیوشس کا ظہور ہوا)

موجودہ نیپال کی (جنوبی) سرحد پر بنارس سے تقریباً سو میل شمال مشرق میں ہمالیہ کی ترائی میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس کا صدر مقام کپیلا دستو (Kapilavastu) تھا جہاں آریاؤں کا ایک قبیلہ شاکیہ جو نسلاً کشتری تھے عرصہ سے آباد تھا' اس ریاست کے راجہ شدودھن (Suddhodana) کے یہاں اس کی پہلی بیوی مایا (مہامایا) سے اس کا اکلوتا بیٹا سدھارتھ پیدا ہوا جو اپنے خاندانی نام "گوتم" سے مشہور ہوا۔ اس کا سنہ پیدائش اختلافی ہے ۵۵۷ تا ۵۶۰ ق۔م میں کسی وقت اس کی پیدائش اور ۴۷۷ ق۔م سے ۴۸۰ ق۔م کے درمیان کسی وقت اس کی وفات ہوئی[ص ۳۷] اور ہندو رسم و رواج کے مطابق ان کی لاش نذر آتش کر دی گئی۔

اس زمانے کے رسوم و رواج کے مطابق انہوں نے علوم و فنون حاصل کئے کمسنی میں ہی ان کی شادی ایک حسین شہزادی یشودھر (Wasodhara) سے کردی گئی شادی کے دس سال بعد ان کا بیٹا راہل (Rahula) پیدا ہوا۔[ص ۳۸]

بدھوں کی مذہبی روایات کے مطابق جب گوتم کی عمر تیس برس ہوئی تو ان میں ذہنی تبدیلی رونما ہوئی جس نے بالآخر گوتم کو مجبور کیا کہ وہ مکتی کے حصول کے لئے دنیا کو ترک کردیں۔ اس عہد میں دراصل سارا ہندو فلسفہ ایک ہی گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا تھا کہ "مکتی" کس طرح حاصل کی جائے۔ بعض ہندو مذہبی رہنماؤں نے مکتی کے حصول کے لئے منتروں اور قربانیوں پر اور بعض نے تپیا اور ریاضت کے ذریعہ نفس کشی پر زور دیا جس سے مکتی تو حاصل نہ ہوئی البتہ ہندوستان میں ترک دنیا اور تعذیب نفس کے رجحانات عام ہو گئے۔

ان حالات میں گوتم نے ایک رات خاموشی سے اپنی سلطنت اور گھر چھوڑ کر ریاست مگدھ کے دارالسلطنت' راج گڑھی' جس کے اردگرد دور دور تک جنگلات اور پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا' کو اپنے لئے منتخب کیا اور ریاضت اور نفس

کشی شروع کر دی۔

اس وقت ترک دنیا کوئی انوکھی بات نہیں تھی بلکہ یہ ویدی فلسفہ کا ایک اہم جزو تھا مگر عین عنفوان شباب میں زندگی کی راحتوں اور محل کے آسائشوں کو خیرباد کہہ دینا' اپنی چھوٹی مگر مضبوط سلطنت' وفا شعار و خوبصورت بیوی اور کم سن بچے کو چھوڑ کر گدائی اختیار کرنا تاکہ بنی نوع انسان کے دکھوں کا خاتمہ کرے' ایک ایسی بات تھی جس نے گوتم کو ممتاز کیا اور اس کے مذہب کو الہامی مذاہب کے بعد سب سے بڑے مذہب ہونے کا اعزاز عطا کیا۔

تقریباً چھ سال تک وہ جوگیوں کے طرز پر سخت ترین مجاہدات میں مشغول رہے' لیکن بعد ازاں اسے لا حاصل سمجھ کر بدھ گیا کے غیر آباد علاقہ میں ایک بڑ کے درخت کے نیچے مراقبہ میں بیٹھ گئے۔ یہیں سے انہوں نے پینتیس چھتیس برس کی عمر میں "حق" کو پالیا۔ حصول حق کے بعد اپنی زندگی کے بقیہ پینتالیس سال انہوں نے بدھ مت کے پرچار میں گذارے اور اس سلسلہ میں انہوں نے مسلسل و متعدد سفر کئے۔ "سنگھ" کے قیام کے ذریعہ اس مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا کام ان کے بعد بھی وسیع پیمانے پر جاری رہا۔

گوتم کسی نئے مذہب کے بانی نہیں تھے بلکہ یہ ایک اصلاحی کوشش تھی' جس کی ملک کو اس وقت ضرورت تھی اور یہ ملک اس کو قبول کرنے پر آمادہ بھی تھا۔ انہوں نے ہندو مت کی اصلاح کا کام کیا اس سے یک سر انحراف نہیں کیا لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے بیشتر ہندووانہ عقائد ہی اختیار کئے مثلاً تناسخ' کرم' اواگون' مکتی (جسے وہ نروان کہتے ہیں) وغیرہ۔ انہوں نے ذات پات پر مبنی سماجی تقسیم کے خلاف بھی آواز بلند نہیں کی بلکہ مختلف ذاتوں کے درمیان اخوت کی ہدایت کی وہ برہمنوں کے تفوق کے قائل نہیں تھے۔ ان کی نظر میں تمام انسان برابر تھے۔ وہ پیچیدہ رسوم' قربانی اور بت پرستی کے بھی مخالف تھے انہوں نے خدا' کائنات اور روح جیسے اہم مسائل پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ جب ان سے خدا کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ اگر خدا اور دیوتا ہیں بھی تو وہ کرم کے قانون سے بالاتر

نہیں، ویدوں کے الہامی یا غیر الہامی ہونے کے متعلق بھی انہوں نے وضاحت سے کچھ نہیں کہا۔

گوتم کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر برائی کی جڑ خواہش نفسانی ہے اور خواہش نفسانی کی جڑ مایا ہے، یعنی نام و نشان، حکومت و دولت، عزت لذائذ روحانی و جسمانی، جوانی حسن عشق یہ سب مایا اور دھوکا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک چیز ہر وقت بدلتی رہتی ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی لہٰذا یہ سب دھوکا (مایا) ہے۔ انسان کی نجات کا دارومدار نفسانی خواہشات کی فنا میں ہے۔ اسی صورت سے انسان نروان (مکتی) حاصل کر سکتا ہے۔ جس کے بعد تناسخ کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے ص ۳۹۔ مکتی کا حصول اس عہد کا سب سے اہم مسئلہ تھا جس کے حصول کے لئے گوتم بدھ نے ہندوؤں کی طرح قربانیوں، منتروں، چڑھاؤں یا ریاضت و تپسیا پر زور دینے کے بجائے نیک اعتقاد، نیک نیت، نیک قول، نیک فعل، نیک زندگی، نیک کوشش، نیک خیال اور نیک مراقبہ (کامل مراقبہ) کا درس دیا۔ ص ۴۰ مکتی کے حصول کا یہ زیادہ آسان، روشن، قابل فہم اور ہر طبقے کے نزدیک قابل قبول حل تھا لہٰذا یہ مذہب تیزی سے قبول عام حاصل کرنے لگا اور ہندوستان کے علاوہ رفتہ رفتہ چین، جاپان، برما، سیام اور مشرقی جزائر میں پھیل گیا۔ بدھ مت کی اشاعت میں اس کی سادگی کے علاوہ گوتم کی ذاتی شخصیت اور سنگھ کی تبلیغی کوششوں کے علاوہ یہ سیاسی سبب بھی شامل تھا کہ اسے راجہ اشوک (۲۷۳ق۔م تا ۲۳۶ق۔م) اور راجہ کنشک (۱۲۰ء تا ۱۶۲ء) جیسے بادشاہوں کی سرپرستی حاصل ہوئی جنہوں نے دور دراز ملکوں میں اپنے مبلغین بھیجے، ہندوستان میں اشوک نے کافی تعداد میں وہاریں اور خانقاہیں تعمیر کرائیں جو بدھ علوم کے مراکز تھے اور جہاں ہزاروں بھکشو رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اشوک نے بدھ تعلیمات کو کتبات کی صورت میں ستونوں اور چٹانوں پر کندہ کرایا جس سے اس مذہب کو قبولیت عام حاصل ہوئی اور یہ مذہب ملک سے باہر بھی پھیلا۔

اس نئے مذہب کا معاشرتی اور اخلاقی اثر یہ ہوا کہ جرائم کی سزائیں خفیف

ہو گئیں۔ مالگزاری اور محصولات کم کردیئے گئے' مختلف فرقوں میں میل جول بہت بڑھ گیا جو کہ برہمنی زمانے میں ہرگز ممکن نہ تھا اگرچہ ذاتیں موجود رہیں لیکن ان میں رواداری اور مہربانی کا عنصر نظر آنے لگا' مذہبی تعلیم پر صرف برہمنوں کی اجارہ داری ختم ہوگی اور تعلیم بلا تفریق ذات ہر شخص کے لئے حاصل کرنا ممکن ہوگیا۔ ملک میں ہر طرف شفا خانے بن گئے صرف انسانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ حیوانوں کے لئے بھی علیحدہ شفا خانے تعمیر کئے گئے۔[41]

ایک ہزار سال تک ہندوستان میں باقاعدہ رائج رہنے کے بعد بدھ مت کا زوال شروع ہوگیا اور ساتویں یا آٹھویں صدی عیسوی میں یہ مذہب ہندوستان سے بالکل مٹ گیا اس کا سبب یہ تھا کہ بدھ مت بتدریج اسی برہمنی مذہب میں ضم ہوگیا جس سے وہ نکلا تھا۔[42] رفتہ رفتہ بدھ مت اپنی سادگی اور انفرادیت کھونے لگا' اور برہمن اوتاروں اور دیوتاؤں کو اختیار کرکے اپنی علیحدہ ہستی کو گم کردیا۔ گوتم بت پرستی کا قائل نہیں تھا بعد میں صورت یہ ہوئی کہ گوتم بدھ کے مجسمے بت اور تشبیہیں بننے لگیں' یہ مجسمے اور بت زیادہ تر بدھ مت کے دور عروج میں تیار ہوئے' اور بدھ جہاں جہاں اور جس جس ملک میں گئے یہ بت اور مجسمے ان کے ساتھ گئے۔

سنگھوں کی فضا بھی بدلنے لگی اور نئی نئی بدعتیں اور جدتیں نظر آنے لگیں۔[43] برھمنیت نے بدھ کو اوتار بنادیا' سنگھ بہت دولت مند ہوگئے اور ایک خاص جماعت کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے اور ان میں ضبط و قاعدہ بالکل نہیں رہا۔ عبادت کے طریقوں میں سحر و اوہام داخل ہوگئے[44] ان تمام اسباب کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ گپت خاندان (چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی) نے ہندومت کی سرپرستی کی اور یوں ہندوستان سے بدھ تہذیب کا خاتمہ ہوگیا۔ گو کہ اس کے دور رس اثرات دیر تک یہاں کے مقامی لوگوں میں باقی رہے۔

جین مت :۔

اسی عہد میں بدھ مت کے پہلو بہ پہلو ایک اور اصلاحی تحریک نظر آتی ہے۔ یہ

جین مت ہے جسے چھٹی صدی قبل مسیح میں ہندوستان میں فروغ حاصل ہوا۔ جین مت کو دعوی ہے کہ یہ ایک مستقل مذہب ہے جو نہ بدھ مت سے تعلق رکھتا ہے اور نہ برہمن مذہب سے اگرچہ سچی بات یہ ہے کہ یہ انہی دونوں سے نکلا ہے۔ جین مت کا فلسفہ اور روایات بالکل وہی ہیں جو بدھ مت کی ہیں جس سے کہ یہ بہت ہی قدیم زمانے میں الگ ہو کر ایک مستقل مذہب بن گیا اور اس کا قیام ہندوستان میں محض اس وجہ سے رہ گیا کہ اس نے برہمنی مذہب کی بہت سی باتیں اختیار کر لیں۔[۳۵]

اس مذہب یا تحریک میں ایک نئی زندگی یا نئی روح پھونکنے والے کا نام نتاپت[۳۶] (Nataputta) تھا جسے اس کے پیروکاروں نے مہاویر وردھمان کے نام سے یاد رکھا گوتم کی طرح وردھمان بھی کشتری خاندان سے تھے ان کے والد سدھارتھ سردار قبیلہ تھے ان کا قبیلہ وسیالی کے ایک گاؤں کنڈاپور (Kandapura) میں آباد تھا۔ گوتم ہی کی طرح یہ بھی پر آسائش زندگی گذارتے رہے اور اٹھائیس سال کی عمر میں ویراگی بن گئے پہلے وہ سادھوؤں کی ایک جماعت نیرگرنتھ کے طور طریقے پر عمل کرتے جس کی بنیاد تقریباً ۷۷۶ ق۔م میں پرسو (Parsva) نامی ایک سادھو نے رکھی تھی (بعد میں پرسو کو جین مت کا تیئیسواں پیغمبر یا جن مان لیا گیا) وہ تقریباً بارہ سال تک سخت مجاہدہ و ریاضت میں مصروف رہے اور بالآخر چالیس سال کی عمر میں ان کو گیان حاصل ہوا اور وہ مہاویر (بہادر) جین (فاتح عالم) اور نیرگرنتھ (قیدوبند سے آزاد) کہلائے۔ گیان حاصل کرنے کے بعد انہوں نے زندگی کے باقی تیس سال اسی مذہب کی تبلیغ میں گزارے اور ۵۲۷ ق۔م میں مسلسل فاقہ کشی کی وجہ سے وفات پائی۔

مہاویر وردھمان کو ماننے والے جین کہلائے۔ یہ وردھمان سے قبل تیئس پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں ان میں سے آخری پرسو تھا جس نے حقیقی معنوں میں جین فرقے کی بنیاد رکھی اور چوبیسواں وردھمان تھا جس نے اس میں نئی روح پھونکی اور اس کی اصلاح کی[۳۷] مہاویر نے بھی بدھ مت کی طرح ایک منظم جماعت کی تشکیل کی جس کی تبلیغی کوشش جاری رہیں۔ چندر گپت موریہ (۳۲۵ء تا ۳۱۲ء) اور چند دوسرے

والیان ریاست اس کے سرپرست رہے لہٰذا یہ مذہب بھی ہندوستان میں تیزی سے پھیلا۔ آج کل جینیوں کی آبادی تیرہ لاکھ کے قریب ہے جو زیادہ تر صوبجات متوسط، بمبئی اور راجپوتانے میں آباد ہیں۔

جہاں تک ان کی تعلیمات کا تعلق ہے وہ بدھ مت سے مماثل ہیں۔ جین بھی عالم کی قدامت کے قائل اور خالق کے وجود سے منکر ہیں۔ گوتم کی طرح مہاویر بھی سماجی مساوات کا قائل تھا جین مذہب کی کتابیں بھی علیحدہ ہیں اور یہ بھی بدھ مت کی طرح ویدوں کو نہیں مانتے۔ آواگون اور کرم کے اصولوں کو مہاویر نے بھی تسلیم کیا البتہ تپسیا اور ریاضت کے معاملے میں اس نے گوتم سے اختلاف کیا وہ ترک دنیا اور ریاضت کا بہت قائل تھا یہاں تک مسلسل فاقوں کی وجہ سے جان کو مار دینا اس کے نزدیک زندگی کا بہترین انجام تھا۔

مہاویر نے بھی مکتی یا نروان کو جسے وہ "موکش" کہتا ہے۔ انسانی جدوجہد کا مقصد اعلیٰ قرار دیا۔ موکش کے حصول کے لئے اس نے گوتم کی طرح صحیح عقیدہ (یعنی تمام پیغمبروں پر ایمان لانا) صحیح علم اور صحیح عمل کی تعلیم دی۔ صحیح عمل سے مراد یہ ہے کہ انسان پانچ باتوں کے لئے حلف اٹھائے۔

۱ - کسی جانور کو تکلیف نہیں پہنچائے گا۔
۲ - چوری نہیں کرے گا۔
۳ - جھوٹ نہیں بولے گا۔
۴ - ملکیت نہیں رکھے گا۔
۵ - بدفعلی نہیں کرے گا۔ صفحہ ۴۸

مہاویر کا خیال تھا کہ ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب دنیا کو بالکل ترک کر دیا جائے اس کے نزدیک برہنہ رہنا اور فاقہ کشی کرتے کرتے مرجانا سب سے بہتر انجام تھا۔

مہاویر نے اہنسا کے اصول پر شدت سے زور دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مذہب کے ماننے والے جوں، مچھر، کھٹمل اور زہریلے کیڑوں کو بھی ہلاک نہیں کرتے بلکہ اس

پلنگ پر جس میں بہت سے کھٹمل ہوں کسی تندرست آدمی کو پیسے دے کر سلاتے ہیں تاکہ کھٹملوں کو غذا مل سکے اور انہیں ثواب حاصل ہو وہ غروب آفتاب سے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں تاکہ تاریکی میں کوئی کیڑا ان کے کھانے میں نہ آجائے۔ اسی طرح شمع روشن کرنا بھی ان کے نزدیک مناسب نہیں کیونکہ یہ پروانوں کی ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔ جب وہ چلتے ہیں تو پیر بہت آہستہ زمین پر رکھتے ہیں تاکہ کوئی کیڑا پیر کے نیچے آکر ہلاک نہ ہو جائے [صـ۴۹]

مہاویر کی موت کے بعد ان کے پیرو دو بڑے فرقوں میں تقسیم ہو گئے جن میں بنیادی اصولوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے [صـ۵۰] دیگمبر (Digambara) اور سویتامبر (Svetambara) ان میں اول الذکر مہاویر کی پیروی میں برہنہ رہنا ضروری سمجھتے ہیں جب کہ آخرالذکر سفید کپڑا پہننے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں فرقوں میں زیادہ بنیادی اختلاف نہیں ہے دونوں چوبیس پیغمبروں کو دیوتا کی طرح پوجتے ہیں اور عام زندگی مثلاً شادی' بیاہ' پیدائش و موت وغیرہ میں ہندووانہ رسم و رواج کی پیروی کرتے ہیں۔

پرانک تہذیب : - (۵۰۰ء تا ۱۰۰۰ء)

بدھ مت ہندوستان کے لئے روشنی کی ایک کرن ثابت ہوا۔ اس میں اور برہمنی مذہب میں پہلا بڑا فرق اخلاق رواداری اور نیکی کا ہے اور دوسرا فرق یہ ہے کہ بدھ مت میں انسان کا درجہ اتنا بڑا رکھا گیا ہے جو کسی دوسرے مذہب میں نہیں [صـ۵۱] اس مذہب کا عروج ہندو مت کی خرابیوں کی وجہ سے ہوا تھا لہٰذا ہندو علماء نے مذہبی اصلاح کا کام شروع کر دیا۔ گپت عہد (۳۲۰ء تا ۳۶۸ء) ہندو مت کی نشاۃ الثانیہ کا عہد ثابت ہوا۔ شنکر اچاریہ جیسے مفکرین نے مذہب کو مزید خرابیوں سے بچایا دوسری طرف بدھ مت متعدد وجوہات کی بنا پر جن کی نشاندہی اسی باب میں کی جا چکی ہے۔ ہندوستان سے مٹ گیا اور دوبارہ جس تہذیب کو فروغ ملا وہ وہی سابقہ برہمنی تہذیب تھی اور اس تہذیب کی تاریخ نے دوبارہ اپنے آپ کو دہرانا شروع کر دیا۔ لہٰذا ہم اس لا حاصل تکرار سے

صرف نظر کرتے ہوئے چھٹی صدی عیسوی میں جب کہ رسول اللہ کا ظہور ہوا' ہندوستان کی ایک عمومی حالت کا جائزہ پیش کریں گے۔

ہندوستانی تہذیب اور چھٹی صدی عیسوی :-

ہندوستان کے مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ہندوستان میں چھٹی صدی عیسوی سے جو زمانہ شروع ہوتا ہے وہ مذہبی' اجتماعی اور اخلاقی لحاظ سے اس ملک کی تاریخ کا پست ترین دور تھا۔ بت پرستی پورے عروج پر تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان معلوم زمانے سے ہی شرک کا گہوارہ رہا ہے اور مظاہر پرستی بالا خربت پرستی میں بدل گئی لیکن وید میں دیوتاؤں کی تعداد ۳۳ تھی' اس صدی میں بڑھ کر ۳۳ کروڑ ہوگئی[۵۲] خواہ ویدی زمانہ ہو خواہ موجودہ زمانہ ہندو کے نزدیک ہر وہ چیز خدا ہے جو اس کی سمجھ میں نہ آئے یا جس سے وہ مقابلہ نہ کرسکے۔ اگرچہ مختلف زمانوں میں مختلف ہندو مصلحین نے ہندومت میں توحید کو ثابت کرنا چاہا لیکن برہمنوں اور فلسفیوں کی وہ تمام کوششیں رائیگاں گئیں جو انہوں نے توحید قائم کرنے کے لئے یا کم از کم خداؤں کی تعداد گھٹا کر تین تک کرنے کے لئے کیں۔[۵۳]

چنانچہ چھٹی' ساتویں صدی عیسوی میں بت سازی کے فن نے بھی نمایاں ترقی کی سارے ملک میں بت پرستی کا دور دورہ تھا حتی کہ بدھ مت اور جین مت کو بھی اس مذاق عام کا ساتھ دینا پڑا اور اپنی مقبولیت کو قائم رکھنے اور اپنی زندگی کی بقا کے لئے اسی روش کو اختیار کرنا پڑا۔

اس بت پرستی کے ساتھ ساتھ جس چیز نے ہندوستان کو اخلاقی انحطاط میں مبتلا کیا وہ جنسی بحران تھا۔ شہوانی جذبات اور جنسی میلان کو ابھارنے والے عناصر مذہبی صورت میں جس قدر ہندوستان کی تہذیب میں ہیں غالباً کسی دوسری تہذیب میں نہیں۔ ہندوؤں کی اخلاقی گراوٹ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں دیویوں اور دیوتاؤں کے باہمی اختلاط کی حکایتیں مذہبی طور پر سنی اور سنائی جاتی تھیں۔ ان کے مندروں میں قابل پرستش چیزوں میں سب سے ممتاز و مقدم لنگم اور یونی ہیں۔

جن سے مراد مادہ خلقت کے دونوں جزو ہیں۔ اشوک کے ستونوں کو بھی عام ہندو لنگم خیال کرتے ہیں (لنگم شیو کے آلہ تناسل کا نام ہے) اور راسطوانہ اور مخروطی شکلیں ان کے نزدیک واجب التعظیم ہیں۔

بعض مورخین کا بیان ہے کہ ایک مذہبی فرقہ کے مرد برہنہ عورتوں کی اور عورتیں برہنہ مردوں کی پوجا کرتے تھے[54] مندروں کے محافظ و منتظم بد اخلاقی کا سرچشمہ تھے اور بہت سی عبادت گاہیں اخلاقی جرائم کا مرکز تھیں۔ محلات و درباروں میں بے تکلف شراب کا دور چلتا اور سرمستی میں اخلاقی حدود کا خیال نہ کیا جاتا۔ اس تن پروری اور نفس پرستی کے بالکل متوازی نفس کشی' ریاضت' مجاز (یوگ و تپسیا) کا سلسلہ بھی جاری تھا جس میں حد درجہ غلو اور انتہا پسندی سے کام لیا جاتا۔

اس پر مستزاد طبقہ واریت تھی۔ کسی قوم کی تہذیب میں اس قدر بین ذات پات کی تقسیم اور پیشوں اور زندگی کے مشاغل کی ایسی انمٹ اٹل اور قانونی تقسیم دیکھنے میں نہیں آتی جیسی ہندوستان کے قانون میں ہے اور اسی وجہ سے ہندوستانی معاشرہ میں "قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں" کے زرین اصول کو تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔ قانون کے اندر عدم مساوات کی ایسی واضح مثال شائد کسی دوسری قوم میں نہیں ملتی۔

ہندوستانی معاشرے میں عورتوں کی حالت بھی ابتر تھی دراوڑی تہذیب یا ابتدائی آریائی تہذیب میں اسے جو حیثیت حاصل تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ ستی جیسی انسانیت سوز رسم ہمیں کسی دوسرے معاشرے میں نظر نہیں آتی۔

علم و ادب کے اعتبار سے بھی ہندوستان جمود کا شکار تھا۔ گپت عہد (چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی) ہندوؤں کے علم و ادب کی ترقی کا زریں دور کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اس میں ایسا جمود پیدا ہوا جو صدیوں جاری رہا اور راجپوت دور (جو ساتویں صدی عیسوی کے وسط سے بارہویں صدی عیسوی کے اختتام تک رہا) نہ صرف سیاسی انتشار کا زمانہ تھا بلکہ اس میں ہندوؤں کا علم و ادب بھی تنزل کا شکار ہو چکا تھا۔ تمام قدیم علوم سنسکرت میں تھے جو اس وقت تک مردہ ہو چکی تھی۔ بدھ مت کے دور عروج میں علم و ادب مقامی زبانوں میں منتقل ہو گیا تھا اس لئے اس کا خوب چرچا ہوا اور بودھ

وہاں یں اشاعت علوم و تعلیم و تدریس کا مرکز بن گئیں۔ مگر ہندو مت کے دوبارہ اقتدار کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ ہندوؤں کے یہاں تحصیل علم کا حق قانوناً صرف برہمنوں کے پاس تھا ان حالات میں علم کا زوال ہونا ہی تھا۔ گو کہ ہندوؤں نے ریاضی، ہیئت و نجوم میں کافی ترقی کر لی تھی۔ وہ سورج گرہن اور چاند گرہن کی تاریخ اور اوقات کا صحیح تعین کر سکتے تھے۔ انہیں زمین گول ہونے کا بھی علم تھا اور کشش ثقل بھی دریافت کر چکے تھے مگر برہمن عوام کو عموماً اندھیرے میں رکھتے۔ جب چاند یا سورج گرہن کا موقع آتا تو اس کا سائنسی اور علمی سبب بتانے کے بجائے وہ اوہام پر مبنی کہانیاں بیان کرتے اور چاند اور سورج دیوتا کو گرفت سے نجات دلانے کے لئے کئی قسم کی لایعنی اور پیچیدہ و پراسرار رسومات ادا کرتے۔ دراصل برہمن کے اقتدار کی بنیاد ہی عوام کی جہالت پر استوار کی گئی تھی۔

غرض کہ ہندوستان اس وقت کی دنیا میں جہالت و توہم پرستی پست درجہ کی بت پرستی، نفسانی خواہشات اور طبقہ واری ناانصافی میں پیش پیش تھا اور دنیا کی اخلاقی و روحانی رہبری کے بجائے خود اندرونی انتشار اور اخلاقی بد نظمی میں مبتلا تھا۔ بدھ مت کے پاس بھی دنیا کے لئے کوئی پیغام نہیں تھا جس کی روشنی میں وہ اپنے مسائل کا صحیح حل تلاش کر سکتی۔

حواشی و حوالہ جات

۱ ۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ جلد ۵ ص ۳۷۱ (مضمون پاکستان)

۲ ۔ نہرو، جواہر لعل، ڈسکوری آف انڈیا، بمبئی ۱۹۶۴ء ص ۷۴

۳ ۔ صدیقی، محمد ادریس، وادی سندھ کی تہذیب، محکمہ آثار قدیمہ کراچی ۱۹۵۹ء ص ۲۳۷

۴ ۔ ایضاً ص ۲۳۳

۵ ۔ ڈسکوری آف انڈیا ص ۷۲

۶ ۔ دراصل باقیاتی تفتیش جیسے جیسے آگے بڑھ رہی ہے وادی سندھ کا تہذیبی دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے موجودہ پاکستان کے قریب قریب سارے علاقے میں موئن جو داڑو اور ہڑپا کی طرز کی

ہزاروں بستیاں آباد رہی ہوں گی ان میں باقیاتی تفتیش کے اعتبار سے موہن جو داڑو، ہڑپا، چنہوداڑو، ستکاجن دور، علی مراد، آمری، رابر کوٹ اور کوٹ ڈیجی بہت اہم ہیں۔ (وادی سندھ کی تہذیب ص۲۹)

۷ - دائرہ معارف اسلامیہ، جلد پنجم ص۳۷۲

۸ - ڈسکوری آف انڈیا ص۷۳

۹ - وادی سندھ کی تہذیب ص۱۶۹

۱۰ - ڈسکوری آف انڈیا ص۷۲

۱۱ - دائرہ معارف اسلامیہ، جلد پنجم ص۳۷۲

۱۲ - گستاولیبان، تمدن ہند، مترجم سید علی بلگرامی، مقبول اکیڈمی، لاہور ص۳۴۶

۱۳ - ایضاً ص۲۴۷

۱۴ - ایضاً ص۲۴۵

۱۵ - امیر علی، سید، روح اسلام، ص۱۱

۱۶ - عین الحق، قدیم مشرق، جلد۲ ص۲۷۲

۱۷ - تمدن ہند ص۲۶۴

۱۸ - دائرہ معارف اسلامیہ، جلد پنجم ص۳۷۲

۱۹ - قدیم مشرق ص۲۸۴

۲۰ - قدیم مشرق ص۲۷۴

۲۱ - ایضاً ص۲۶۷

۲۲ - تمدن ہند ص۳۷۳

۲۳ - ایضاً

۲۴ - ایضاً

۲۵ - قدیم مشرق ص۲۶۷

۲۶ - روح اسلام ص۱۱

۲۷ - تمدن ہند ص۲۶۴

۲۸ - قدیم مشرق ص ۳۴۷
۲۹ - قدیم مشرق ص ۳۴۹
۳۰ - تمدن ہند (بحوالہ منوشاستر)
۳۱ - ایضاً (بحوالہ منوشاستر' باب ہشتم ۳۱۷)
۳۲ - ایضاً
۳۳ - قدیم مشرق (بحوالہ منوشاستر باب دہم ۱۲۹)
۳۴ - قدیم مشرق ص ۳۵۰ (بحوالہ منوشاستر)
۳۵ - تمدن ہند ص ۲۸۹
۳۶ - ایضاً (بحوالہ منوشاستر باب سوئم ۵۵' ۵۶' ۶۰)
۳۷ - Harmsworth history of the world جلد ۴ ص ۱۱۸۶' لندن ۱۹۱۴ء
۳۸ - ایضاً
۳۹ - تمدن ہند ص ۳۰۹ (بحوالہ للت وستر باب ۲۶)
۴۰ - ایضاً
۴۱ - تمدن ہند ص ۳۳۴
۴۲ - ایضاً ص ۳۱۹
۴۳ - ایشورا ٹوپا' ہندوستانی تمدن
۴۴ - ڈسکوری آف انڈیا ص ۱۸۶
۴۵ - تمدن ہند ص ۴۹۹
۴۶ - Harmsworth History of the World جلد ۴ ص ۱۱۹۸
۴۷ - ایضاً
۴۸ - Harmsworth History of the World جلد ۴ ص ۱۱۹۹
۴۹ - قدیم مشرق ص ۳۲۰
۵۰ - Harmsowrth History of the World جلد ۴ ص ۱۱۹۹
۵۱ - تمدن ہند ص ۳۱۰

۵۲ - ندوی، ابوالحسن علی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، کراچی ۱۹۷۶ء ص ۵۸

۵۳ - تمدن ہند ص ۴۳۱ - ۴۴۰

۵۴ - دیانند سرسوتی، ستیارتھ پرکاش، ص ۳۴۴

باب پنجم

ایرانی تہذیب

ایران کا قدیم نام "پرسس" (Persis) یا "پرشیا" (Persia) تھا۔[1] یونانی اسے پارس اور عرب فارس کہتے تھے۔ ایک ہزار سال قبل مسیح کے بعد سے جب کہ یہاں آریاؤں کا ورود ہوا، اسے ایران کہا جانے لگا۔ لفظ ایران آریانہ (Aryana) سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے "آریاؤں کی سرزمین"[2]

ایرانی سلطنت کی سرحدیں مختلف زمانوں میں مختلف رہیں گویا بادشاہتوں کے ساتھ ساتھ ایران کی حدود بھی وقتاً فوقتاً بدلتی رہیں۔ جہاں تک قدیم ایران کی تاریخ کا معاملہ ہے تو بیسویں صدی کے اوائل میں سوسا[3] (سوس) کی کھدائی سے چند انکشافات سامنے آئے ہیں جن کی روشنی میں ماہرین علم الآثار نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ چار ہزار سال قبل مسیح سے بھی پہلے پرسی پالس (اصطخر) میں ایک قدیم تہذیب قائم تھی جو حجری عہد کے اواخر سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ تہذیب آریائی نہیں تھی۔ مستند شہادت کی عدم موجودگی تک ان قیاسات کو تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ لوگ یا تو خزری (Caucatian) تھے حامی یا کوشی[4] تھے اور یا پھر عیلامی[5] تھے۔ ان کی اپنی ایک قابل ذکر تہذیب تھی جو تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح میں اپنے عروج پر تھی ان کے اپنے معاصر تہذیبوں سے گہرے ثقافتی اور تجارتی روابط بھی موجود تھے۔

ازاں بعد ایک سے ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح کے درمیان آریاؤں کے دو بڑے قبائل ماد یا اماد (Medes) اور پارس (Parsa) ایران میں داخل ہوئے ان کی ایک جماعت ہندو پاکستان کی طرف آئی اور دوسری کوہ البرز اور کردستان کی پہاڑیوں

کے درمیان اس سطح مرتفع میں بس جو اس کی طرف منسوب ہو کر اریانہ یا ایران کے نام سے موسوم ہوا۔ ایرانی سطح مرتفع کے اندر آباد ہونے والے آریائی قبائل میں سے قبیلہ ماد نے شمال و مغربی حصے میں اور پارس نے جنوبی حصے میں سکونت اختیار کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک کا اول الذکر خطہ میڈیا اور آخر الذکر فارس کہلایا۔ ایک اور آریائی قبیلہ پارت تھا جس نے ایران کے شمال مشرقی حصے میں سکونت اختیار کی جس کی وجہ سے اس علاقے کو پارتیا یا پارتھیا (Parthia) کا نام ملا۔

میڈیا اور پارس کے قدیم باشندے (حامی یا کوشی یا عیلامی) ان نووارد آریاؤں کے ہاتھوں یا تو مارے گئے یا ترک وطن کر گئے اور یا آریاؤں نے ان کو اپنا محکوم بنالیا۔ آل ماد میں دیوکس (Diokes) وہ پہلا شخص ہے جس نے میڈیا میں آزاد ایرانی سلطنت کی بنیاد رکھی اس نے ۷۰۹ ق ۔ م سے ۶۵۶ ق ۔ م تک حکومت کی۔ ہمدان کو اپنا دارالسلطنت بنایا (جو اس وقت اماوان کہلاتا تھا) اور مختلف آریائی قبائل کو اتنا منظم کرلیا کہ پڑوسی آشوریوں کو جو آئے دن آریاؤں کے علاقوں پر حملے کرتے تھے مزید دست اندازی کی جرات نہ ہوئی ۶۵۶ ق۔م میں جب دیوکس کا انتقال ہوا تو آل ماد کی بادشاہت موروثی ہو گئی۔

دیوکس کے بعد اس کا بیٹا فراورتمش (Fravartish) تخت نشین ہوا اس نے پارس کو بھی اپنی مملکت میں شامل کرلیا اور تقریباً بائیس سال حکومت کرکے ۶۳۳ ق۔م میں آشوریوں سے جنگ کے دوران مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سیاکسرز (Cyaxares) تخت نشین ہوا جس نے پارتھیا پر بھی قبضہ کرلیا اور نینوا سے آشوری خاندان کا خاتمہ کردیا۔ نینوا کے زوال کے ساتھ ہی نہ صرف آشوری سیادت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی بلکہ بہت سے آشوری علاقوں کو ضم کرکے میڈیا کی ریاست بھی وسیع ہوگئی۔ نینوا کے نئے بادشاہ (جو کہ بخت نصر کا باپ تھا) کے ساتھ معاہدہ صلح کیا گیا ساتھ ہی سیاکسرز نے اپنی ایک بیٹی امتیہ (Amytics) کی شادی بخت نصر سے کردی اور دونوں ریاستوں کے مابین تعلقات بہتر ہوگئے۔ ۵۸۴ ق۔م میں جب سیاکسرز فوت ہوا تو آل ماد کی مملکت (میڈیا) دریائے پالیس تک پھیلی ہوئی تھی جو ایران کو لیڈیا

سے جدا کرتا ہے جنوب میں ان کی حدود بابل سے ملحق تھیں شمال میں آرمینیا تک پھیلی ہوئی تھی بلکہ آرمینیا مملکت آل ماد کا جزو ہی بن گیا تھا۔[9]

سیاکسرز کا بیٹا آستیاگس (Astyages) جس کا عرصہ حکومت ۵۸۴ ق۔م تا ۵۵۰ ق۔م تھا اس زبردست حکومت کو نہ سنبھال سکا جب کہ دوسری طرف جنوبی آریاؤں کا قبیلہ پارس تیزی سے طاقت پکڑ رہا تھا۔ بالآخر قبیلہ پارس کے ایک نامور شخص کوروش اعظم جسے یونانی مورخین سائرس (Cyrus) کہتے ہیں کہ ہاتھوں آل ماد کی سلطنت کا چراغ بجھ گیا۔ سائرس نے آل ماد پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد بابل کو بھی فتح کرکے اس عظیم ایرانی سلطنت کی بنیاد رکھی جسے تاریخ میں ہخامنشی سلطنت کہا جاتا ہے۔

آل ماد کی تہذیب : -

ہخامنشی دور کے حالات بیان کرنے سے قبل مناسب ہوگا آل ماد کی تہذیب و تمدن پر ایک نظر ڈال لی جائے حالانکہ اس سلسلہ میں سب سے بڑا مسئلہ تاریخی مواد کی عدم فراہمی کا ہے۔ اہل پارس کے حالات تو خود ان کی تحریروں میں کم و بیش مل ہی جاتے ہیں مگر میدیوں نے اپنا کوئی ریکارڈ نہیں چھوڑا ہے۔ تاہم مورخین نے ان کے تھوڑے بہت حالات آشوری کتبوں، یہود ملفوظات اور یونانی مورخین کی کتابوں سے جمع کئے ہیں۔ تاہم پھر بھی بعض جگہ قیاسات کا سہارا لینا پڑے گا۔

آل ماد کا اپنا تمدن تھا جسے بعد میں اہل پارس (ہخامنشیوں) نے اپنایا۔ آل ماد کے مذہب کے بارے میں تفصیلات تو نہیں ملتیں پھر بھی ایسے ذرائع موجود ہیں جن سے ان کی مذہبی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔[10] ماد (نیز پارس اور پارت) چونکہ آریائی تھے اس لئے یہ یقین کیا جاتا ہے کہ ان کا ابتدائی مذہب ایشائے کوچک میں آباد ہونے والی آریائی شاخ میتانی (Mittanians) اور ہندوستان میں آباد ہونے والی آریائی جماعتوں سے مختلف نہیں ہوگا۔ ہندی آریاؤں کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ وہ اوائل میں عناصر فطرت (مثلاً آب و آتش، خاک و باد) اور مظاہر قدرت (مثلاً آفتاب و

ماہتاب، برق و رعد) کی پرستش کرتے تھے۔ علاوہ ازیں برائیوں اور آلام کے دیوتاؤں کا بھی تصور رکھتے تھے۔ میتانیوں کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ بھی یہی ہے کہ ان کے عقائد ہندی آریوں کے عقائد سے ملتے جلتے تھے۔ ایسی صورت میں ایرانیوں کے متعلق بھی یہی رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ ان کا مذہب بھی اسی نوعیت کا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ منتشر طور پر ایسے شواہد بھی مل جاتے ہیں جن سے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے مثلاً ہندوستانی آریاؤں اور ایرانی آریاؤں کے کئی معبود مشترک تھے۔

اہورا[11] (Ahura) ایرانیوں کا سب سے بڑا معبود تھا۔ سنسکرت میں یہ لفظ اسورا (Asura) ہے جو بعد میں اسور یا ایشور بن گیا۔ آہورا یا اسورا "مالک کائنات" کے تصور کو ظاہر کرتا ہے۔ دیوا[12] (Dawa) یہ بھی قدیم آریائی دیوتا ہے۔ سنسکرت یا ویدی زبان میں یہ لفظ دیاؤ (Dyauh) ہے جس کے معنی خدائے سماوات (God of Heavens) کے ہیں۔ آخری ویدوں میں "دیاوہ" یا دیوا کو بہت ہی طاقتور مانا گیا ہے اور اسورا پر اس کی برتری ظاہر کی گئی۔ اس کے برعکس ایران میں "دیوا" کو برائیوں کا دیوتا سمجھا گیا ہے اور اہورا سے اس کو برسرپیکار بتایا گیا ہے (یہ لفظ فارسی میں دیو یعنی شیطان بن گیا) مترا[13] (Mitra) یہ "شمس دیوتا" ہے جو بہت ہی طاقت ور سمجھا گیا ہے۔ سنسکرت میں یہ لفظ متھرا (Mithra) ہے اور اوستا میں مشرہ (Mishra) ۔

ان معبودوں کے علاوہ ایرانی چند دوسرے معبودوں کی بھی پرستش کرتے تھے جو معمولی صوتی فرق کے ساتھ ہمیں ہندوستان میں بھی نظر آتے ہیں یعنی ایرانی (Arta) آرت سنسکرت میں ورت (Varta) یعنی "خدائے گیتی" ہے ایرانی دیوتا آذروان (Adhervan) سنسکرت میں اتھروان (Athervan) ہے جو کہ "برق دیوتا" ہے۔ ایرانی دیوتا اترآگنی (Atrugne) ہندوستانی دیوتا اگنی (Agni) ہے یعنی آگ کی دیوی اور ایرانی ایندرہ (Andra) سنسکرت میں اندرا (Indra) ہے یعنی "کڑک دیوتا"۔

کچھ عرصہ بعد ایران میں خیر و شر کی دو طاقتوں کا تصور پیدا ہوا جس نے ان کے

مذہبی عقائد پر گہرا اثر ڈالا۔ انگرامنو یا اہرمن کو بدی کا دیوتا اور اہورا کو خیر کا دیوتا قرار دیا گیا۔ اس کے بعد ایرانیوں کے مذہبی تصورات انہی دو خداؤں کے گرد چکر لگانے لگے۔ یوں ہندوستانی آریاؤں کے برعکس انہوں نے کثرت سے وحدت کی طرف سفر شروع کیا جو "ثنویت" پر آکر ختم ہو گیا۔ عین ممکن ہے کہ خیر و شر کی دو طاقتوں کا تصور دینے والا زرتشت ہو۔

ہندی آریوں کی طرح ایرانیوں میں بھی پروہتوں کا ایک طبقہ موجود تھا جس کو مغ[۱۴] (Mage) یا مجوس کہتے تھے۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی اسی طبقے سے متعلق تھی۔ انہوں نے بھی برہمنوں کی طرح مذہب کے اندر بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں۔ مذہبی فرائض میں قربانی کو خاص اہمیت حاصل تھی قربانی کے وقت ایک مقدس گھاس کا رس پینا' بہترین عبادت میں داخل تھا اس گھاس کا نام سنسکرت میں سومہ (Soma) اور اوستا میں ہومہ (Homa) بتایا گیا ہے
یہ مجوسی مذہب زرتشت کے ظہور تک ایران کا مذہب تھا۔

زرتشت

ایرانیوں کے پیغمبر زرتشت کی زندگی کے بارے میں متضاد آراء کی وجہ سے یہ مسئلہ ابھی تک لاینحل ہے کہ زرتشت کب اور کہاں پیدا ہوا بعض مورخین اس کا زمانہ پانچ ہزار سال قبل مسیح اور بعض ایک ہزار سال قبل مسیح بتاتے ہیں۔ جدید محققین نے اس کا زمانہ ساتویں صدی قبل مسیح کا وسط تجویز کیا ہے[۱۵]۔ یعنی ۶۳۰ سے ۶۶۰ ق۔م کے لگ بھگ زرتشت آذربائیجان کے علاقہ میں پیدا ہوا۔ زرتشت کے حالات تاریکی میں ہیں تاہم عام روایات کے مطابق اس نے بیس سال کی عمر میں گوشہ نشینی اختیار کی اور ہمہ تن عبادت اور غور و فکر میں لگ گیا تیس سال کی عمر میں اس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔

زرتشت کو اشاعت مذہب کے لئے آذربائیجان کی زمین راس نہ آئی تو اپنی نبوت کے بارھویں سال اس نے بلخ کا رخ کیا وہاں کے حکمران گشتاسپ نے نہ صرف یہ دین

قبول کیا بلکہ اس کی سرپرستی میں باختر (بلخ) میں جگہ جگہ آتشکدے تعمیر ہونے لگے اور زرتشت کی تعلیمات کو بارہ ہزار بیلوں کی کھالوں پر تحریر کرکے محفوظ کیا گیا۔

زرتشتی تعلیمات کے مطابق ساری کائنات کا ایک خدا ہے[14] جس کا ذاتی نام اہورا مزدا ہے۔ اس کی چھ اہم ایجابی صفات چھ سلبی صفات سے متصادم رہتی ہیں یعنی نورانیت ظلمت سے --- حقانیت کذب سے --- مالکیت عجز سے ----- قدوسیت نجاست سے --- سالمیت شکستگی سے --- اور ابدیت عارضیت سے متقابل ہیں۔ اہورا کی ان سلبی صفات کا مصدر "اہرمن" ہے اہرمن کے ساتھی کماریکان یا دیوا ہیں جن کا کام شر کو عالم میں پھیلانا ہے اور اہوار کے ساتھی یزداں ہیں جن سے دنیا میں خیر کی اشاعت ہوتی ہے۔

بلاشبہ بحیثیت ایک مفکر کے زرتشت نہایت ہی قابل احترام ہے' نہ صرف اس لئے کہ وہ اپنی فلسفیانہ بصیرت سے خارجی کثرت و تنوع کے مسئلہ تک پہنچ گیا تھا بلکہ اس وجہ سے کہ اس نے مابعد الطبعی ثنویت تک پہنچنے کے بعد اس ابتدائی ثنویت کو ایک اعلیٰ وحدت میں تحویل کرنے کی کوشش کی تھی[15] لیکن اس کے بعد اس کے متبعین میں سے کوئی بھی اس مخلصانہ کوشش کو آگے نہ بڑھا سکا اور یوں زرتشت کے پیروکار واضح طور پر ثنویت کے قائل ہو گئے۔ ان کا عقیدہ یہ ہو گیا کہ دنیا میں فائدہ پہنچانے والی تمام چیزوں کا خالق آہورا مزدا ہے اور نقصان پہنچانے والی تمام چیزوں کا خالق اہرمن ہے۔ اس طرح وہ دو ازلی ہستیوں یا دو خداؤں یا دو خالقوں کو مانتے ہیں۔ خیرو شر کے یہ خدا آپس میں نبرد آزما ہیں اس جنگ میں بالا خر روح خیر (آہورا مزد) کو فتح نصیب ہوگی۔ وہی قیامت کا دن ہوگا۔ زرتشتی تعلیمات میں حیات بعد الممات' آخرت' جہنم اور بہشت وغیرہ سے متعلق بھی عقائد پائے جاتے ہیں۔

زرتشتیوں کے نزدیک آگ اور نور کا درجہ سب سے بلند ہے کیونکہ یہ دونوں آہورا مزدا کے مظاہر ہیں۔ اس لئے اس دین کا قبلہ بھی آتش ہے اور آتش کو ہمیشہ روشن رکھنا ان کے نزدیک فرض اولین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زرتشت کو ماننے والے آتش پرست بھی کہلاتے ہیں۔ جب کہ ظلمت اہرمن کا مظہر ہے۔ آگ اسی لئے

مقدس ہے کہ وہ اندھیری راتوں کو روشن کرتی ہے۔ اور سرگرداں خبیث روحوں کو جو اندھیرے میں پرورش پاتی ہیں فنا کر دیتی ہے۔

آگ کے ساتھ ساتھ پانی اور مٹی (عناصر قدرت) بھی زرتشتیوں کے نزدیک مقدس ہیں۔ زمین کے تقدس کے پیش نظر وہ اپنے مردوں کو دفنانے یا جلانے کے بجائے ایک اونچے سنسان اور کھلے مچان پر رکھ دیتے ہیں تاکہ شکاری پرندے کھا جائیں۔ پانی کے تقدس کے پیش نظر سوائے پینے یا پودوں کی آبیاری کرنے کے اور کسی مقصد کے لئے اسے نہیں چھوتے۔

اخلاقی تعلیمات میں زرتشت نے "پندار نیک" "گفتار نیک" طہارت و پاک دامنی کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ اس کے نزدیک سود خوری' جھوٹ' وعدہ خلافی سخت گناہ ہیں۔ زرتشت نے متاہل[18] زندگی گزارنے اور اولاد پیدا کرنے پر زور دیا ہے کسب معاش کی تاکید کی۔ کاشت کاری کو سب سے بہتر پیشہ بلکہ مذہبی فریضہ قرار دیا۔ نیز ان لوگوں کو بشارت دی ہے کہ جو زراعت کا پیشہ اختیار کرتے ہیں اور جانوروں کی پرورش پرواخت کرتے ہیں۔ آپ نے سخاوت امداد و حسن سلوک کو بہترین اعمال میں شمار کیا ہے۔

زرتشت نے خود اپنی بعثت کا مقصد۔ "گاتھا" میں یوں لکھا ہے کہ اس نے یعنی (زرتشت نے) مذہب کی جو دعوت دی اس کا مقصد یہ تھا کہ مغوں کے قدیم مذہب میں جو توہمات شامل ہو گئے ہیں ان سے مذہب کو پاک کیا جائے۔[19]

زرتشتیوں کی مذہبی کتاب اوستا (AVESTA) ہے جو ان کے اپنے عقیدے کے مطابق منزل من اللہ ہے۔ اوستا کا مختصر سا حصہ جسے گاتھا کہتے ہیں' زبان کے لحاظ سے دوسرے حصوں سے مختلف ہے۔ اس کی زبان شاید وہی ہے جو زرتشت کی تھی۔ بقیہ حصے ایک خاص زبان میں ہیں جو اوستائی زبان کے نام سے مشہور ہے جو ہخامنش زبان سے مختلف ہے یہ کتاب اب اپنی اصلی حالت میں نہیں تاریخی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ اوستا کا اصل نسخہ سکندر کے حملے میں تباہ ہو گیا تھا۔ (تفصیل آگے آئے گی۔) پھر کئی سو سال بعد بلاش سوئم (۱۶۸ء تا ۱۹۱ء) کے زمانے میں اس کی تدوین نو کی کوشش کی

گئی مگر اس کی تکمیل ساسانی بادشاہ اردشیر بابکان کے زمانے میں ہوئی۔ اس تدوین میں گاتھا کے علاوہ بقیہ تمام حصے کی تصنیف میں محض حافظہ پر اعتماد کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصل اوستا کا محض ایک چوتھائی حصہ باقی بچا۔

اوستا کے بعد زرتشتیوں کی دو اور مذہبی کتابیں ہیں۔ ا ژند ۲ پاژند اول الذکر اوستا کی تفسیر ہے اور پاژند ژند کی تفسیر ہے۔ موجودہ ژند پہلوی زبان میں ہے جس کی تدوین ساسانی عہد میں ہوئی۔ پاژند کی زبان پہلوی اور فارسی کے درمیان کی زبان ہے اور نسبتاً زیادہ واضح ہے۔

ہخامنشی دور (۵۵۰ ق - م - تا ۳۳۰ ق - م)

آل ماد کی زبردست سلطنت بالآخر سائرس (کوروش اعظم) کے ہاتھوں ختم ہوگئی۔ سائرس (۵۵۰ ق - م تا ۵۲۹ ق - م) نے آل ماد کے آخری فرمانروا آستیاگس پر فتح حاصل کرنے کے بعد اپنے مورث اعلیٰ ہخامنش کے نام سے ہخامنشی عہد کی تاسیس کی۔ سلطنت کے قیام کے بعد اس نے روسیوں کے اور ایشیائے کوچک کے تمام علاقے فتح کرکے اپنی سلطنت کو دریائے سیحوں سے لے کر بحیرہ احمر تک وسیع کرلیا تھا۔ اس کی قائم کی ہوئی یہ حکومت دو سو بیس سال تک جاہ و جلال کے ساتھ قائم رہی۔ بالآخر سکندر کے شہ زور ہاتھوں نے اسے ختم کردیا۔

اس سلسلہ کے دوسرے بادشاہ حسب ذیل ہیں۔

کمبوجیہ (CAMBYSES) ۵۲۹ تا ۵۲۱ ق - م

داریوش اول (DARUIS I) ۵۲۱ ق - م تا ۴۸۵ ق - م اس نے بابل اور مصر فتح کرنے کے بعد پنجاب اور سندھ کو بھی مسخر کیا۔ ڈانیوب کو عبور کرکے تھریس کو فتح کیا۔ مقدونیا کو زیر کیا افریقہ اور چین تک پہنچا۔ اس کے حدود سلطنت سب سے زیادہ وسیع تھے مشرق میں پنجاب و سندھ سے لے کر مغرب میں مقدونیا و تراکیہ (تھریس) تک جنوب مغرب میں افریقہ سے لے کر شمال مشرق میں چین تک ان عظیم الشان فتوحات کی وجہ سے اسے تاریخ نے "داریوش اعظم" کا لقب دیا۔

خشارشیا(XERXES) ۴۸۵ ق - م تا ۴۶۶ ق - م
اردشیر درازدست(ARTAXERXES) ۴۶۵ ق - م تا ۴۲۵ ق - م
داریوش دوئم ۴۲۴ق - م تا ۴۰۴ق - م
اردشیردوم ۴۰۴ق - م تا ۳۸۵ق - م
اردشیرسوم ۳۸۵ق - م تا ۳۳۸ق - م
داریوش سوئم ۳۳۶ق - م تا ۳۳۰ق - م جسے سکندر نے شکست دے کر ہنحامنشی عہد کا خاتمہ کیا۔

دور گذشتہ کی طرح اس عہد میں بھی طرز حکومت شاہی تھا۔ بادشاہ کو قومی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ عوام بادشاہ کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ لہٰذا بادشاہ کے احترام کی خاطر لوگ جھک جھک کر زمین تک جالگتے تھے اور اس کے پاؤں کو بوسہ دیتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ایرانیوں کا عقیدہ تھا کہ ہنحامنشیوں کو خدا کی طرف سے فرّایزدی یا فرکیانی عطا ہوئی ہے[۲۱]۔ اس لئے وہ سرزمین ایران کے بادشاہ بنے۔ بعد ازاں یہ فرکیانی ہنحامنشی بادشاہوں کو ورثہ میں ملتی گئی۔ اسی سبب سے بعد میں ساسانیوں نے دعوئی کیا کہ وہ ہنحامنشیوں کے وارث ہیں۔

ہنحامنشی عہد میں سات خاندان جن کے پاس اپنی بڑی بڑی جاگیریں تھیں بہت ممتاز تھے انہی میں ہنحامنشیوں کا خاندان بھی تھا۔ ان کو بادشاہ کی طرف سے خاص رعایات حاصل تھیں بادشاہ کی مجلس مشاورت انہی امراء پر مشتمل ہوتی تھی۔ بعض اوقات بادشاہ ان امراء کو محصولات سے بھی مستثنیٰ کردیتا تھا۔ یعنی وہ اپنے علاقوں سے مالیہ وصول کرکے شاہی خزانے میں جمع کرانے کے بجائے خود اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔

داریوش اعظم نے ملک کو مختلف صوبوں (ساتراپی) میں تقسیم کردیا تھا۔ ہر صوبے کا حکمران ساتراپ کہلاتا تھا سیاسی حالات کے مطابق صوبوں کی تعداد بڑھتی گھٹتی رہتی تھی۔ صوبوں میں مرکزی حیثیت میڈیا کو حاصل تھی دوسرا اہم صوبہ پارس تھا۔ اہل پارس ٹیکسوں سے مستثنیٰ تھے۔ لیکن جب اس صوبے سے بادشاہ کا گذر ہوتا تھا تو اہل پارس قیمتی تحائف پیش کرتے تھے۔ ہر صوبے کے لئے ٹیکس کی شرح مختلف تھی۔ سب

سے زیادہ نظم بابل پر عائد تھا۔ اس سے کم مصر پر[۲۲] اور سب سے کم مکران پر

ہخامنشی عہد میں امراء کی عورتیں پردے میں رہتی تھیں اور ان عورتوں کا کام کاج کرنا کسر شان سمجھا جاتا تھا۔ دیہاتی اور خانہ بدوش لوگوں کی عورتیں البتہ بے پردہ رہتی تھیں۔ معاشرے میں ایک سے زائد شادیوں کا عام رواج تھا۔ شادی خونی رشتہ داروں کے مابین (یعنی ماں بیٹے' باپ بیٹی اور بہن بھائی کے مابین) بھی ہو جاتی تھی۔

مذہباً ہخامنشی آل ماد کے مذہب پر تھے آہورا مزدا ان کے نزدیک خالق کائنات تھا آگ کو مظہر خداوندی سمجھ کر اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس امر میں شبہ ہے کہ ہخامنشیوں کا مذہب زرتشتی تھا۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے ایرانیوں میں چند عیوب نمایاں تھے جن میں شراب سرفہرست تھی۔ ورزش اور کھیل کے رسیا تھے صلح وامن کے زمانے میں بادشاہوں کا پسندیدہ مشغلہ شکار تھا ایرانی سالگرہ کی تقاریب نہایت اہتمام سے مناتے تھے۔ کثیر الاولاد افراد معاشرے میں لائق احترام سمجھے جاتے تھے۔ جھوٹ اور ناپاکی سخت ناپسندیدہ امور تھے۔

ہخامنشیوں کا عہد تعمیراتی نکتہ نظر سے بہت اہم ہے ایرانیوں نے اپنے عروج کے مختلف ادوار میں مختلف مقامات پر شہر آباد کئے۔ محلات تعمیر کرائے اور دیگر شاندار عمارتیں بنوائیں سب سے پہلے میدیوں نے ہمدان (امدان) شہر بسایا تھا۔ پارسیوں نے بھی ان ہی کی تقلید کرتے ہوئے دو شہر پر سومش اور پر ساگرد آباد کئے جن میں سے آخر الذکر دارا اول کے ابتدائی عہد تک اس عظیم مملکت کا پایہ تخت رہا دارا اول کے عہد میں اصطخر (جو یونانی زبان میں پرسی پالس کے نام سے مشہور ہے۔) کی عظمت کا دور شروع ہوا۔ اسی کی حدود میں تخت جمشید واقع ہے۔ اصطخر ہخامنشیوں کا پایہ تخت تھا جب کہ آل ماد کا پایہ تخت باختر (بلخ) رہا تھا تخت جمشید کی صناعی و کاریگری کے بارے میں تفصیلات پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ تاہم اس تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

ہخامنشیوں کی زبان قدیم فارسی تھی۔ قدیم فارسی کا رسم الخط (Cuniform Script) کہلاتا ہے جو بائیں سے دائیں طرف کو لکھا جاتا تھا۔ یہ رسم الخط بابل و نینوا میں رائج تھا۔ وہیں سے ایرانیوں نے اپنایا اور ترقی دی۔

سکندر اور خاندان سلوکیاں

مقدونیہ کے یونانی بادشاہ سکندر کی ایشیائی مہمات کی ایک کڑی ایران پر اس کا قبضہ بھی تھا۔ مقدونیہ کے بادشاہ فیلقوس (فلپ) جو مقدونیہ کو یونانی ریاستوں کی قیادت کے منصب پر پہنچا چکا تھا' کا منصوبہ تھا کہ ایشیائے کوچک میں جو یونانی شہر ہیں انہیں سلطنت ایران کے چنگل سے آزاد کرایا جائے۔ نیز دارا اول (دارایوش اعظم ۵۲۱ تا ۴۸۵ق ۔ م اور خشارشیا (زرکیسز ۴۸۵ق ۔ م تا ۴۶۶ق ۔ م) سے جو حملہ آور کی حیثیت سے یونان آئے اور مقدونیہ و تھریس پر چڑھائی کی تھی' اس ہزیمت کا بدلہ لیا جائے وہ خود تو بے وقت قتل ہو جانے کی وجہ سے اس منصوبہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا البتہ اس کے اولوالعزم فرزند سکندر نے باپ کے اس منصوبہ پر عمل کیا وہ ایک زبردست فوج لے کر مقدونیہ سے چلا اور فتوحات کرتا ہوا پنجاب تک آپہنچا اور ایران' یونانی مقبوضہ بن گیا۔ آخری ہخامنشی حکمران دارا سوئم اور سکندر کے مابین آخری فیصلہ کن جنگ میں دارا کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ۳۳۰ق ۔ م میں ہخامنشیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کا خاتمہ دراصل ایران کی قومی حکومت کا خاتمہ تھا۔ کیونکہ ایران پر اب اجنبی یونانیوں کا تسلط تھا جن کی تہذیب و تمدن مذہب و اخلاقیات ایرانیوں سے مختلف تھے۔

سکندر نے فتح کے بعد باختر میں جو ہنگامہ قتال بپا کیا اور جس طرح تخت جمشید کو جلوایا اس کی توجیہ مغربی و یونانی مورخین یہ پیش کرتے ہیں کہ خشارشیا نے بھی ایتھنز میں یونانی مندر تباہ کئے تھے۔ لیکن سکندر نے جس طرح صور (TYRE) کے شہر کو فتح کرنے کے بعد وہاں عام شہریوں کے قتل کا حکم دیا جس کے نتیجہ میں کوئی دو ہزار آدمیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا اور تیس ہزار کو غلام بنا کر بیچ ڈالا گیا[۲۳] اور غزہ جو پانچ فلسطینی شہروں کا سرتاج تھا' فتح کے بعد جس طرح تاراج کیا گیا۔ اور فوج کے سالار کو جو ایک خواجہ سرا تھا سکندر کی گاڑی کے پیچھے باندھ کر شہر کے اردگرد پھرایا گیا اور غزہ کی پوری آبادی غلام بنا کر بیچ ڈالی گئی[۲۴]۔ سکندر کے کردار پر ایسے بدترین دھبے ہیں جن کی کوئی

معذرت تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ تخت جمشید کو جلانے کے نتیجہ میں شاہی کتب خانے کو بھی آگ لگی جس کی وجہ سے اوستا کا نسخہ بھی جل گیا۔ سکندر نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ان موبدوں کو بھی قتل کردیا جن کو اوستا ازبر تھی۔

سکندر نے دارا کی بیٹی روشنک (رخسانہ) سے شادی کی جس سے اس کا ایک بیٹا بھی پیدا ہوا۔ روشنک کے علاوہ شاہی خاندان کی دو اور شہزادیوں کو بھی اپنے حرم میں داخل کیا پنجاب سے واپسی کے بعد بابل میں بخت نصر کے محل میں شراب نوشی اور عیش و عشرت میں مشغول ہوگیا اور ساڑھے بتیس سال کی عمر میں بخت نصر کے محل میں وفات پائی (۳۲۳ - ق - م)

سکندر کے بعد اس کی وسیع سلطنت اس کے جرنیلوں کے درمیان تقسیم ہو گئی۔ مصر بطلیموس کے قبضے میں آیا اور ایران پر اٹھارہ سال کی کشمکش کے بعد سلوکس نے اپنا تسلط جمایا۔ اور ۳۱۲ ق - م تا ۲۸۱ق - م حکومت کی۔ اس نے پہلے بابل کو اپنا مستقر بنایا اور پھر عراق میں ایک شہر "سلوکیہ" (دریائے دجلہ کے کنارے) اور شام میں "انطاکیہ" آباد کرکے ان کو مشرقی و مغربی اقالیم کا پایہ تخت قرار دیا۔ اس کی موت کے بعد یہ سلطنت اس کے خاندان میں موروثی طور پر منتقل ہوتی رہی۔ اس خاندان میں بارہ حکمراں گزرے۔ آخری سلوکی حکمراں انطیوکس ہفتم تھا جس نے ۱۳۸ق - م تا ۱۲۹ق - م تک حکومت کی۔

سکندر کی حکومت کے دوران ایک طرف تو ایرانیوں کی قومی خصوصیات زائل کرنے کا عمل تیزی سے جاری رہا اور اس مقصد کے لئے سکندر نے ایشیائی مقبوضات میں ستر نئے شہر آباد کرائے۔ جنہیں یونانی حضارت کے مراکز کی حیثیت حاصل تھی۔[۲۵] تو دوسری طرف مذہب زرتشت کو بہت صدمہ پہنچا۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جاچکا ہے اوستا جل گئی سینکڑوں کی تعداد میں موبدوں کو قتل کردیا گیا۔ یہودی اور زرتشتی جلاوطن یا معاشرتی حقوق سے محروم کردیئے گئے۔ سکندر کی یہی پالیسی اس کے جانشینوں نے اپنائی۔ زرتشتیوں کو سکندر اور اس کے جانشینوں سے جو نفرت تھی اس کا اظہار اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے انطیوکس چہارم (۱۷۴ق - م تا

۱۴۴ق ۔ م) کو اہریمن کا نفرت انگیز لقب دیا۔[۲۶]

اشکانی عہد :۔ ۲۴۹ق ۔ م تا ۲۲۶ق ۔ م

سکندر کی موت کو سو سال ہی گزرے تھے کہ اس کے جانشینوں کے ہاتھ سے ایرانی مملکت کے مقبوضات رفتہ رفتہ نکلنے لگے۔ سلیوکی حکومت کے خاتمے کا آغاز پارت یا پارتھیا (خراسان) کے اشکانی خاندان کے مورث اعلیٰ ارشک اول (ARSACES I) ۲۴۹ق ۔ م تا ۲۴۷ق ۔ م کے ہاتھوں ہوا جس نے اشکانی عہد کی بنیاد رکھی۔

اشکانی بھی آریائی تھے جو قبیلہ ماد اور پارس کی طرح وسط ایشیا (بحیرہ خزر کے مشرقی علاقوں) سے آکر موجودہ خراسان جو اس وقت پارت یا پارتھیا کہلاتا تھا' میں آباد ہوئے اور یہیں ارشک اول کے ہاتھوں دولت اشکانیاں کی تاسیس ہوئی۔ تقریباً ایک صدی تک اشکانیوں کی یہ حکومت سلیوکیوں کی حکومت کے متوازی چلتی رہی۔ پھر جب اشکانی حکومت کو استحکام نصیب ہوگیا تو سلوکیوں کا ایران سے مکمل خاتمہ ہوگیا۔ اس خاندان میں کل اٹھائیس بادشاہ گزرے۔

مسعودی سمیت اکثر مورخین اس دور کو "ملوک الطوائف" کا دور بتلاتے ہیں۔ اس خاندان کا ابتدائی عہد قدرے بہتر ہے اور چند فرمانرواؤں کو تاریخی اہمیت بھی حاصل ہے مگر بلاشک و شبہ اس کا آخری دور طوائف الملوکی کا دور ہے۔ پراگندہ حالات میں تہذیبیں پروان نہیں چڑھا کرتیں۔ لہٰذا اس عہد کی تہذیب کی کوئی بات قابل ذکر نہیں ہخامنشیوں کا تہذیبی دور ان سے بدرجہا بہتر تھا۔ اس عہد میں سیاسی پراگندگی کے پہلو بہ پہلو معاشرتی پراگندگی بھی نظر آتی ہے۔ شراب نوشی' رقص و موسیقی کا رجحان جو کہ پہلے سے موجود تھا اب بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ عورتوں کا سماجی مرتبہ بھی ہخامنشی عہد کے مقابلے میں کمتر ہوگیا تھا۔ فرہاد پنجم یعنی ارشک پانزدہم (۲ق ۔ م تا ۴ء) کی مثال کو چھوڑ کر کہ وہ اپنی ماں کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھاتا تھا اور حکومت کی باگ ڈور بہت حد تک اسی کے ہاتھ میں تھی۔ اشکانی عہد کی شاہی

عورتوں کا امور سلطنت میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

فن تعمیر اور سنگ تراشی سے بھی اشکانیوں کو کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی اس لحاظ سے بابل، آسور اور ایران کے ہخامنشی بادشاہوں کے مقابلے میں ان کی حیثیت فروتر ہے۔ سکندر اعظم کے حملے سے ساسانی دور کے اغاز تک فن تعمیر کا کوئی ایسا نمونہ نہیں ملتا جو اس دور کی یادگار کہلا سکے۔[صفحہ ۲۷]

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے چند ایسے شواہد ملے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ارشک بیست و یکم یعنی واردان دوئم (VARDANES II) کے عہد تک (۵۱ء) وہ قدیم آریائی مذہب پر قائم رہے۔ آریائی معبودوں کے ساتھ ساتھ اپنے اجداد کی ارواح کی پرستش بھی کرتے رہے۔ ارشک بیست و دوئم یعنی بلاش اول (۵۱ء تا ۷۷ء) کے عہد میں زرتشتی مذہب کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ ازاں بعد ارشک بیست و ششم یعنی بلاش سوئم (۱۴۸ء تا ۱۹۱ء) کے عہد میں اوستا کی تدوین نو کی گئی اور اس کی تفسیر لکھی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ آریائی پروہتوں یعنی مغ یا مجوس کی حیثیت بھی کم کردی گئی۔ اور ان کی جگہ محافظین آتشکدہ یعنی آوروان نے لے لی۔

ساسانی عہد :- (۲۲۶ء تا ۶۵۲ء)

ساسانیوں سے ایران کی تاریخ کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جو کئی اعتبار سے شاندار ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقی معنوں میں تاریخی بھی ہے۔ یہ دور "عہد قدیم" سے شروع ہو کر "عہد وسطیٰ" میں ختم ہوتا ہے جب حجاز میں اسلام کا آغاز ہوا تو یہ عظیم الشان سلطنت اپنے عرصہ زوال میں تھی۔

[صفحہ ۲۹] ساسانی عہد کا موسس اردشیر بابکان تھا جس کے باپ کا نام بابک اور دادا کا نام ساسان تھا۔ اردشیر نے ۲۲۰ء میں آخری آشکانی بادشاہ اردوان کو شکست دے کر اپنے مورث اعلیٰ ساسان کی نسبت سے ساسانی عہد کا آغاز کیا اس خاندان نے چار سو چھبیس سال ایران کے وسیع علاقوں پر شان و شوکت سے حکومت کی اس خاندان میں ۳۷ حکمران گزرے جن میں دو خواتین پوران دخت دختر خسرو پرویز (۶۳۰ء تا ۶۳۱ء) اور

آزرمی دخت دختر خسرو پرویز (۶۳۱ء) بھی شامل ہیں۔ آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد سوئم تھا (۶۳۲ء تا ۶۵۲ء) جس کو ۶۳۲ء میں مسلمانوں کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ اور ساسانی حکومت کے علاقے عربوں کے زیر نگیں آ گئے۔[۲۹]

جہاں تک اس عہد کی تہذیب کا تعلق ہے ہخامنشیوں کے بعد یہی عہد قابل ذکر ہے خود ساسانی بادشاہوں کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ وہ ہخامنشیوں کے حقیقی وارث ہیں۔ انہوں نے اشکانیوں کی طوائف الملوکی کو ختم کر کے ایک مستحکم حکومت قائم کی اور اشکانی تہذیب کے رہے سہے یونانی اثرات کو مٹا کر قدیم ایرانی روایات کو دوبارہ زندہ کیا یوں وہ ہخامنشیوں کے حقیقی وارث ثابت ہوئے۔

ایرانی تہذیب میں سب سے نمایاں عنصر شہنشاہیت کا ہے۔ جس کا براہ راست اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑا ہے ایرانی بادشاہ عموماً اور ساسانی بادشاہ خصوصاً اپنی سطوت و ہیبت' عظمت و جلال اور شاہانہ کروفر کے لئے تاریخ میں مشہور رہا ہے ساسانی بادشاہ عموماً لوگوں کے سامنے نہیں آتے تھے۔ بادشاہ اور درباریوں کے مابین پردہ حائل ہوتا تھا۔ آداب شاہی کو شدت سے ملحوظ رکھنا پڑتا تھا۔ خلاف ورزی کی صورت میں قتل کی سزا دی جا سکتی تھی۔[۳۰]

بادشاہ کا لباس' تاج و تخت' زروجواہر اور سونے چاندی سے پٹا ہوا ہوتا تھا۔ بادشاہ کے ذاتی تحفظ کے لئے فوج کا ایک خاص دستہ متعین ہوتا تھا۔ جس کی سالاری بہت ہی معتمد اور اکثر شاہی خاندان کے کسی فرد کے سپرد کی جاتی تھی۔ ان محافظوں کے چمکدار دستے' وردیاں اور زرہیں نیز بادشاہ کا تاج اور زریں لباس لوگوں کے دلوں میں ایسی ہیبت ڈالتا تھا کہ ہر خاص و عام کا سر جھک جاتا تھا اور بعض بے ساختہ گر پڑتے تھے۔[۳۱]

ایرانی بادشاہ شاہانہ کروفر پر بے دریغ خرچ کرتے تھے اور بے انتہا ذخیرہ بھی کرتے تھے۔ خسرو دوئم نے ۸ - ۶۰۷ء میں طیسفون (مدائن) میں اپنے خزانہ کو نئی عمارت میں منتقل کیا تو اس میں چھیالیس کروڑ اسی لاکھ (۴۶٬۸۰٬۰۰۰۰۰) مثقال سونا تھا۔[۳۲] (یعنی تقریباً چار ارب ارسٹھ کروڑ روپے)۔ حکومت کے تیرھویں سال کے بعد اس کے

خزانہ میں تقریباً ۱۰ کروڑ مثقال وزن کا سونا تھا۔ خسرو دوئم کے تاج میں ۱۲۰ پونڈ (یعنی ڈیڑھ من) خالص سونا تھا۔ پورے تاج کا وزن ساڑھے ۹۱ کلو (تقریباً ڈھائی من) تھا۔ یہ تاج جو سونے اور چاندی سے بنا ہوا اور زمرد یاقوت اور موتیوں سے مرصع تھا' بادشاہ کے سر کے اوپر چھت کے ساتھ ایک سونے کی زنجیر کے ذریعہ لٹکا رہتا تھا جو اس قدر باریک تھی کہ جب تک تخت کے بالکل قریب آکر نہ دیکھی جائے نظر نہیں آتی تھی۔ اگر کوئی شخص دور سے دیکھتا تو یہی سمجھتا تھا کہ تاج بادشاہ کے سر پر رکھا ہے لیکن حقیقت میں وہ اس قدر بھاری تھا کہ کوئی انسانی سر اسے اٹھا نہیں سکتا تھا۔

عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ جہاں شہنشاہیت ہوتی ہے وہاں ایک مصنوعی معاشرت' پر عشرت زندگی اور عیش پرستی کا عنصر بھی موجود ہوتا ہے۔ یہ بات خصوصیت سے ایرانی تہذیب پر لاگو آتی ہے۔ ایرانی سر تا پا ایک مصنوعی تہذیب' بے جا رسوم و آداب اور رکھ رکھاؤ اور پر تصنع زندگی میں غرق تھے۔ تکلفات زندگی' تعیشات اور سامان آرائش کی وہ بہتات تھی کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

"کسریٰ پرویز کے پاس بارہ ہزار عورتیں تھیں۔ پچاس ہزار اصیل گھوڑے' اس قدر سامان تعیش' محلات' نقد و جواہرات تھے کہ ان کا اندازہ مشکل ہے۔ اس کا محل اپنی شان و شکوہ اور عظمت میں جواب نہیں رکھتا تھا۔" "تاریخ میں مثال نہیں ملتی کہ کسی بادشاہ نے ان شاہان ایران کی طرح داد عیش دی ہو۔ جن کے پاس تحائف اور خراج کی رقمیں ان تمام شہروں سے آتی تھیں جو مشرق اوسط اور مشرق اقصیٰ کے درمیان موجود تھے۔"

اسلامی فتوحات کے بعد جب ایرانی' عراق عجم سے بے دخل ہوئے تو انہوں نے وہ اندوختہ چھوڑا جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ عربوں کو ساسانیوں کے دارالسلطنت مدائن کی فتح میں ایسے خیمے ملے جو سر بمہر ٹوکروں سے بھرے ہوئے تھے عرب سمجھے کہ اس میں کھانے پینے کا سامان ہوگا کھولنے پر معلوم ہوا کہ ان میں سونے چاندی کے برتن ہیں۔

مورخین نے فرش بہار کی (جس پر ایرانی امراء موسم خزاں میں شراب پیتے

تھے۔) تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "یہ ساٹھ گز مربع تھا اس کی زمین سونے کی تھی۔ جس میں جا بجا جواہرات اور موتیوں کی گلکاری تھی۔ چمن تھے جن میں پھولدار اور پھل دار درخت قائم تھے درختوں کی لکڑی سونے کی' پتے حریر کے کلیاں سونے چاندی کی اور پھل جواہرات کے بنائے گئے تھے گرد ہیرے کی جدول تھی۔ درمیان میں روشیں اور نہریں بنائی گئی تھیں۔ اور یہ سب جواہرات کی تھیں۔ موسم خزاں میں تاجداران آل ساسان اس گلشن بے خزاں میں بیٹھ کر شراب پیا کرتے تھے اور دولت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آتا جو زمانہ نے کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔ (شرر' مولوی عبدالحلیم' تاریخ اسلام' جلد اول ص ۳۵۴)

معاشرتی طور پر عموماً یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ متوسط طبقہ' اعلیٰ طبقے کی نقالی کرتا ہے یہی حال ایران کا تھا امراء شاہی خاندان کی اور متوسط طبقہ' طبقہ امراء کی نقالی کرتا اور اپنے معیار زندگی کو ان جیسا بنانے کی کوشش کرتا جس سے معاشرت بہت زیادہ پیچیدہ ہو گئی تھی۔ طبقہ امراء کا ایک ایک شخص اپنی ذات اور اپنے لباس کے کسی ایک حصہ پر اس قدر خرچ کرتا تھا جس سے ایک پوری بستی کی ضروریات زندگی پوری کی جا سکتی تھی۔ مثلاً اہل ایران اپنے سروں پر جو کلاہ رکھتے تھے وہ ان کی حیثیت کے مطابق ہوتی تھی۔ ہرمز کا شمار ان افراد میں ہوتا تھا جن کی سیادت تسلیم شدہ تھی لہٰذا اس کی کلاہ کی قیمت ایک لاکھ تھی جس میں جواہرات ٹکے ہوئے تھے۔ ازادیہ' کسریٰ کے عہد میں حیرہ کا حاکم تھا' اس کی کلاہ کی قیمت پچاس ہزار تھی۔ رستم کی کلاہ ستر ہزار میں فروخت ہوئی جب کہ اس کی قیمت ایک لاکھ تھی۔ [صفحہ ۳۸]

ایرانی اس جان لیوا تکلفات اور شدید تصنع کے اس درجہ عادی ہو چکے تھے کہ اس کے بغیر ان کے نزدیک زندگی کا کوئی تصور نہ تھا۔ مدائن کی فتح کے وقت شہنشاہ ایران یزدگرد کو جب دارالحکومت چھوڑ کر بھاگنا پڑا تو اس پریشانی میں بھی وہ اپنے ساتھ "ایک ہزار باورچی' ایک ہزار گویے' ایک ہزار چیتوں کے محافظ' ایک ہزار بازداد اور بہت سے دوسرے لوگوں کو لیتا گیا۔ اور یہ تعداد اس کے نزدیک ابھی کم تھی۔" [صفحہ ۳۹]

ہرمزان شکست کھانے کے بعد جب پہلی مرتبہ مدینہ آیا اور حضرت عمرؓ کی مجلس میں حاضر ہوا تو اس نے پانی مانگا۔ پانی ایک موٹے سے پیالے میں لایا گیا۔ اس نے کہا چاہے میں پیاسا مرجاؤں اس بھدے پیالے میں پانی پینا میرے لئے ممکن نہیں چنانچہ اس کے لئے تلاش کرکے دوسرے برتن میں پانی لایا گیا جس کو وہ پی سکا۔ صفحہ

ساسانی عہد کے تقریباً تمام ہی بادشاہ شراب و شکار اور رقص و موسیقی کے رسیا تھے۔ بادشاہ محل کے اندر چوسر شطرنج سے دل بہلاتا تھا۔ چوگان کا عام رواج ہوگیا تھا۔

ایرانی تہذیب میں معاشرتی طبقات شروع سے ہی نظر آتے ہیں لیکن ساسانی عہد میں طبقات کی تقسیم بہت زیادہ شدت اختیار کرگئی۔ اعلیٰ طبقہ' شاہی خاندان اور ایرانی امراء کے مشہور سات خاندانوں پر مبنی تھا۔ اس طبقے کے لوگ سدا بہار پھولوں کی سیج پر زندگی گزارتے تھے۔ ان کے گھر کے لوگ اور بچے سونے چاندی سے کھیلتے اور دودھ و گلاب میں نہاتے' یہ لوگ اپنے گھوڑوں کی نعلیں بھی جواہرات سے جڑتے اور در و دیوار کو بھی ریشم و کمخواب سے سجاتے۔ صفحہ

اس کے بعد عوام الناس تھے جن میں ایک طبقہ مذہبی علماء کا تھا۔ اس طبقے کے کچھ علماء مقدمات و معاملات کے فیصلے کرتے تھے۔ جنہیں "دادور" کہتے تھے۔ کچھ علما' تبلیغ' و اشاعت کا کام کرتے تھے۔ جس کے رئیس کو "موبد موبدان" کہتے تھے جو درحقیقت زرتشتی دنیا کا پیشوائے اعظم ہوتا تھا۔ اس کے ماتحت بے شمار موبد اور موبدوں کے ماتحت "ہیربد" ہوتے تھے جو آتش کدوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

ہیربدوں کا رئیس "ہیر ہیربدان" کہلاتا تھا۔ علما کا سب سے نچلا طبقہ مغوں کا تھا جن کے رئیس کو "مغ مغاں" کہتے تھے۔

عوام الناس کا دوسرا طبقہ ملکی محافظوں یعنی فوجیوں پر مشتمل تھا۔ تیسرا طبقہ دبیروں کا تھا۔ جن میں ادیب' شاعر' محاسب' فرمان نویس' منجم' طبیب' افسر مالیات وغیرہ شامل تھے۔ ایک اور طبقہ اہل حرفہ کا تھا اور سب سے نچلا طبقہ کسانوں کا تھا۔

یہ طبقے مستقل اور موروثی تھے جن کے درمیان ناقابل عبور فاصلہ تھا۔ ان طبقات میں سے اگر کسی طبقے کا کوئی شخص کسی دوسرے طبقے میں شامل ہونا چاہتا تھا تو یہ

ممکن نہ تھا۔ جس طرح اعلیٰ طبقے کی زندگی سراسر عیش و طرب کی تھی اسی طرح نچلے طبقے کی زندگی سراپا کلفت و مصیبت تھی۔ "کسانوں کی حالت بہت بدتر تھی۔ وہ اپنی زمینوں کے ساتھ بندھے رہتے تھے ان سے ہر قسم کی بیگار اور خدمت لی جاتی تھی۔ کسانوں کا تعلق زمینداروں کے ساتھ تقریباً ایسا ہی تھا جیسا غلاموں کا تعلق آقا کے ساتھ ــــــ ان بے چارے کسانوں کے بڑے بڑے گروہ فوج کے پیچھے پیچھے پیادہ کوچ کرتے تھے گویا ابدی غلامی ان کی تقدیر میں لکھی تھی اور کسی قسم کی تنخواہ یا اجرت سے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی۔"[ص۲۲]

رہ گیا متوسط طبقہ تو ان کی کمرتت نئے ٹیکسوں نے توڑ رکھی تھی۔ ان پر دو طرفہ مصیبت تھی ایک تو اعلیٰ طبقہ کی نقالی کی وجہ سے انہوں نے اپنا معیار زندگی بڑھا رکھا تھا جس کے لئے انہیں بے تحاشہ اخراجات برداشت کرنے پڑتے تھے۔ تو دوسری طرف محاصل اور نذرانے پیش کرنا۔ ساسانی عہد میں بادشاہ کو نذرانے پیش کرنے کا دستور بھی تھا جس کو "آئین"[ص۲۳] کہتے تھے۔ اس آئین کے مطابق، عید نوروز اور جشن مہرگان[ص۲۴] کے موقع پر قیمتی تحائف اور بھاری نذرانے وصول کئے جاتے تھے۔ اس کی نوعیت بھی سرکاری محصول کی ہو گئی تھی۔

ظاہر ہے کہ جب زندگی کے معیار کا یہ عالم ہو کہ امراء میں سے کسی کا ایک لاکھ درہم سے کم پٹکا باندھنا اور تاج پہننا معیوب سمجھا جاتا ہو اور اگر کسی امیر کے پاس نہایت بلند ایوان، فوارہ، حمام، باغات، تیار جانور، اور خوشرو غلام نہ ہوتے کھانے پینے میں وسعت و تکلفات اور لباس و پوشاک میں تجمل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی تو ایسی صورت میں امراء و بادشاہ کے لئے رقوم کی فراہمی کا یہی ذریعہ رہ جاتا ہے کہ عوام پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگائے جائیں۔[ص۲۵]

المختصر ساسانی عہد میں جس قدر عیشات میں اضافہ ہوا اسی قدر عوام پر محاصل کا بوجھ پڑا۔ اس عہد میں ایک نیا محصول عائد کیا گیا تھا جسے "گزیت" (GIZYAT) کہتے تھے (یہی لفظ عربی میں "جزیہ" بن گیا) یہ ذاتی محصول تھا جو بالعموم عیسائیوں اور یہودیوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ سرکاری لگان "خراک" (جو عربی میں خراج بن گیا۔)

پیداوار کا تیسرا تا چھٹا حصہ ہوا کرتا تھا۔ اس کی وصولی میں بہت سختی کی جاتی تھی اور اس سے رعایا بھی بہت تنگ تھی۔[ص]

ساسانی عہد مذہبی اعتبار سے بھی شدید افراط و تفریط کا شکار نظر آتا ہے یوں تو اس عہد میں مذہب زرتشت باقاعدہ سرکاری مذہب کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اوستا اور ژند کی تدوین نو کی گئی' آتش کدے تعمیر کئے گئے اور ان کے اخراجات کے لئے جاگیریں وقف کی گئیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایران میں مانی اور مزدک کے ظہور نے مذہبی و معاشرتی پراگندگی عام کر دی۔

مانی

دوسرے ساسانی فرمانروا شاپور اول (۲۴۰ء تا ۲۷۲ء) کے زمانے میں مانی کا ظہور ہوا۔ یہ نیم ایرانی[ص] ۲۱۵ء یا ۲۱۶ء میں بابل پیدا ہوا وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا۔ اس کی ماں اشکانی خاندان کی ایک شاہزادی تھی اور باپ جس کا نام ابن الندیم کی فہرست کے مطابق "فوتق" تھا عیسائیوں کے فرقہ مغتسلہ سے تعلق رکھتا تھا اور مانی کی ابتدائی تعلیم انہی عقائد کے مطابق ہوئی۔

مانی نے ۲۴ سال کی عمر میں شاہ پور کی تاج پوشی کے دن اپنی نبوت کا اعلان کیا بلکہ یہ کہا کہ میں فار قلیط (PARACLET) ہوں جس کے آنے کی بشارت حضرت عیسیٰ نے دی تھی۔ شاہزادوں میں سب سے پہلے شاہ پور کے بھائی فیروز نے اس کی دعوت پر لبیک کہا اور شاید اسی کی وساطت سے مانی کی رسائی شاہ پور کے دربار میں ہوئی۔ شاہ پور نے یہ بھی مذہب قبول کر لیا جس کی وجہ سے مانویت تیزی سے ایران میں پھیلنے لگی اور تقریباً دس سال تک مانی آزادانہ ایران میں تبلیغ کرتا رہا۔

اس نئی صورت حال سے دین زرتشت کے مذہبی قائدین خوش نہیں تھے۔ وہ مانویت کو بدعت خیال کرتے تھے اور اس کے سدباب کے لئے بالآخر انہوں نے شاہ پور کی اجازت سے دربار کے اندر مانی سے مناظرہ کیا اور اسے شکست دے دی۔ اپنے پیغمبر کی شکست سے شاہ پور اس قدر بددل ہوا کہ اس نے مانی کے قتل کا حکم دے دیا مگر

مانی کسی طرح بچ نکلا اور کشمیر و تبت کا دورہ کرتا ہوا چینی ترکستان پہنچا جہاں اس کے مذہب کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

شاہ پور کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا ہرمز تخت نشین ہوا تو مانی کو ایران آنے کی دعوت دی گئی۔ مانی ایران واپس آیا تو اس کے ساتھ بہتر سلوک کیا گیا لیکن دو سال سے بھی کم مدت حکمران رہ کر جب ہرمز وفات پا گیا تو اس کا بھائی بہرام تخت نشین ہوا۔ مانی نے بہرام کے سامنے بھی اپنے عقائد پیش کیے بہرام نے موبدوں اور مانی کی مابین دوبارہ مناظرہ کرایا جس میں مانی کو پھر شکست ہوئی۔ اس بار مانی کو گرفتار کر کے بڑی بے دردی سے مارا گیا' اس کی کھال کھینچی گئی اور اس میں بھس بھر کر جندی شاپور کے دروازے پر لٹکا دی گئی جس کی نسبت سے یہ اب تک "دروازہ مانی" کے نام سے موسوم ہے۔ ۲۷۵ء میں جب کہ وہ ہلاک کیا گیا اس کی عمر ساٹھ سال تھی۔ اس کے بعد اس کے پیروؤں پر مصیبت آئی اور ہزاروں کی تعداد میں بڑی بے رحمی سے مارے گئے۔

مانی نے عیسائیت اور زرتشتیت کے امتزاج سے ایک نیا مذہب نکالا جسے "مانویت" کے نام سے شہرت ملی' زرتشت سے اس کا پہلا اختلاف یہ تھا کہ اس نے اپنے فلسفہ کی بنیاد ثنویت پر رکھی وہ نور و ظلمت اور خیر و شر کو مستقلاً دو علیحدہ ہستیوں پر قیاس کرتا ہے۔ اس کے نزدیک جوہر دو ہیں تاریکی اور روشنی اور انہی دونوں کے ملنے سے کائنات پیدا ہوئی ہے۔ زرتشت اور مانی کی تعلیمات میں دوسرا اختلاف یہ ہے کہ اول الذکر نے خیر و شر کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد اپنے متبعین کو خیر کی طرف بڑھنے کی تلقین کی انہیں باعمل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے محنت پر آمادہ کیا' پیداوار اور نسل کو بڑھانے کی تلقین کی۔ فاقہ کشی' تجرد اور ترک دنیا کی سخت مخالفت کی۔ زرتشت نے نور و ظلمت کی آمیزش کو لازما برا نہیں بتلایا۔

اس کے برعکس مانی نے نور و ظلمت کے اختلاط کو فی نفسہ برا سمجھا ہے اور چونکہ یہ مادی دنیا اسی اختلاط سے بنی ہے لہٰذا یہ بھی بری ہے چنانچہ مانی انسانوں کو تجرد اور ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے۔ اخلاقی تعلیمات میں حضرت موسیٰ کے احکام عشرہ کی طرح اس نے بھی دس احکام بتائے ہیں۔ جو بدھ اور عیسیٰ کی تعلیمات سے اخذ کیے گئے ہیں۔

یعنی بت پرستی نہ کرو' جھوٹ نہ بولو' بخل نہ کرو' کسی جاندار کو ہلاک نہ کرو' زنا نہ کرو' چوری نہ کرو' حیلہ سازی و جادوگری سے بچو' مذہب کے معاملے میں شک کو دل میں جگہ نہ دو' کاموں میں سستی نہ کرو' دن رات میں ۴(یا سات) مرتبہ نماز پڑھو یہ دس احکام عام پیروؤں کے لئے ہیں جنہیں ''ساعون'' یا ''شنندگان''[۴۸] کہا گیا ہے خواص کے لئے مزید تین احکام اور ہیں جن میں شہوات و لذات سے پرہیز' گوشت اور شراب سے پرہیز' اور عورت سے مکمل علیحدگی شامل ہیں خواص کو صدیقون (برگزیدگان)[۴۹] کہا گیا ہے۔

مانی سے سات کتابیں منسوب ہیں۔ جو ایک نئے رسم الخط میں تھیں جن کا بانی مانی خود تھا یہ خط سریانی و فارسی کے بین بین تھا۔ ان کتابوں میں سے اب کوئی بھی موجود نہیں ہے البتہ ان کے اقتباسات مسلم مورخین کی کتابوں اور پہلوی تصانیف میں مل جاتے ہیں۔

ندوی کا خیال ہے کہ مانی کی یہ مذہبی تحریک دراصل ایران کے بڑھتے ہوئے شدید شہوانی رجحان کا ایک غیر فطری اور سخت رد عمل کا نتیجہ تھی۔ ایران صدیوں سے اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھا۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ خونی رشتوں کی بھی ان کے نزدیک حرمت نہ تھی۔ جن خونی رشتوں میں ازدواجی تعلقات' متمدن اور معتدل علاقوں کے باشندوں کے نزدیک ہمیشہ ناجائز' غیر قانونی اور ناپسندیدہ رہے ہیں وہ ایرانیوں کے نزدیک جائز اور قانونی تھے۔ یزدگرد دوئم جس نے پانچویں صدی کے عشرے میں حکومت کی ہے اس نے اپنی بیٹی کو اپنی زوجیت میں رکھا اور پھر قتل کرادیا۔[۵۰] بہرام نے جو چھٹی صدی عیسوی میں حکمران تھا اپنی بہن سے شادی کی تھی۔

معاشرے میں پھیلی ہوئی اسی اخلاقی ابتری کے رد عمل کے طور پر مانی کی مذہبی تحریک سامنے آئی جس نے ترک دنیا اور تجرد کی زندگی پر زور دیا اور نکاح کو حرام قرار دیا تاکہ انسان جلد سے جلد فنا ہوجائے اور یوں ظلمت پر دائمی فتح حاصل کرلے۔

مزدک

ایک اور مذہبی تحریک جو غالباً "مانویت" کے ردعمل کے طور پر سامنے آئی "مزدکیت" ہے مزدک ایرانی الاصل تھا۔ اور اس کے باپ کا نام بامدار تھا۔ ساسانی بادشاہ قباد اول (۴۸۷ء تا ۵۳۱ء) کے عہد میں اس نے اپنی رسالت کا اعلان کیا اس زمانے میں ملک کے اندر امراء اور مذہبی پیشواؤں کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا۔ غالباً اسی بناء پر قباد نے مزدکی مذہب قبول کرلیا۔ بادشاہ کی حمایت حاصل ہوجانے سے ایک طرف تو مزدکیت کو فائدہ پہنچا مگر دوسری طرف خود قباد کو مزدکیت قبول کرنے کی وجہ سے تاج و تخت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ لہٰذا چند سال بعد بعد از خرابی بسیار جب وہ دوبارہ تخت نشینی میں کامیاب ہوا تو اس نے نہ صرف مزدکیوں کی حمایت و سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیا بلکہ ان کے سدباب کے لئے ایک مذہبی کانفرنس منعقد کی جس میں مزدکیوں کے سرکردہ رہنماؤں کو زرتشتی عالموں سے مناظرے کی دعوت دی گئی جس میں مزدکیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا شکست کا اعلان ہوتا تھا کہ سپاہی مزدکیوں پر ٹوٹ پڑے اور ان کا قتل عام شروع ہوگیا۔ مزدکی پیشوا سب کے سب مارے گئے۔ ان میں خود مزدک بھی تھا۔ ان کی سب جائیدادیں ضبط کرلی گئیں۔[ص۵۱]

قباد کے بعد نوشیرواں عادل کی حکومت شروع ہوئی وہ بھی مزدکیوں کا سخت مخالف تھا لیکن دونوں بادشاہوں کی شدید مخالفانہ کارروائیوں کے باوجود مزدکیت کلیتہً ناپید نہ ہوسکی۔ تاریخوں میں ان کے تذکرے ملتے رہے۔ خصوصاً عباسی عہد میں بابک خرمی نے اسی نظریئے کی تبلیغ کرکے ماموں حکومت کو سخت پریشان کیا تھا۔

مزدک کے نظری عقائد مانویت سے ماخوذ تھے اور وہ بھی مانی کی طرح نور و ظلمت دو قدیم جوہروں کا قائل تھا تاہم اس کی تعلیمات کا سب سے اہم حصہ اشتراکیت اور اشتمالیت سے متعلق ہے اس کے مذہب کو اشتراکیت کی ابتدائی صورت سمجھنا چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ تمام ناہمواری، ظلم، حسد، کینہ، حرص اور جنگ و جدل (جو کہ اہرمن کی طرف سے ہے) کا سبب اصلی عورت اور دولت ہے جس پر انسان مالکانہ قبضہ رکھتا ہے۔ ملکیت کا یہ تصور فتنہ و فساد کی جڑ اور عدل و انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے لہٰذا عورت اور دولت کو ذاتی تصرف سے آزاد کیا جائے اور ان پر تمام

لوگوں کا مساوی حق تسلیم کیا جائے۔

مزدک کی یہ تحریک شروع شروع میں مذہبی تھی رفتہ رفتہ سیاسی رنگ اختیار کر گئی۔ قباد نے جب یہ مذہب اختیار کیا تو ان کے حوصلے بڑھ گئے ہر طرف اشتراکیت کا پرچار ہونے لگا نوجوانوں اور عیش پسندوں کی مراد بر آئی جنسی انارکی اور شہوانی بحران بڑھنے لگا۔ "اوباش اور آوارہ مزاج لوگوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور مزدک اور مزدکیوں کے پرجوش ساتھی اور دست و بازو بن گئے۔ عام شہری اس بلائے ناگہانی کا شکار تھے۔ اس تحریک کا اتنا زور ہوا کہ جو چاہتا جس کے گھر میں گھس آتا اور مال و زن پر قبضہ کر لیتا اور صاحب مکان کچھ بھی نہ کر سکتا۔۔۔۔۔۔ نہ باپ اپنے لڑکوں کو پہچان سکتا تھا اور نہ لڑکا اپنے باپ کو۔ کسی کا بھی اپنی کسی ملکیت پر اختیار و قبضہ نہ تھا"۔[۵۲]

معاشرے سے ناموس کا پردہ اٹھ گیا۔ بے غیرتی اور بے حیائی بڑھنے لگی۔ کسانوں نے بھی بغاوتیں برپا کیں رفتہ رفتہ زمینیں غیر آباد ہونے لگیں اور مملکت کو شدید نقصان پہنچا۔ مزدکی تعلیمات کی وجہ سے ایرانی معاشرے میں عورتوں کی حیثیت پر بھی کاری ضرب لگی۔ یوں تو ایرانی تہذیب کے کسی بھی دور میں عورت کی ہمیں کوئی بہت اونچی حیثیت نظر نہیں آتی۔ زرتشتی مذہب میں سگی بہنوں اور بیٹیوں سے شادی جائز تھی۔ بیویوں کی کثرت مذہبا قابل انعام بات تھی۔ بیویوں کے علاوہ لاتعداد لونڈیاں بھی ہوتی تھیں۔ ایرانی جنسی تعلقات کے معاملات میں اپنی مرضی کے سوا کسی قانون کے تابع نہیں تھے۔ ایران میں عورتوں کی نگرانی کے لئے خواجہ سراؤں کو ملازم رکھنے کا دستور قدیم زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ یہ دستور بذات خود شرمناک اور مذموم تھا۔ اس پر مستزاد مزدکی تعلیمات تھیں جس نے معاشرے کے اندر عورتوں کی رہی سہی عزت و تکریم پر آخری کاری ضرب لگا کر دیگر جائیدادوں کی طرح ان کو بھی حصول لذت و منفعت کا ایک ذریعہ بنا دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ساسانیوں نے مادی اعتبار سے ترقیاں کیں، تعمیرات

اور علوم و فنون میں قابل ذکر اضافے کئے۔ اشکانیوں کی طویل طوائف الملوکی کو ختم کر کے ایک منظم و وسیع سلطنت کی بنیاد ڈالی "جس کی وجہ سے ایران کی سیاسی آزادی یعنی اس کی قومی زندگی تو بحال ہو گئی لیکن معاشرتی اور مذہبی زندگی اس حد تک زوال پذیر ہو چکی تھی کہ اس کا احیاء حکمرانوں کے بس میں نہ تھا"۔[6]

ان حالات میں عموماً مذاہب' معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھاتے ہیں لیکن ایران میں اٹھنے والی مذہبی تحریکات مثلاً زرتشت' مانی و مزدک کی تحریکات میں اتنی وسعت و صلاحیت نہیں تھی کہ ایرانی تہذیب کے زوال کو روک سکیں۔ مذہب زرتشت کئی اعتبار سے بہتر اصلاحی تحریک تھی لیکن اس کے ساتھ المیہ یہ تھا کہ ایک صدی سے زیادہ یہ اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہ سکا تھا۔ امیر علی کا خیال ہے کہ "سو سال بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ زرتشتی مذہب نے وہ ساری خرابیاں کوٹ کوٹ کر اپنے اندر بھر لیں جن کا اس نے اپنے عہد طفلی میں مقابلہ کیا تھا۔" (روح الاسلام)

اوراق گذشتہ اس بات پر شاہد ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی تک آتے آتے ایرانی تہذیب کی بنیادیں پوری طرح کھوکھلی ہو چکی تھیں اس کے پاس نوع انسانی کی بقاو سلامتی اور تہذیب نفس کے لئے کوئی پیغام نہیں رہ گیا تو مشیت کے لئے یہ ناگزیر ہو گیا کہ کسی ایسے پیغام کے ساتھ ایک پیغامبر کو بھیجا جائے جو انسانیت کی اصلاح کا کام کر سکے۔

حواشی و حوالہ جات

۱ - دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۳ ص ۲۶۷ (مضمون ایران)

۲ - ایضاً

۳ - سوسا یا سوس یا شوش عیلام کا دار الحکومت تھا اور عیلام عراق کا ایک علاقہ تھا۔

۴ - پروفیسر اے۔ جے۔ آربری' میراث ایران ص ۴ مترجم سید عابد علی عابد' لاہور ۱۹۶۲ء

۵ - امیر علی' سید روح اسلام ص ۳۰

۶ - قدیم مشرق ص ۲۲

۷ - قدیم مشرق ص۱۲۱

۸ - ایضاً

۹ - بدخشانی، مقبول بیگ، تاریخ ایران، لاہور ۱۹۶۷ء جلد اول ص۲۹-۳۰

۱۰ - قدیم مشرق ص ۱۳۳

۱۱ - ایضاً ص ۱۳۴

۱۲ - ایضاً

۱۳ - قدیم مشرق ص۱۳۵

۱۴ - قدیم مشرق ص۱۳۶

۱۵ - The Time Tables of History ص ۸ برنارڈ گرن نیویارک ۱۹۸۲ء برنارڈ گرن زرتشت کی پیدائش ۶۳۰ق - م اور وفات ۵۵۳ق - م بتاتے ہیں۔ بدخشانی زرتشت کی پیدائش ۶۶۰ ق - م اور وفات ۵۸۳ق - م لکھتے ہیں۔

۱۶ - ڈاکٹر ہاگ کے حوالے سے ڈاکٹر محمد اقبال کا کہنا ہے کہ "ایران قدیم کا پیغمبر (زرتشت) دینیاتی نقطہ نظر سے موحد اور فلسفیانہ نقطہ نظر سے ثنویہ تھا۔ (بحوالہ فلسفہ عجم ص ۲۲)

۱۷ - ڈاکٹر محمد اقبال 'فلسفہ عجم' ص ۲۶ مترجم میر حسن الدین کراچی ۱۹۶۹ء

۱۸ - خود زرتشت نے تین شادیاں کیں۔ ان کی اولادوں میں تین بیٹیوں اور بیٹوں کا نام ملتا ہے۔ (بحوالہ قدیم مشرق ۱۳۸)

۱۹ - بدخشانی ص۳۱

۲۰ - اہل پارس کے سات ممتاز خاندان تھے جن میں ایک ہخامنشیوں کا خاندان تھا۔ ہخامنشی پازارگد قبیلہ کا ایک امیرزادہ تھا جس نے اپنے علاقے کے قبائل کو منظم و متحد کیا۔ اہل پارس کے نزدیک وہ بہت قابل احترام تھا۔

۲۱ - تاریخ ایران، جلد اول ص۵۵۷

۲۲ - تاریخ ایران، جلد اول ۱۸۷

۲۳ - حتی فلپ، تاریخ شام، مترجم غلام رسول مہر، طبع اول ۱۹۶۳ء لاہور ص۱۹۰

۲۴ - ایضاً

۲۵ - فلپ، حتی ص ۱۹۳

۲۶ - امیر علی ص ۳۵

۲۷ - تاریخ ایران ص ۳۱۳

۲۸ - ساسان کی اپنی سیاسی و مذہبی حیثیت تھی وہ صوبہ فارس کی ریاست نیسایہ (Nisaya) کے خاندان امراء سے تعلق رکھتا تھا نیز وہ اصطخر کے "آتش کدہ ناہید" (اناہتا) کا موبد بھی تھا۔ اپنی اس سیاسی و مذہبی پیشوائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے۔ اشکانیوں کی طوائف الملوکی کے پیش نظر عروج حاصل کرنا شروع کیا اور اس کے پوتے اردشیر بابکان نے جو باپ اور دادا سے زیادہ حوصلہ مند تھا بالآخر آخری اشکانی بادشاہ کے خلاف کامیاب بغاوت کر دی۔

۲۹ - ۶۵۲ء وہ سال ہے جب یزدگرد قتل ہوا اور ۶۴۲ء وہ سال ہے جب وہ مسلمان فوجوں سے شکست کھا کر چینی ترکستان کی طرف بھاگ گیا۔ یہ حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ تھا جب تین نہایت اہم معرکوں' جنگ قادسیہ ۶۳۵ء (جس کے بعد ساسانیوں کے پایۂ تخت مدائن پر عربوں کا قبضہ ہوگیا۔) جنگ جلولاء ۶۳۷ء اور جنگ نہاوند ۶۴۲ء کے بعد عربوں نے تقریباً پوری سلطنت پر قبضہ کرلیا تھا چنانچہ آخری ساسانی فرمانروا یزدگرد چینی ترکستان میں پناہ گزین ہوا حضرت عثمانؓ کے عہد میں جب عرب فوجوں نے مرو کا رخ کیا تو یزدگرد مایوسی کے عالم میں وہاں سے بھی فرار ہوا اور ترکستان کی سرحد پر ایک لالچی پن چکی والے مرزبان ماھویہ' کے یہاں پناہ لی جس نے جواہرت کی لالچ میں یزدگرد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

۳۰ - قدیم مشرق ص ۱۳۰

۳۱ - قدیم مشرق ص ۱۳۱

۳۲ - کرسٹن سین' تاریخ ایران بعہد ساسانیاں' مترجم محمد اقبال ص ۶۸

۳۳ - ایضاً

۳۴ - شاہین مکاریوس' تاریخ ایران' مصر ۱۸۹۰ء ص ۹۰

۳۵ - ایضاً

۳۶ - تاریخ طبری جلد ۴ ص ۱۳۶

۳۷ - ایضاً ص ۱۱

۳۸ - ایضاً ص ۱۳۴

۳۹ - ایران بعہد ساسانیاں ص ۸۱

۴۰ - تاریخ طبری' جلد ۳ ص ۱۶۱

۴۱ - ندوی ص ۹۵

۴۲ - ایران بعہد ساسانیاں ص ۳۲۴

۴۳ - تاریخ ایران' بدخشانی ص ۵۱۲

۴۴ - ۱۶ ماہ مہر کو جشن مہرگان شروع ہوتا تھا۔

۴۵ - شاہ ولی اللہ حجتہ اللہ البالغہ

۴۶ - قدیم مشرق ص ۱۷۲

۴۷ - فلسفہ عجم میں علامہ اقبال مانی کو نیم ایرانی کہتے ہیں کیونکہ اس کا عیسائی باپ گو کہ ایرانی تھا لیکن ہمدان سے بابل کو ہجرت کر گیا تھا۔ وہیں مانی پیدا ہوا تھا (فلسفہ عجم ص ۳۳)

۴۸ - قدیم مشرق ص ۱۶۰

۴۹ - پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ لفظ "صدیق" کی آرامی شکل شائد (Siddiqai) صدیقے تھی یہی لفظ عربی زبان میں "زندیق" بن گیا جس کو مسلمانوں نے مانویوں کے لئے استعمال کیا ہے (بحوالہ قدیم مشرق ص ۱۶۰)

۵۰ - تاریخ طبری' جلد ۳ ص ۳۸

۵۱ - تاریخ ایران' بدخشانی ص ۳۵۲

۵۲ - امیر علی ص ۳۶

۵۳ - امیر علی ص ۳۶

باب ششم

یونانی تہذیب

کرہ ارض کے شمال مغربی جانب، براعظم یورپ میں واقع یونان ایک جزیرہ نما ہے۔ جس کے تین اطراف بحیرہ روم اور ایک طرف خشکی ہے۔ عہد قدیم میں لفظ یونان محض موجودہ یونان کے لئے ہی نہیں بولا جاتا تھا بلکہ جزائر ایجین، ایشیائے کوچک، صقلیہ اور اطالیہ کی ساحلی نو آبادیاں بھی اپنے آپ کو "ہیلاس" (یونان) کہہ سکتی تھیں کیونکہ یہاں یونانی آباد تھے اور ان علاقوں میں انہی کی زبان و معاشرت جاری وساری تھی۔

ما قبل تاریخ کے عہد میں ہم یونانی تہذیب کی ابتدا سولہ سو سال قبل مسیح سے کر سکتے ہیں۔ یہ تہذیب چودہ سو سال قبل مسیح میں اپنے عروج پر پہنچی اور بارہ سو سال قبل مسیح میں ان پر اس وقت زوال آنا شروع ہوا جب یہاں آریاؤں کا ورود ہوا۔ یونان میں آریاؤں سے قبل جو قوم آباد تھی اسے پیلا سجی (Pelasgi) کہتے ہیں، اس امر میں اختلاف ہے کہ پیلا سجی آریائی تھے یا غیر آریائی بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ نسلاً آریائی تھے جو چند صدی قبل اس خطے میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ پیلا سجیوں کی تہذیب و تمدن کے مطالعہ سے بھی یہی خیال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

پیلا سجی عہد (۱۴۰۰ ق۔م۔ تا ۱۲۰۰ ق۔م) قدیم یونانیوں کی تہذیب کا ابتدائی دور ہے اس عہد میں کچھ قبائل دیہی زندگی گزارتے تھے اور زراعت کرتے تھے جب کہ کچھ قبائل بدویانہ زندگی گزارتے اور موسم و حالات کے اعتبار سے اپنی جائے رہائش بدلتے رہتے ان کی وجہ سے شہری زندگی متاثر ہوتی رہتی۔

ان کسانوں اور چرواہوں کی زندگی نہایت سادہ تھی کئی کئی خاندانوں پر مبنی معاشرے تھے جو سیاسی طور پر سب سے بڑے خاندان کے ماتحت ہوتے تھے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی اعتبار سے سرداری راج تھا۔ دینی اعتبار سے وہ دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ تاہم معبدوں یا بتوں اور شبیہوں کا تصور نہیں تھا۔ عبادت کے دوران خونی و غیرخونی قربانی دی جاتی تھی۔ یونانی پجاری اور کاہن پیش گوئیوں میں ماہر تھے' ایپرس (Epirus) میں ڈوڈونا (Dodona) کا دارالاستخارہ اس وقت دنیا بھر میں مشہور تھا۔

اس کے بعد یہاں آریاؤں کا ورود ہوا وہ مختلف قبائل کی شکل میں مختلف زمانوں میں آکر یہاں مختلف علاقوں میں آباد ہوئے۔ جغرافیائی طور پر یونان متعدد پہاڑیوں کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی وادیوں میں تقسیم ہے لہٰذا نووارد آریاؤں نے مختلف وادیوں میں خودمختار طور پر رہنا شروع کردیا۔ ان نووارد قبائل میں سے ایک اہم قبیلہ "آئی اونین" (Ionians) تھا انہوں نے ایشیائے کوچک کے ساحلی علاقوں پر اپنی آبادیاں قائم کیں اور دوسرے آریائی قبائل کے مقابلے میں تیزی سے تمدن کے مدارج طے کئے کیونکہ یہاں وہ فنیقیوں (کنعانیوں) کے زیراثر رہے۔ فنیقی قوم دو ہزار سال قبل مسیح ان علاقوں میں آباد تھی جو اب فلسطین اور لبنان کے نام سے مشہور ہیں یہ لوگ عصر قدیم کے نہایت بلند حوصلہ تاجر اور سب سے بڑے جہاز راں تھے اور ان کی نو آبادیاں ایک طرف ساحل افریقہ پر تیونس (قرطاجنہ) اور دوسری طرف جزائر یونان' قبرص اور غالباً خاص یونان کے مشرقی ساحلوں پر موجود تھیں انہی سے آئی اونیوں نے تہذیب کی ابجد پڑھی۔ انہی سے فن تحریر سیکھا' اوزان و پیمائش کے طریقوں سے آگاہی حاصل کی اور انہی کے تعلق کی وجہ سے بعض قدیم صناعیاں اور ایشیائی دیوتاؤں کی پرستش یونان میں رائج ہوئی۔

بہرحال متعدد آریائی قبائل کی آمد اور مختلف وادیوں میں بسنے کے بعد شہری ریاستوں کا دور شروع ہوا اور ۸۰۰ ق۔ م میں یہ شہری ریاستیں باقاعدہ مستحکم شکلیں اختیار کرگئیں جہاں جمہوری روح کارفرما تھی ان ریاستوں میں قبائلی عصبیت بدرجہ اتم

موجود تھی لہٰذا یہ آپس میں بر سر پیکار رہتیں۔ اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تمام یونانیوں پر کبھی کوئی واحد قومی سلطنت قائم نہ ہو سکی جس کی وجہ ان کی باہمی عصبیت اور یونان کی جغرافیائی کیفیت کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ارسطو نے جب تمام یونانیوں کی تاریخ مرتب کی (جواب ناپید ہے) تو اسے ڈیڑھ سو سے زائد خودمختار یونانی ریاستوں کے حالات جمع کرنے پڑے جن میں ہمیشہ تغیر و انقلابات ہوتے رہتے تھے۔

۴۰۰ ق۔م میں یونانی تہذیب اپنے عروج پر تھی اور ایتھنز تقریباً پورے یونان کا مرکز قرار پایا لیکن اس کے بعد متعدد وجوہات کی بناء پر اس طاقت میں ضعف پیدا ہونے لگا اور سکندر کی موت (۳۲۳ ق۔م) کے بعد یونانی طاقت مسلسل کمزور ہونے لگی اور ۱۴۶ ق۔م میں یونان بحیرہ روم کی ایک نئی طاقت یعنی رومی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔

تہذیبی اعتبار سے یونانی تاریخ کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱ ۔ افسانوی عہد (Heroic Age) یہ ان کا ابتدائی دور ہے جب وہ پہلے پہل سرزمین یونان میں وارد ہوئے اور مختلف علاقوں میں آباد ہوئے۔ مقامی لوگوں پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد اپنی سرداریاں قائم کیں۔ یہ دور تقریباً دو سو سالوں (۱۰۰۰ ق۔م تا ۸۰۰ ق۔م) پر محیط ہے۔

۲ ۔ تاریخی عہد (Historic Age) یہ سیاسی ارتقاء کا دور ہے اس عہد میں مقامی سرداریوں نے صحیح معنوں میں شہری ریاستوں (City States) کی شکل اختیار کی جہاں مختلف طرز کی حکومتوں کے تجربے کئے گئے یہاں تک کہ انہوں نے جمہوری طرز کی حکومت بھی قائم کی اور جمہوریت کا ایک واضح تصور دنیا کو عطا کیا۔

یونان میں اس طرز کی سینکڑوں ریاستیں قائم تھیں تاہم ایتھنز اور اسپارٹا کی ریاستوں نے سیاسی استحکام کے اعتبار سے جلد ہی دوسری یونانی ریاستوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ اسپارٹا اپنی عسکری صلاحیتوں اور ایتھنز والے اپنے علوم و فنون کی ترقی کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ ان شہری ریاستوں کا رقبہ چند میل سے زیادہ نہیں ہوتا تھا مثلاً

ایتھنز کی ریاست کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ساٹھ میل اور زیادہ سے زیادہ چوڑائی چوبیس میل تھی۔ لیکن یہ ریاستیں بالکل خود مختار تھیں اور ان میں شدید قبائلی عصبیت موجود تھی۔ قومی سطح پر سرداری ایک ایسا مسئلہ تھا جو ان ریاستوں کو باہم نبرد آزما رکھتا تھا یہ جنگیں سالوں مسلسل چلتی رہتی تھیں۔ یونان کی تباہی کے اسباب میں سے ایک سبب انہی ریاستوں کی باہمی جنگ و جدل بھی تھا۔ ان کی دو بڑی ریاستوں ایتھنز اور اسپارٹا کے مابین ۴۳۱ تا ۴۰۴ ق۔م نہایت شدید جنگ لڑی گئی جس میں سسلی سمیت دیگر جزائر اور تقریباً تمام یونانی ریاستوں نے حصہ لیا۔ قومی سربراہی کے لئے لڑی جانے والی یہ جنگ بالآخر بے نتیجہ رہی اور کسی میں بھی اتنا دم نہ رہا کہ قومی راہنمائی کا کام کر سکے۔ فقط دو سالوں بعد پھر سے دونوں ریاستوں کے مابین جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا یہ جنگیں بالآخر فیصلہ کن ثابت ہوئیں اور ایتھنز شکست کے بعد تباہ ہو گیا۔ ایتھنز کی تباہی کے بعد اسپارٹا یونان کی سب سے طاقتور ریاست تسلیم کر لی گئی لیکن اسپارٹا کی طاقت بھی زیادہ عرصہ بحال نہ رہ سکی۔ مقدونیہ کی ریاست تیزی سے ابھری اور فلپ یا فیلقوس ثانی (جو کہ سکندر کا باپ تھا) کے زمانے میں تمام یونانی ریاستوں نے بالآخر مقدونیہ کی سیادت تسلیم کر لی۔

بہرحال ان باہم نبرد آزما یونانی قبائل کے پاس کم از کم دو بنیادیں ایسی تھیں جن کی بناء پر کچھ وقت کے لئے یہ قبائل ایک دوسرے کے قریب آجاتے تھے اس میں سے ایک موقع سورج دیوتا "اپولو" کی عبادت کا تھا اور دوسرا اولمپک تہوار کا۔ سورج دیوتا کی پرستش کے لئے ڈلفی کے مقام پر ایک مندر تعمیر ہوا تھا اور اس کے انتظام اور پوجا کی رسموں کی ادائیگی کے لئے ایک کونسل بنائی گئی تھی اس کونسل میں تمام قبیلوں کے نمائندے شریک ہوتے تھے۔ ان کے باہمی میل ملاپ کا دوسرا موقع اولمپک تہوار مہیا کرتے تھے۔ یہ مقدس تہوار' شہر اولمپیا میں جہاں جیوپیٹر دیوتا کا ایک پرانا معبد تھا' ہر چوتھے سال منایا جاتا تھا اس موقع پر اولمپک کھیل منعقد ہوتے تھے۔ ان اولمپک کھیلوں میں تمام یونانی ریاستیں حصہ لیتی تھیں۔

یونانی وطنیت پر مستحکم ایمان رکھتے تھے۔ جہانیت اور آفاقیت جس کے متعلق کبھی

سقراط اور انکسا غورس[۶] نے اظہار خیال کیا تھا کوئی مقبول خیال نہیں تھا۔ ارسطو (۳۸۷ ق۔م تا ۳۲۲ ق۔م) کا سارا نظام اخلاق یونانی اور غیر یونانی کی تفریق پر مبنی ہے بلکہ ارسطو اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ یونانیوں کے لئے غیر ملکیوں کے ساتھ وہی برتاؤ واجب ہے جو وہ حیوانات کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس محدود طرز فکر اور تنگ نظری کا ان پر اتنا غلبہ تھا کہ جب ایک یونانی فلاسفر نے یہ کہا کہ میری ہمدردیوں کا حلقہ صرف میرے ذاتی وطن تک محدود نہیں بلکہ سارے یونان پر محیط ہے تو لوگ حیرت و استعجاب سے اس کی طرف تکنے لگے[۷]۔

مذہبی اعتبار سے اہل یونان کو اکب پرست بت پرست تھے ان کے دیوی دیوتاؤں کی فہرست ہندی اور ایرانی آریاؤں کی طرح طویل تھی بتوں کو بڑے بڑے مندروں میں نصب کر کے ان کے آگے مراسم بندگی ادا کئے جاتے تھے۔ دیوتا مونث بھی تھے اور مذکر بھی ان میں زن و شوئی بھی تھی۔ ان معبودوں میں بشری کمزوریاں پائی جاتی تھیں۔ ہومر (جس کا تعلق افسانوی عہد سے ہے) کی نظموں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دیوتا انسانی معاملات میں حصہ لیتے تھے' ٹرائے کی جنگ میں بھی وہ شریک ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے بہادروں کی ہمت افزائی بھی کی تھی لیکن ان میں عام انسانی کمزوریاں اور خامیاں بھی پائی جاتی تھیں۔

یونانی ان معبودوں کو خالق کائنات یا مالک کل نہیں سمجھتے تھے۔ خدا کے متعلق ارسطو کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ ایک مقناطیسی[۸] قوت ہے جو تمام اشیاء کو اپنی جانب کھینچتی ہے لیکن در حقیقت نہ وہ خالق ہے اور نہ خلق و خلقت سے اسے کوئی تعلق ہے۔ کشش کا باعث صرف یہ ہے کہ تمام اشیاء اس کی عاشق ہیں۔

یونانیوں میں دیوتاؤں کا تقدس محض اسی قدر تھا جتنا کسی بزرگ شخص کا ہوتا ہے اور اسے چند معمولی مراسم کے ساتھ یاد کرنا اس کی عظمت و تمجید کے لئے کافی تھا پھر ان مراسم میں بھی کھیل تماشے' رقص و موسیقی اور شعر و شاعری کا عنصر غالب رہتا تھا۔ اپولو[۹] دیوتا کے معبد کے اندر اس کی پوجا اور مقابلہ شعر و شاعری و موسیقی لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے۔ "در حقیقت کسی مذہب کے مراسم میں جشن' کھیل اور

تماشوں کی اتنی آمیزش نہیں پائی جاتی جتنی یونانیوں میں اور نہ کسی مذہب میں خوف و دہشت کا عنصر اس قدر قلیل پایا جاتا ہے جتنا یونانیوں میں[10]"۔

یونان میں کاہنوں کا ایک با اثر طبقہ بھی تھا جس کی پیش گوئی پر اہل یونان ایمان رکھتے تھے۔ ڈلفی (Delphi) کا مندر خاص طور پر اہل یونان کا "دارالاستخارہ[11]" تھا جہاں وہ غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لئے چلہ کش ہوا کرتے تھے۔ یونانی مندروں سے ملحق خانقاہیں بھی تھیں جہاں پجاری اور داسیاں رہتی تھیں اور جو صدائے غیبی کے ذریعہ لوگوں کو ان کے معاملات سے متعلق مشورے دیا کرتی تھیں۔

تہذیب کو جو قیمتی سرمایہ اہل یونان نے عطا کیا وہ علمی و فنی کارنامہ ہے۔ یونان نے تہذیب و تمدن کے میدان میں اس وقت قدم رکھا جب وادی دجلہ' فرات' وادی نیل' وادی سندھ اور دریائے زرد کی وادی تہذیب و تمدن کی بہت سی منازل طے کر چکی تھیں۔ مصر فن تعمیر و جاری کو بلند مقام عطا کر چکا تھا۔ نینوا اور بابل علوم و فنون کے زبردست مراکز رہ چکے تھے۔ چین نے فلسفہ و اخلاق میں قابل ذکر اضافے کئے تھے۔ فنیقیوں نے جہاز رانی اور تجارت کو عروج تک پہنچا کر ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے رسم الخط اور حروف کی برامد کے ذریعہ ان کے درمیان علمی ترقی کی بنیادیں فراہم کر دی تھیں۔ گویا مشرق' مغرب کا استاد تھا اور مغرب نے ہونہار شاگرد کی طرح اس میں اضافے کئے تھے۔ غرض یہ سارے تہذیبی مدارج' مختلف قومیں' یونانیوں سے پہلے طے کر چکی تھیں۔ یونان نے ان سے استفادہ کیا اور اپنی علمی ترقی کی بنیادیں ایشیا و افریقہ سے در آمد کیں[12]۔ سب سے پہلے انہوں نے فنیقیوں سے حروف تہجی سیکھے اور "الف" ان کے یہاں الفا (Alpha) اور "ب" بیٹا (Beta) ہو کر یورپ کے دوسرے ملکوں تک پہنچا چنانچہ انگریزی لفظ "الفابٹ" (Alphabet) اسی الفا' بیٹا کی ترکیب سے وجود میں آیا۔ فنیقیوں سے لکھنے کا فن سیکھنے کے بعد انہوں نے ان کے مشہور شہر بیلوس (Babylus) سے کاغذ در آمد کیا اور فن تحریر کو ترقی دی۔

غرض دو سو سال کے اندر انہوں نے علم و فن میں گراں قدر ترقی کی۔ شاعری'

ادب' ڈرامہ کے ساتھ ساتھ فلسفہ وسیاسیات میں ان کے اضافے تسلیم شدہ ہیں۔ یونانیوں نے سائنس کے بعض مضامین کو بھی ترقی دی اور ان سے متعلق اہم کتب تصنیف کیں لیکن یہ کارنامے انہوں نے زیادہ تر اس عہد میں انجام دیئے جب کہ سکندر کی موت کے بعد مصر میں بطلیموسی حکومت قائم ہوئی اور اسکندریہ علوم و فنون کا مرکز بنا۔ ص[۱۳]

یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ یونانی محسوسات کے خوگر اور زبردست مادہ پرست تھے ان میں روحانیت کی بڑی کمی تھی لہٰذا اس تہذیب نے بڑے بڑے سائنس دان و فلاسفر تو پیدا کئے لیکن عابد و زاہد ایک بھی پیدا نہ کیا۔ علوم و فنون کی ترقیاں تمام تر مادی تھیں اور یونانیوں کی یہ ساری علمی کاوشیں ایک خاص در سے کبھی آگے نہیں بڑھیں تاکہ ذہن کی ترقی سے جسم کو نقصان نہ پہنچنے پائے۔

یونانیوں سے زیادہ غالباً کوئی بھی قوم فطرت پرست نہیں تھی۔ اور فطرت پرستی دراصل مادہ پرستی ہی کی ایک شکل ہے۔ وہ زندگی سے کماحقہ حظ اٹھاتے تھے ان کی معاشرتی زندگی میں جسمانی تربیت کھیل تماشوں' رقص و موسیقی اور پلاسٹک آرٹ کو خصوصی اہمیت حاصل تھی' بلکہ ان کی زندگی ہی یہ تھی۔ ظاہری حسن اور تناسب و اعتدال کے بارے میں جتنے حساس قدیم یونانی تھے غالبا اور کوئی قوم نہیں تھی ان کے نزدیک سب سے بڑا معیار خوبصورت اور سڈول جسم تھا۔ خوبصورت چیزوں کی عبادت کرنے کی اس خصوصیت نے ان کی شاعری' موسیقی اور پلاسٹک آرٹ کے ساتھ ساتھ ان کے مذہب' قانون' فلسفہ اور سائنس پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ ص[۱۴]

یونانیوں کی یہ حسن پرستی غیر انسانی' ظالمانہ اور غیر اخلاقی تھی کیونکہ لکرگس کے قانون کے مطابق ناجائز بچے اگر خوبصورت اور متناسب ہوں تو وہ بچے جائز اور قانونی سمجھے جائیں گے۔ لکرگس اسپارٹا کے سن رسیدہ مردوں کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ اپنی جوان بیویوں کو خوبصورت اور ایماندار مردوں سے متعارف کرائیں اور ان سے بچے حاصل کریں تاکہ ریاست کو خوبصورت اور اعلیٰ نسل کے بچے دستیاب ہو سکیں۔ ص[۱۵]
اسی طرح اگر کوئی مرد کسی شادی شدہ خوبصورت عورت کے اچھے چلن اور خوبصورت

بچے دیکھ کر عاشق ہو جائے تو اس کے لئے بھی جائز تھا کہ بے تکلف زن مذکور کو اس کے شوہر سے مانگ لے تاکہ اپنے لئے خوبصورت اور لائق بچے حاصل کر سکے۔[19]

لکرگس بچوں کو والدین کی نہیں بلکہ ریاست کی امانت سمجھتا تھا۔ بچوں کے سلسلہ میں بھی اہل اسپارٹا کا رویہ انتہائی غیر انسانی تھا ان کے یہاں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو سب سے پہلے اسے قبیلہ کے بزرگوں کے سامنے پیش کیا جاتا اگر بچہ صحت مند و توانا ہوتا تو یہ بزرگ اس کی پرورش اور تعلیمات کے سلسلہ میں ہدایات جاری کرتے اور اگر بچہ کمزور یا معذور ہوتا تو وہ اسے کوہ ٹیگٹس (TAYGETUS) کے نزدیک گہرے غار میں پھنکوا دیتے کیونکہ اس کی زندگی سے ریاست اور عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔[11] اسی طرح اسپارٹا کی عورتیں نومولود بچے کو پانی کی جگہ شراب سے نہلاتیں تاکہ اگر بچہ کمزور ہے تو اسی تجربہ کے دوران جاں بحق ہو جائے اور اگر توانا و صحت مند ہے تو بچ جائے۔[1]

مخصوص حالات کی بناء پر حیا' عفت اور عصمت کا کوئی تصور اسپارٹا کی عورتوں میں نہیں تھا لکرگس[19] کا حکم تھا کہ جوان عورتیں اور جوان مرد برہنہ ہو کر جلوسوں میں نکلا کریں اور اسی عالم برہنگی میں مذہبی تقریبات کے موقعوں پر رقص بھی کیا کریں اور ان مردوں کی شجاعت کے گیت گایا کریں جو جنگوں میں کارنامے انجام دیتے تھے اسی طرح ان مردوں پر طنزیہ گیت گایا کریں جو جنگوں میں کارہائے نمایاں انجام نہ دے سکے ہوں۔

اسپارٹا کی نوجوان عورتوں کے برہنہ جلوس نکلا کرتے تھے جس میں وہ ناچتی اور ورزش کرتی تھیں اور مردوں کو تاکید تھی کہ وہ ان برہنہ جلوسوں کا نظارہ کریں تاکہ ان میں شادی کا شوق پیدا ہو۔ جو مرد زیادہ عرصہ شادی نہ کرتا اس کے حقوق شہریت ساقط ہو جاتے تھے۔[20]

اسپارٹا کی عورتوں کو اپنے گھروں پر بہت حد تک مالکانہ حقوق و اختیارات حاصل تھے اس کے برخلاف اہل ایتھنز کے یہاں جو از منہ قدیم کی تمام قوموں سے زیادہ مہذب اور شائستہ تھے بیوی محض ایک اثاثہ تھی جس کی خرید و فروخت کی جا سکتی تھی

بلکہ وصیت کے ذریعے منتقل بھی کیا جا سکتا تھا سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک بری چیز سمجھی جاتی تھی جو محض گھربار چلانے اور بچے پیدا کرنے کے لئے ضروری تھی ایتھنز کے شہریوں کو بے حد و حساب بیویوں کی اجازت تھی چنانچہ ڈیموستھنز (DEMOSTHENES) فخریہ بیان کرتا ہے کہ اس کی قوم میں عورتوں کے تین طبقے تھے جن میں سے دو طبقے نکاحی بیاہی اور نیم نکاحی بیاہی عورتیں مہیا کرتے تھے۔[۲۱]

یہ اس یونانی تہذیب کا ایک اجمالی خاکہ تھا جس کے کھنڈرات پر رومتہ الکبریٰ کی عمارت کھڑی ہوئی۔

حواشی و حوالہ جات

۱ - ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۳ صفحہ ۱۳

۲ - ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ جلد نمبر ۳ صفحہ ۷ - ۳۶

۳ - "آئی اونی" کو اہل مشرق نے بگاڑ کر "یونانی" کر لیا۔ جب کہ یہ یونانیوں کا محض ایک اہم قبیلہ تھا قبائلی تقسیم سے قطع نظر سارے یونانی ہیلنس (Hellences) کہلاتے تھے۔

۴ - ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ جلد نمبر ۳ صفحہ ۱۵۴

۵ - ہارمسورتھ ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۷ ص ۲۳۸۰

۶ - انکسارغورس، ارسطو کا تقریباً ہم عصر اور یونان کے مشہور فلسفیوں میں سے تھا۔

۷ - ندوی ص ۲۴۳

۸ - دین محمد شفیقی عبدی پوری، فلسفہ ہند و یونان، لاہور ۱۹۶۲ء ص ۳۴

۹ - ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۳ ص ۱۷۱

۱۰ - لیکی "تاریخ اخلاق یورپ" مترجم عبدالماجد دریا آبادی ص ۲۷۹

۱۱ - ہسٹورین ہسٹری جلد ۳ ص ۱۷۰

۱۲ - معین الحق تمدنی، طبع اول، کراچی ۱۹۶۶ء جلد ۲ ص ۴۵۴

۱۳ - ایضاً

۱۴ - لکرگس، اسپارٹا کا مشہور قانون دان تھا۔ تاہم اس کے حالات زیادہ معلوم نہیں پلوتارک نے

اس کے قوانین و خیالات پر بنی پورا باب ' مشاہیر یونان و روما ' میں لکھا ہے۔

۱۵ - پلوٹارک "مشاہیر یونان و روما" مترجم سید ہاشمی ص ۱۱۳

۱۶ - ایضاً

۱۷ - پلوٹارک ص ۱۱۳

۱۸ - ایضاً ص ۱۱۴

۱۹ - ایضاً صـ۱۱

۲۰ - ایضاً

۲۱ - امیر علی صـ۲۲۳

باب ہفتم

رومی تہذیب

یونانیوں کے بعد یورپ کی دوسری اہم تہذیب ' رومی تہذیب تھی جو اٹلی کے مشہور شہر' روم' کی طرف منسوب ہے۔ اٹلی اسی جزیرہ نما میں واقع ہے جس میں یونان واقع ہے ۔ اس کے قدیم ترین آباد کار لاطینی (LATIN) سبائن (SABINES) امبری (UMBRIANS) اور لگوری (LIGURIANS) تھے جو اس جزیرہ نما کے شمالی علاقوں (یعنی اٹلی اور گردو نواح) میں آباد تھے۔ ۸۰۰ ق۔م میں یہاں اترسکن (ETRUSCANS) قبائل کا ورود ہوا جن کی وجہ سے ان علاقوں میں شہریت متعارف ہوئی' انہوں نے جلد ہی یہاں کے قدیم آباد کاروں پر غلبہ حاصل کرلیا۔ دوسری طرف یونانیوں اور فینیقیوں کا پھیلاؤ بھی مسلسل جاری تھا ۷۰۰ ق۔م تک سسلی اور اس جزیرہ نما کے جنوبی علاقے ان لوگوں کے قبضے میں آچکے تھے۔

روم جو کہ لاطینیوں کا وطن تھا اترسکن قبائل اور یونانیوں کی آبادیوں کے درمیان واقع تھا۔ یہ شہر رومیولس (ROMULUS) نے ۷۵۳ ق۔م میں آباد کیا تھا پہلے یہاں شہنشاہیت قائم رہی پھر محدود نوعیت کی جمہوریت کا تجربہ کیا گیا۔ دس سال کی جدوجہد کے بعد ۳۹۶ ق۔م میں رومیوں نے اترسکن ششاہیت کو اپنے میں ضم کرلیا۔ تاہم ابھی وہ تہذیب کے کسی اہم مقام پر پہنچے نہیں تھے کہ ایک وحشی قبیلے گال (GAUL) نے روم پر حملہ کرکے ۳۹۰ ق۔م میں اسے بہت حد تک تباہ کردیا۔ اس تباہی کے بعد رومی جلد ہی سنبھلے اور از سرنو اپنی تعمیرو تنظیم کا کام شروع کیا۔ پہلے

انہوں نے گردو نواح کے جنگجو اور شمال کے گالی قبیلے پر اپنی برتری قائم کی۔ پھر وسطی اور شمالی اطالیہ کو ایک مرکز کے تابع کیا یوں ۲۷۰ ق۔م تک اٹلی کا بہت بڑا علاقہ رومیوں کی طاقت کے تحت متحد ہو چکا تھا۔ اس کے بعد رومیوں نے جنوب کی طرف توجہ دی جہاں یونانی نو آبادیاں قائم تھیں اور یونان اس وقت عرصہ زوال میں تھا۔

رومیوں نے اس جزیرہ نما کے یونانی مقبوضات پر قبضہ کیا تو ان کا براہ راست تصادم فینقیوں سے ہوا جن کا دارالحکومت شمالی افریقہ کا سب سے مشہور اور بارونق شہر قرطاجنہ (CARTHAGE) تھا۔ رومیوں اور فینقیوں کے مابین جنگوں کا جو شدید اور طویل سلسلہ شروع ہوا وہ پیونک جنگوں کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے اور یہ سلسلہ قرطاجنہ کی مکمل تباہی پر ختم ہوا رومیوں نے اس خوبصورت تہذیبی مرکز پر قبضے کے بعد اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی سترہ دنوں تک یہ شہر جلتا رہا اور یوں فینقیوں کا یہ مایہ ناز شہر جو اس وقت تہذیب و تمدن کا زبردست مرکز تھا وحشی رومیوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔

تیسری پیونک جنگ کے نتیجے میں بحیرہ روم رومیوں کے حلقہ اثر میں آچکا تھا لہٰذا ان کے لئے یونان فتح کرنا چنداں دشوار نہیں تھا چنانچہ ۱۹۷ ق۔م میں رومی افواج نے مقدونیہ پر چڑھائی کی اور ایک حد تک یونان پر قابض ہو گئے۔

اس کے بعد رومیوں کی استعماریت مسلسل بڑھتی رہی ۶۴ ق۔م میں شام اور ایشائے کوچک رومی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ ۳۱۔۳۰ ق۔م میں جبکہ روم میں باقاعدہ شہنشاہیت قائم ہو چکی تھی انہوں نے مصر پر بھی قبضہ کر لیا اور رومی مملکت کے حدود اسپین و فرانس سے لے کر دریائے فرات تک پھیل گئے۔

باقاعدہ رومی سلطنت یا شہنشاہیت ۳۰ ق۔م میں قائم ہوئی۔ ان کا پہلا بادشاہ آگسٹس تھا (۳۰ ق۔م تا ۱۴ء) یہ رومی سلطنت کم وبیش ڈیڑھ ہزار سال قائم رہی۔ دوسری صدی عیسوی تک آتے آتے رومی سلطنت زمین کے ایک بہت بڑے حصے پر قابض ہو چکی تھی اور تین براعظموں یعنی ایشیا' یورپ اور افریقہ پر اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑ چکی تھی اور اس وقت وہ دنیا کا سب سے متمدن حصہ سمجھی

جاتی تھی۔[2]

قسطنطین اعظم (۳۲۴ء تا ۳۳۷ء) نے نئے شہر قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کی بنیاد رکھی اور سلطنت کا دارالحکومت روم سے قسطنطنیہ منتقل کیا اس کے ساتھ ہی روم کی اہمیت ختم ہونے لگی اور تہذیب وتمدن کا سرمایہ قسطنطنیہ منتقل ہوگیا۔ قسطنطین کی موت کے بعد یہ سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ایک مشرقی رومی سلطنت (ایسٹرن رومن ایمپائر) جسے باز نطینی سلطنت بھی کہتے ہیں' اس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا اور دوسری مغربی رومی سلطنت (ویسٹرن رومن ایمپائر) جس کا دارالحکومت روم تھا۔ روم متعدد وحشی قبائل کے ہاتھوں ۴۷۶ء میں مکمل طور پر تباہ ہوگیا اور مغربی رومی سلطنت صفحۂ ہستی سے مٹ گئی یہ وہ زمانہ تھا جب مشرقی رومی سلطنت جسٹینین کی بادشاہیت میں زندگی و خوشحالی کی نئی سانسیں لے رہی تھی۔[3] یہ باز نطینی سلطنت اس کے بعد بھی کم و بیش ایک ہزار سال اور قائم رہی۔ مسلمانوں سے رومیوں کا تصادم حضرت عمر کے عہد میں ہوا عربوں اور رومیوں کے مابین صدیوں معرکہ آرائی رہی بالآخر عثمانی خلیفہ محمد فاتح نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کرکے اس سلطنت کو ختم کردیا۔[4]

یونانی تہذیب سے متعارف ہونے کے بعد رومی تہذیب کو سمجھنا چنداں دشوار نہیں یونانیوں کے جانشیں رومی ہوئے یہ قوت' مملکت کی تنظیم' سلطنت کی وسعت اور عسکری صفات میں یونانیوں سے بازی لے گئے لیکن علم وفلسفہ' ادب و شاعری اور دیگر تمدنی معاملات میں وہ یونانیوں کے درجہ کو نہیں پہنچ سکے۔ ان چیزوں میں یونانیوں کا سکہ تمام دنیا پر اور فاتح رومیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ یونانی صدیوں کا علمی و فنی پس منظر رکھتے تھے جب کہ اہل روم اپنے دور عسکریت میں تھے ان کی اس علمی پستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ علوم وفنون کے شعبہ میں یونانیوں سے مرعوب رہیں چنانچہ قدیم ترین رومی مورخین ادائے مطلب کے لئے ایک طویل مدت تک یونانی زبان ہی استعمال کرتے رہے۔ یونانیوں کی اس بے محابا تقلید کا رومی نہ صرف اعتراف کرتے تھے بلکہ اس تقلید پر انہیں فخر بھی تھا۔[5]

یونانی علوم و فنون ہی رومیوں کی طرف منتقل نہیں ہوئے بلکہ اس کے ذریعہ یونانی فلسفہ و نفسیات اور ان کی عادات و خصائل بھی رومیوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ اسی بناء پر رومیوں کو بجا طور سے یونانیوں کا جانشیں کہا جاتا ہے یوں بھی رومی اپنی مغربی فطرت و مزاج کی وجہ سے فطری خصوصیات میں یونانیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔

جہاں تک رومیوں کے سیاسی نظام کا تعلق ہے وہاں شہنشاہت تھی جس معاشرہ کا مزاج شاہانہ ہوتا ہے اس کی چند خصوصیات ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ رعایا بادشاہ کی شخصیت میں غلو کرنے لگتی ہے اور اس کو اوتار سمجھ لیتی ہے چنانچہ رومیوں کا بھی عام عقیدہ یہ تھا کہ قیصر صفات الوہیت کا مالک ہے۔ شہنشاہت کی دوسری بڑی خصوصیت مادہ پرستی ہوتی ہے۔ بے جا تکلفات و تعیشات اور شاہانہ زندگی کے تمام تر لوازمات نے رومی معاشرے کو بھی بہت پیچیدہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

رومی معاشرہ واضح طور پر تین طبقات میں بٹا ہوا تھا پہلا طبقہ امراء دوسرا طبقہ عوام کا اور تیسرا طبقہ زرعی مزدوروں اور غلاموں کا تھا "رومیوں کے یہاں اولین ایام سے غلامی چلی آرہی تھی غلام خواہ ملکی ہوں خواہ غیر ملکی جنگ میں ہاتھ آئے ہوں یا خریدے گئے ہوں، خالی خولی مال و اسباب سمجھے جاتے تھے۔ ان کے آقاؤں کو ان کی موت و زندگی کا اختیار تھا۔ بہر حال اس تدریجی اصلاح کی بدولت جس نے بارہ تختیوں (The Twelve Tables) کے فرسودہ قوانین کو ہیڈرین (Hadrian) کے جامع ضابطہ قوانین میں تبدیل کیا غلاموں کی حالت قدرے بہتر ہو گئی لیکن ان تبدیلیوں کے باوجود جو رومی شہنشاہوں کی انسان نوازی یا دانشمندی نے پرانے قوانین میں کیں، غلام کا وجود جسمانی کلیتہً مالک کی مرضی کے مطابق ہوتا تھا۔ سلطنت کے ہر ذی اقتدار شخص کے یہاں ہزاروں غلام تھے۔ جنہیں ذرا ذرا سے قصور پر اذیت پہنچائی جاتی تھی اور کوڑے لگائے جاتے تھے۔[۲] "

صرف یہی نہیں کہ رومی معاشرے میں غلام تمام سیاسی، معاشی اور عام شہری حقوق سے بھی ہمیشہ محروم رہا بلکہ افسوسناک بات یہ تھی کہ بعض اوقات محض تفریح

طبع کے لئے امراء انہیں آپس میں لڑوا کے مروا ڈالتے تھے۔ یہ کھیل اس طرح کھیلا جاتا تھا کہ آقاؤں کی ضیافت طبع کے لئے کچھ غلاموں کو تلواریں اور نیزے دے کر ایک اکھاڑے میں دھکیل دیا جاتا تھا اکھاڑے کے چاروں طرف تماش بینوں کے لئے نشستیں بنی ہوتی تھیں جن پر غلاموں کے آقا اور بسا اوقات خود شہنشاہ روم رونق افروز ہوتا تھا۔ کھیل شروع ہوتا تو غلام تلواریں اور نیزوں سے ایک دوسرے پر پل پڑتے یہاں تک کہ بالا خران کا قیمہ بن جاتا۔ جو خوش قسمت موت کے اس کھیل سے زندہ بچ جاتے وہ فاتح سمجھے جاتے اور انہیں دل کھول کر داد دی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ غلاموں کو رومی معاشرے کے کسی بھی طبقے کی اخلاقی حمایت حاصل نہیں تھی۔ رومی استعمار کی حرص وہوس کے لئے، سامان عیش و عشرت فراہم کرنے کی خاطر، غلاموں کے ریوڑ دن بھر کھیتوں میں جتے رہتے تھے۔ کام کے اوقات میں انہیں بیڑیاں پہنادی جاتی تھیں تاکہ وہ اپنے نگرانوں کی آنکھ بچاکر نکل نہ بھاگیں۔ ان پر بے تحاشہ کوڑے برسائے جاتے تھے کیونکہ ان کا آقا یا مقامی کارکن انہیں ستانے اور اذیت دینے میں لذت محسوس کرتا تھا۔ شام کو جب کام ختم ہوجاتا تو دس دس، پچاس پچاس کی مختلف ٹکریوں میں بانٹ کر مویشیوں کی طرح انہیں غلیظ، بدبودار اور چوہوں اور کیڑوں مکوڑوں سے پٹے ہوئے باڑوں میں بند کردیا جاتا تھا اس حالت میں بھی ان کے ہاتھ پاؤں بیڑیوں سے آزاد نہیں ہوتے تھے۔ مویشیوں کو تو کھلے اور وسیع باڑوں میں رکھا جاتا تھا مگر یہ بدنصیب لوگ زندگی کی اس سہولت سے بھی محروم تھے، کھانے کے لئے انہیں صرف اتنا دیا جاتا تھا کہ ان کا رشتہ جسم و جاں برقرار رہے اور وہ اپنے آقاؤں کے لئے کام کرتے رہیں۔[۸]

ان حالات میں عیسائیت جب روم میں آئی تو غلامی کے ادارہ میں ایک معمولی سی تبدیلی یہ آئی کہ اس غلام کو آزادی عطا کی گئی جو راہبانیت اختیار کرلے بشرطیکہ تین سال تک اس کی ملکیت کا کوئی دعویٰ نہ کرے۔ اس ایک بات کے علاوہ غلامی کا دور دورہ اسی طرح رہا جیسا کہ عہد مشرکیت میں تھا۔ رومی معاشرہ میں غلام اور لونڈی کی باہمی شادی قانوناً تسلیم نہیں کی جاتی تھی جب کہ غلام مرد کی شادی آزاد عورت سے

اور آزاد مرد کی شادی غلام عورت سے قطعاً ممنوع تھی۔ اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام سے شادی کر لیتی تو اس کے لئے سزاؤں میں سے ایک سزا یہ تھی کہ وہ قتل کر دی جائے اور غلام کو زندہ جلا دیا جائے۔ اس کا نتیجہ تھا غیر محدود جاریہ بازی جس پر کلیسائی منصب دار بھی کاربند تھے۔ [ص ۹]

ایک اور تہذیبی بے اعتدالی جو رومی معاشرے میں محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ پیشوں کی تقسیم ذات بندی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ ہر پیشہ موروثی بن گیا تھا اور قانونی طور پر یہ بات طے کر دی گئی تھی کہ کوئی شخص اپنا موروثی پیشہ کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا معاشرہ غیر متحرک ہو گیا۔ باپ دادا کا پیشہ اختیار کرنے کی مجبوری نے لوگوں کو لکیر کا فقیر بنا کر ان کی ذہنی اپج اور کسب کی صلاحیت کو مضمحل کر دیا۔ [ص ۱۰]

حضرت عیسیٰ

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تیسری صدی عیسوی تک رومیوں کا غالب مذہب شرک و بت پرستی ہی تھا ہر چند کہ سلطنت روما کے قیام کے ابتدائی سالوں میں ہی حضرت عیسیٰ کا ظہور ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت قرآن مجید کے مطابق حضرت آدمؑ کی طرح مروجہ طریقے سے ہٹ کر ہوئی یہ بغیر واسطہ پدری کے عالم وجود میں آئے۔ [ص ۱۱] ان کی والدہ مریم بنت عمران نہایت عابدہ، زاہدہ اور صالح خاتون تھیں چنانچہ اسی نیکی اور پارسائی کی وجہ سے انہیں اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کی عورتوں میں سے بطور خاص منتخب فرمایا[۱۲] اور انہیں بغیر کسی ظاہری واسطے کے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے ایک نبی کی ماں بننے کی سعادت بخشی۔ [ص ۱۳]

حضرت عیسیٰ کی ولادت بیت المقدس سے چند میل کے فاصلے پر کوہ ساعیر کے دامن میں ہوئی۔ یہ جگہ بیت اللحم کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد حضرت مریم بادشاہ وقت ہیرودیس (Herediag) کے خوف سے زیادہ وقت فلسطین میں نہیں رہیں اور مصر کے کسی مقام پر چلی گئیں اور حضرت عیسیٰ نے ابتدائی ۱۲ سال یہیں

گزارے پھر واپس بیت المقدس آ گئے۔ [14]

۳۰ سال کی عمر میں ان پر وحی کا نزول ہوا جس کے بعد حضرت عیسیٰ نے دعوت و تبلیغ کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے لوگوں کو شرک و بدعات سے روکا اور توحید کی دعوت دی۔ [15] توحید کے علاوہ ان کی تعلیمات کا اہم حصہ رسالت اور معاد سے متعلق تھا گو کہ حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے انجیل عطا فرمائی تھی مگر احکام و دین کے اعتبار سے وہ موسوی شریعت یعنی احکام توراۃ کے پابند تھے۔ [16]

حضرت عیسیٰ کی نبوت کا زمانہ بڑا مختصر تھا یعنی تقریباً ڈھائی یا تین سال اس وقت دنیا میں ہر طرف ظلم و جہالت کا دور دورہ تھا۔ خود اہل کتاب یعنی یہودی بہت سی خرابیوں میں مبتلا تھے صدیوں کے ذہنی و علمی جمود نے ان کو علمی اعتبار سے مکمل طور پر فقیر بنا دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ کی بعثت کے وقت یہودیوں کے مندرجہ ذیل گروہ تھے۔ [17]

۱ ۔ صدوقی : ان کا کہنا تھا کہ انسان کے نیک اور برے اعمال کا ثمرہ اسی دنیا میں مل جاتا ہے نہ کہ آخرت میں۔

۲ ۔ فریسی (Pharisees) : یہ لوگ رہبانیت کو ذریعہ نجات قرار دیتے تھے مگر پھر ترک دنیا میں بھی بد عملی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔

۳ ۔ کاہن : ان لوگوں نے مذہبی عبادات کی ادائیگی میں خلوص و للہیت کو ختم کر کے اس کی جگہ دنیاداری کو رواج دے رکھا تھا۔

۴ ۔ احبار : یا فقیہ ' یہ مذہب کے اجارہ دار بن گئے تھے جس چیز کو چاہتے حرام اور جس کو چاہتے حلال قرار دے دیتے' اس وقت دینی و علمی پستی کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے ہیکل سلیمانی کو تجارتی منڈی بنایا ہوا تھا اور خود مذہب بھی ایک تجارت بن گیا تھا۔

حضرت عیسیٰ کی تعلیمات سے یہودی علماء کو اپنی مذہبی سیادت خطرے میں نظر آنے لگی جس کی وجہ سے وہ حضرت عیسیٰ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے چند ہی دنوں میں حضرت عیسیٰ کے خلاف مخالفت کا طوفان شدت اختیار کر گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ جس قصبے یا شہر کا رخ کرتے تھے انہیں وہاں سے نکال دیا جاتا تھا۔ انہی دنوں میں حضرت عیسیٰ کی تعلیمات سے ان کے حواریوں کا ایک گروہ وجود میں آ چکا تھا۔ حضرت

عیسیٰ کے یہ ابتدائی شاگرد نہایت مخلص اور پاکباز تھے ان میں زیادہ تر نچلے طبقے کے لوگ تھے مگر دینی ثقاہت و وجاہت کے اعتبار سے ان کا درجہ بڑا تھا۔

بہر حال حضرت عیسیٰ کے خلاف دشمنوں نے رومی گورنر پیلاطیس (Pontsm pilate) کو اسقدر ابھارا کہ وہ حضرت عیسیٰ کو پھانسی دینے پر آمادہ ہو گیا اور رومیوں کی اس وقت کی اخلاقی کجروی اور پستی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قومی تہوار کے موقع پر جب حکومت کی طرف سے رومیوں سے استفسار کیا گیا کہ آج کے دن برابا ڈاکو یا مسیح میں سے کس کو پھانسی دی جائے تو انہوں نے یک زبان ہو کر اس وقت کے معاشرے کے سب سے صالح شخص عیسیٰ کا نام تجویز کیا ---- لیکن قرآنی نقطہ نظر سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو اس موقع پر دشمنوں کے ہاتھوں میں پڑنے سے بچا لیا اور ان کی جگہ کسی اور شخص کو مسیح سمجھ کر پھانسی دے دی گئی۔ [ص ۱۸]

حضرت عیسیٰ کے اٹھ جانے کے بعد یہ مذہب قائم تو رہا لیکن تیسری صدی عیسوی تک رومیوں کا غالب مذہب شرک و بت پرستی ہی تھا اور یونانیوں کی طرح ان کے بھی متعدد معبود تھے جن کی پرستش کے لئے بڑے بڑے مندر تھے۔ تاہم رومیوں نے ان دیوی دیوتاؤں کو سیاست اور امور دنیا سے الگ تھلگ رکھا تھا چنانچہ رومی مندروں میں تو ان کی پوجا کرتے اور تھیٹروں میں ان کا تمسخر اڑاتے۔ یہی نہیں بلکہ ان کا مذہبی جذبہ اس قدر سرد پڑ چکا تھا کہ وہ بعض اوقات دیوتاؤں کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے چنانچہ جب اغسطس (Augustus) کا بیڑہ غرق ہو گیا تو اس نے غصے میں آ کر نیپچون (Naptune) جو کہ سمندروں کا دیوتا تھا' کے بت کو مسمار کر دیا اور جب جرمینکس (Jermanicus) کا انتقال ہوا تو لوگوں نے دیوتاؤں کی قربان گاہ پر خوب پتھراؤ کیا۔ [ص ۱۹]

یہ شرک و بت پرستی رومیوں کی اصلاح نفس میں بری طرح ناکام رہی لہٰذا اس میں شک نہیں کہ جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت روما انتہائی ترقی پر فائز ہو جانے کے باوجود مذہبی اور عمرانی اعتبار سے فساد کے درجہ اخیر تک پہنچ چکی تھی۔

اخلاقی انحطاط کی ایک خطرناک علامت یہ تھی کہ ان کے درمیان شادی ایک بے معنی سی چیز ہو گئی تھی جب کہ قوانین مملکت کی تائید حاصل کر کے داشتہ بازی ایک ایسا ادارہ بن گئی تھی جو مراعات خاص کا مستحق تھا[۲۰]۔ اکثر لوگ شادی کرنا ہی پسند نہیں کرتے تھے اور جو کر لیتے تھے وہ صاحب اولاد ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اسقاط حمل' ضبط تولید اور نوزائیدہ بچوں کو ہلاک کر دینا ان کے معاشرہ میں عام تھا یہی وجہ ہے کہ جب آبادی کم ہونے لگی تو حکومت نے قانون کے ذریعہ نسل کشی کو روکنے کی کوششیں شروع کیں اور صاحب اولاد لوگوں کو محصولات کی معافی اور ملازمتوں میں ترقی کی سہولتیں دیں مگر یہ کوششیں بھی بہرحال ناکام رہیں اور رومی نسل' روم سے گویا ناپید ہو گئی۔[۲۱]

رومی معاشرے میں بیویوں کی حالت بھی زیادہ خوشگوار نہیں تھی پہلی بیوی کے سوا کسی بیوی کو قانونی حقوق حاصل نہیں تھے۔ ان حقوق سے محروم بیویوں کے بچے بھی جائز نہیں سمجھے جاتے تھے اور وہ اپنے باپ کی جائیداد میں سے ایک حصہ کے بھی حقدار نہیں ہوتے تھے اور سماج میں ذات پات سے خارج شمار کئے جاتے تھے[۲۲] اونچے طبقے کے مرد اگر نچلے طبقے کی عورت سے شادی کرتے تو شرائط نکاح میں سے ایک شرط یہ ہوتی تھی کہ اولاد کو کوئی حق وراثت نہیں پہنچے گا۔ ایسی شادیوں کی علامت یہ ہوتی تھی کہ دولہا اپنا بایاں ہاتھ دلہن کو تھما دیتا تھا گویا ہونے والی اولاد کو وراثت کا حق نہیں ہو گا۔[۲۳]

اہل روما کی عیش پرستی اور عشرت پسندی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ظالمانہ اور انسانیت سوز تفریحات کے بھی عادی ہو گئے تھے۔ انسانوں کو جانوروں سے لڑوانا' زیردستوں کو شمشیرزنی کا تختہ مشق بنانا اور بھوکے شیروں کے آگے غلاموں کو ڈال کر حیات و موت کی کشمکش کا منظر دیکھنا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ اس طرح کے وحشیانہ تماشوں کے لئے سالانہ تعطیلیں ہوا کرتی تھیں اور میلے لگا کرتے تھے جن میں لوگوں کا اژدھام ہوتا تھا۔

تاریخی روایت ہے کہ (پہلی صدی عیسوی میں) جب پومپی آئی کا کوہ آتش فشاں پھٹا ہے تو دن کا وقت تھا اور لوگ ایمفی تھیٹر میں (جہاں بیس ہزار انسانوں کی گنجائش تھی) بیٹھے ہوئے درندوں کو زندہ انسانی جسموں کو اپنے پنجوں اور دانتوں سے نوچتے اور

چیرتے پھاڑتے دیکھ رہے تھے اس ظالمانہ لہو و لعب کی عین مشغولیت میں زلزلہ آیا اور آگ آسمان سے برسنا شروع ہوئی۔ کچھ لوگ جہاں بیٹھے تھے اور لیٹے تھے وہیں جل کر بھسم ہو گئے۔ کچھ باہر نکلے تو زبردست ہجوم اور گھپ اندھیرے میں کچل کر مر گئے' کچھ خوش نصیب تھے جنہوں نے کشتیوں اور جہازوں میں بھاگ کر جان بچائی۔ یہ شہر اٹھارہ سو سال تک دنیا کے نقشہ سے غائب ہو گیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں اس کی کھدائی ہوئی تو شہر مٹی کی تہوں کے نیچے سے نشان عبرت بنا نکلا۔[۲۴]

رومیوں کی تاریخ میں ایک بڑا انقلاب انگیز واقعہ عیسائیت کا سلطنت روما' میں سرکاری مذہب کی حیثیت اختیار کرنا ہے۔ قسطنطین جو کہ ایک نئے دار الحکومت ایک نئی حکمت عملی اور ایک نئے مذہب کے ساتھ حکمران ہوا[۲۵] (۳۲۳ء تا ۳۳۷ء) اور چونکہ اسے تخت و تاج عیسائیوں کی سرفروشی' فداکاری اور زبردست قربانیوں سے ہاتھ آیا تھا لہٰذا اس نے عیسائیوں کو اس کا پورا صلہ دیا اور مسیحیت کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہوئی لیکن درحقیقت یہ واقعہ مذہب عیسوی کے لئے بڑا ہی نامبارک ثابت ہوا کیونکہ دنیا دار لوگ جنہیں مذہب کی ذرہ برابر پرواہ نہ تھی دنیا کمانے کی خاطر مسیحیت کے سب سے زیادہ جوشیلے حامی بن گئے۔ چونکہ وہ صرف نام کے عیسائی تھے اور ان کے باطن میں وہی شرک اور بت پرستی کے اعتقادات موجزن تھے لہٰذا ان کے اثر کی وجہ سے عیسائیت میں بھی بت پرستی اور شرک کے عناصر کی آمیزش شروع ہو گئی۔

قسطنطین خود بھی اخلاقی طور پر مضبوط کردار کا آدمی نہیں تھا لہٰذا اس نے بھی اس منافقانہ طرز عمل کے سدباب کے لئے کچھ نہیں کیا خود اس نے اپنی زندگی کے آخری سال میں کہیں جا کر ان مذہبی مراسم کی پابندی شروع کی جن پر عمل کرنے کی کلیسا ہدایت کرتا ہے۔[۲۶] قسطنطین کو اپنا ذاتی فائدہ بھی اسی میں نظر آیا کہ جہاں تک ہو سکے بت پرستوں اور عیسائیوں میں یگانگت اور ارتباط پیدا کیا جائے اور تو اور راسخ العقیدہ عیسائیوں تک کو اس حکمت عملی سے چنداں اختلاف نہ تھا۔ اپنے مذہب کی توسیع و اشاعت کے شوق میں کلیسا ہر اس برائی کو اپنے دائرے میں داخل کرتا چلا گیا جو عام

لوگوں میں مقبول تھی۔ قدیم معبودوں کی جگہ مریم و مسیح کے بت پوجے جانے لگے۔ قدیم زمانے کے تعویذ گنڈے' عملیات' فال گیری و غیب گوئی' جن بھوت بھگانے کے عمل سب عیسائی درویشوں نے شروع کر دیئے۔ اسی طرح چونکہ عوام اس شخص کو خدا رسیدہ سمجھتے تھے جو گندہ اور ننگا ہو اور کسی بھٹ یا کھوہ میں رہے اس لئے عیسائی کلیسا میں ولایت کا یہی تصور مقبول ہو گیا۔

لہذا بت پرستی اور مسیحیت کا جو معجون مرکب تیار ہوا اس میں سے مسیحی روح اور حسن نکل چکا تھا اور اس لائق نہ تھا کہ رومیوں کی بر سر انحطاط سیرت و اخلاق کو سنبھال سکے۔ اس پر مستزاد یہ کہ عیسائیت نے رہبانیت کی بدعت نکالی جس نے رومی تہذیب و تمدن کو ابتری کے دہانے تک پہنچا دیا۔

رہبانیت

حضرت عیسیٰ کے بعد دو سو سال تک رہبانیت کا پتہ نہیں چلتا البتہ ابتداء سے ہی مسیحیت میں اس کے جراثیم پائے جاتے تھے۔ ترک و تجرید کو اخلاقی آئیڈیل قرار دینا اور درویشانہ زندگی کو شادی بیاہ اور دنیاوی زندگی کے مقابلے میں اعلیٰ و افضل سمجھنا ہی رہبانیت کی بنیاد ہے اور یہ دونوں چیزیں عیسائیت میں ابتدائی زمانہ سے ہی پیدا ہو گئی تھیں پھر اسی چیز نے تیسری صدی تک پہنچتے پہنچتے ایک فتنے کی شکل اختیار کر لی۔

اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اس مشرک معاشرہ میں شہوانیت' بدکرداری اور دنیا پرستی جس شدت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی اس کا توڑ کرنے کے لئے عیسائی علماء نے اعتدال کی راہ اختیار کرنے کے بجائے انتہا پسندی کی یہ دوسری راہ اختیار کی۔

رہبانیت کے فروغ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عیسائیوں کے پاس دین کی سرحدیں متعین کرنے کے لئے کوئی مفصل شریعت اور کوئی واضح سنت موجود نہ تھی۔ شریعت موسوی کو وہ چھوڑ چکے تھے اور تنہا انجیل کے اندر کوئی مکمل ہدایت نامہ نہ پایا جاتا تھا۔ اس لئے مسیحی علماء کچھ باہر کے فلسفوں اور طور طریقوں سے متاثر ہو کر اور کچھ خود اپنے رجحانات کی بناء پر طرح طرح کی بدعتیں دین میں داخل کرتے چلے

گئے۔ رہبانیت بھی انہی بدعتوں میں سے ایک تھی' مسیحی علماء نے اس کا فلسفہ اور اس کے طریق کار بدھ بھکشوؤں' ہندو جوگیوں' قدیم مصری فقراء' ایرانی مانویوں اور افلاطون اور فلا طینوس کے پیرو اشراقیوں سے اخذ کیں۔ اور اسی کو روحانی ترقی کا ذریعہ قرار دیا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں میں رہبانیت کا آغاز مصر[۲۸] (جو اس وقت رومی سلطنت کا صوبہ تھا) سے ہوا اور اس کا بانی سینٹ انتھنی (ST.Anthony) تھا (۲۵۰ء تا ۳۵۰ء) جسے پہلا مسیحی راہب قرار دیا جاتا ہے اس نے فیوم کے علاقہ میپیہ کے مقام پر (جو اب دیر المیمون کے نام سے معروف ہے) پہلی خانقاہ تعمیر کی۔ عیسائیوں میں رہبانیت کے بنیادی قواعد اس کی تحریروں اور ہدایات سے ماخوذ ہیں۔ اس آغاز کے بعد یہ سلسلہ مصر میں سیلاب کی طرح پھیل گیا اور جگہ جگہ راہبوں اور راہبات کے لئے خانقاہیں قائم ہو گئیں جن میں سے بعض میں تین تین ہزار راہب بیک وقت رہتے تھے۔ مصر کے بعد یہ سلسلہ شام و فلسطین اور افریقہ اور یورپ کے مختلف علاقوں میں پھیلتا چلا گیا یہاں تک کہ چرچ نے رہبانیت کو باقاعدہ طور پر قبول کر لیا۔ اس رہبانیت میں سخت ریاضتوں اور نت نئے طریقوں سے اپنے جسم کو شدید اذیت پہنچائی جاتی۔ اس سلسلہ میں ہر راہب دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ اسکندریہ کا سینٹ مکاریوس ہر وقت اپنے جسم پر ۸۰ پونڈ کا بوجھ اٹھائے رکھتا تھا۔ چھ مہینے تک وہ ایک دلدل میں سوتا رہا اور زہریلی مکھیاں اس کے برہنہ جسم کو کاٹتی رہیں۔ اس کے مرید سینٹ یوسیبیوس نے اس سے بھی بڑھ کر ریاضت کی وہ ایک سو پچاس پونڈ کا بوجھ اٹھائے پھرتا تھا اور تین سال تک ایک خشک کنویں میں پڑا رہا۔[۲۹]

سینٹ سابیوس صرف وہ مکئی کھاتا تھا جو مہینہ بھر پانی میں بھیگ کر بدبودار ہو جاتی تھی۔ سینٹ بیساریون چالیس دن تک خاردار جھاڑیوں میں پڑا رہا اور چالیس سال تک اس نے زمین کو پیٹھ نہیں لگائی۔ سینٹ پاخومیوس نے پندرہ سال اور ایک روایت کے مطابق پچاس سال زمین کو پیٹھ لگائے بغیر گزار دیئے۔ ایک ولی سینٹ جان تین

سال تک عبادت میں کھڑا رہا۔ اس پوری مدت میں وہ نہ کبھی بیٹھا' نہ لیٹا' آرام کے لئے بس ایک چٹان کا سہارا لے لیتا تھا اور اس کی غذا وہ تبرک تھا جو ہر اتوار کو اس کے لئے لایا جاتا تھا۔ [صنا۳]

سینٹ سیمون اسٹائلٹ (۳۹۰ء تا ۴۴۹ء) جو عیسائیوں کے اولیائے کبار میں شامل ہوتا ہے۔ ہر ایسٹر سے پہلے پورے چالیس دن فاقہ کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ پورے ایک سال تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہا۔ بسا اوقات وہ اپنی خانقاہ سے نکل کر ایک کنوئیں میں جا رہتا تھا آخر کار اس نے شمالی شام (شام اس وقت سلطنت روم کا صوبہ تھا) کے قلعہ سیمان کے قریب ساٹھ فیٹ بلند ایک ستون بنوایا۔ جس کا بالائی حصہ صرف تین فیٹ کے گھیر کا تھا اور اوپر کٹہرا بنا دیا گیا تھا اس ستون پر اس نے پورے تیس سال گزار دیئے۔ دھوپ' بارش' سردی گرمی سب اس پر سے گزرتی رہتی تھیں اور وہ کبھی ستون سے نہیں اترتا تھا۔ اس کے مرید سیڑھی لگا کر اسے کھانا پہنچاتے اور اس کی گندگی صاف کرتے۔ پھر اس نے ایک رسی سے اپنے آپ کو اس ستون سے باندھ لیا یہاں تک کہ رسی اس کے گوشت میں پیوست ہو گئی گوشت سڑ گیا اور اس میں کیڑے پڑ گئے۔ جب کوئی کیڑا اس کے پھوڑوں سے گر جاتا تو وہ اسے اٹھا کر پھر پھوڑوں میں ہی رکھ لیتا اور کہتا کھا جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے۔ مسیحی عوام دور دور سے اس کی زیارت کے لئے آتے تھے۔ جب وہ مرا تو مسیحی عوام کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ عیسائی ولی کی بہترین مثال تھا۔ [صنا۳]

انتہادرجہ کی جسم کشی کے ساتھ ساتھ رہبانیت کی دوسری خصوصیت گندا اور غلیظ رہنا تھا۔ نہانا یا جسم کو پانی لگانا راہبوں کے نزدیک خدا پرستی کے خلاف تھا۔ سینٹ انیتھنی نے مرتے دم تک کبھی اپنے پاؤں نہیں دھوئے۔ سینٹ ابراہام جب سے داخل مسیحیت ہوا پورے پچاس سال اس نے نہ منہ دھویا نہ پاؤں۔ ایک مشہور راہبہ کنواری سلویا نے عمر بھر اپنی انگلیوں کے سوا جسم کے کسی حصے کو پانی نہیں لگنے دیا۔ ایک کانوینٹ کی ایک سو تیس راہبات کی تعریف میں لکھا ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے پاؤں نہیں دھوئے اور غسل کا نام تو سن کر ہی ان کے بدن پر لرزہ چڑھ جاتا تھا۔

اس رہبانیت کی وجہ سے رومی معاشرے میں ازدواجی زندگی عملاً حرام ہو کر رہ گئی تھی۔ رہبانیت کی رو سے تجرد سب سے بڑی اخلاقی قدر تھا۔ لہٰذا راہب کے لئے ضروری تھا کہ وہ شادی کرنا تو درکنار عورت کی شکل تک نہ دیکھے اور اگر پہلے سے شادی شدہ ہو تو بیوی کو چھوڑ کر نکل جائے۔ مردوں ہی طرح عورتوں کے دل میں بھی یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ اگر وہ آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتی ہیں تو ہمیشہ کنواری رہیں اور اگر شادی شدہ ہوں تو اپنے شوہروں سے الگ ہو جائیں۔ سینٹ جیروم جیسا ممتاز مسیحی عالم کہتا ہے کہ جو عورت مسیح کی خاطر راہبہ بن کر ساری عمر کنواری رہے وہ مسیح کی دلہن ہے اور اس عورت کی ماں کو خدا یعنی مسیح کی ساس (Mother - in - low of God) ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ایک اور مقام پر سینٹ جیروم کہتا ہے کہ "عفت کی کلہاڑی سے ازدواجی تعلق کی لکڑی کو کاٹ پھینکنا سالک کا اولین مقام ہے"۔[۳۲] ان تعلیمات کی وجہ سے خوشگوار ازدواجی زندگی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی تھی اور چونکہ مسیحیت میں طلاق و تفریق کا راستہ بند تھا اس لئے نکاح میں رہتے ہوئے ہی میاں بیوی ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے۔

کلیسا کا نظام تین صدیوں تک ان انتہا پسندانہ تصورات کی کسی نہ کسی طرح مزاحمت کرتا رہا اس زمانے میں ایک پادری کے لئے مجرد ہونا لازمی نہیں تھا۔ البتہ چوتھی صدی میں یہ خیال پوری طرح جڑ پکڑ گیا کہ جو شخص کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دیتا ہو اس کے لئے شادی شدہ ہونا بڑی گھناؤنی بات ہے۔

اس رہبانیت کی وجہ سے صرف ازدواجی زندگی ہی متاثر نہیں ہوئی تھی بلکہ تمام سماجی رشتوں پر ضرب لگی تھی۔ مسیحی ولیوں اور راہبوں کی نگاہ میں اولاد' والدین اور بہن بھائیوں کی محبت گناہ تھی ان کے نزدیک روحانی ترقی کے لے ناگزیر تھا کہ آدمی ان سارے تعلقات کو توڑ دے۔ ایک راہب ایواگریس (Evagrius) سالہاسال سے صحرا میں ریاضتیں کر رہا تھا۔ ایک روز یکایک اس کے پاس اس کی ماں اور اس کے باپ کے خطوط پہنچے جو برسوں سے اس کی جدائی میں تڑپ رہے تھے اسے اندیشہ ہوا کہ

کہیں ان خطوط کو پڑھ کر اس کے دل میں انسانی محبت کے جذبات نہ جاگ اٹھیں اس نے ان کو کھولے بغیر فوراً آگ میں جھونک دیا۔ صـ۳۳

سینٹ تھیوڈورس کی ماں اور بہن بہت سے پادریوں کے سفارشی خطوط لے کر اس خانقاہ میں پہنچیں جس میں وہ مقیم تھا اور خواہش کی کہ وہ صرف ایک نظر بیٹے اور بھائی کو دیکھ لیں۔ مگر اس نے ان کے سامنے آنے تک سے انکار کر دیا۔ صـ۳۴

ایک اور ولی سینٹ پوئمن (ST.Poemen) اور اس کے چھ بھائی مصر کی ایک صحرائی خانقاہ میں رہتے تھے۔ برسوں بعد ان کی بوڑھی ماں کو ان کا پتہ معلوم ہوا اور وہ ان سے ملنے کے لئے وہاں پہنچی بیٹے ماں کو دور سے دیکھتے ہی بھاگ کر اپنے حجرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ ماں کو کہلوا دیا کہ ہم تجھ سے خدا کے ہاں ملیں گے۔ صـ۳۵

اس سے بھی زیادہ درد ناک قصہ سینٹ سیمیون اسٹائلائٹس (ST. Simeon Stylites) کا ہے جو ماں باپ کو چھوڑ کر ۲۷ سال غائب رہا۔ باپ اس کے غم میں مر گیا ماں زندہ تھی۔ بیٹے کی ولایت کے چرچے جب دور و نزدیک پھیل گئے تو اس کو پتہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ بے چاری اس سے ملنے کے لئے اس کی خانقاہ پر پہنچی مگر اس "ولی اللہ" نے ماں سے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔ تین دن اور تین راتیں وہ خانقاہ کے دروازے پر پڑے رہنے اور روتے رہنے کے بعد مر گئی۔ صـ۳۶

ایک شخص میوٹیس (Mutius) خوشحال آدمی تھا۔ یکایک اس پر مذہبی جذبہ طاری ہوا اور وہ اپنے ۸ سالہ اکلوتے بیٹے کو لے کر ایک خانقاہ میں پہنچا۔ وہاں اس کی روحانی ترقی کے لئے ضروری تھا کہ وہ بیٹے کی محبت دل سے نکال دے اس لئے پہلے تو بیٹے کو اس سے جدا کر دیا گیا پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک مدت تک طرح طرح کی سختیاں اس معصوم بچے پر کی جاتی رہیں اور وہ سب کچھ دیکھتا رہا پھر خانقاہ کے شیخ نے اسے حکم دیا کہ اسے لے جا کر اپنے ہاتھ سے دریا میں پھینک دے جب وہ اس حکم کی تعمیل کے لئے بھی تیار ہو گیا تو عین اس وقت راہبوں نے بچے کی جان بچائی جب وہ اسے دریا میں پھینکنے لگا تھا۔ اس کے بعد تسلیم کر لیا گیا کہ وہ واقعی مرتبہ ولایت کو پہنچ گیا ہے۔ صـ۳۷

مسیحی رہبانیت کا نقطہ نظر ان معاملات میں یہ تھا کہ جو شخص خدا کی محبت چاہتا ہو اسے انسانی محبت کی وہ تمام زنجیریں کاٹ دینی چاہئیں جو دنیا میں اس کو اپنے والدین' بھائی' بہنوں اور بال بچوں کے ساتھ باندھتی ہیں۔ سینٹ جیروم کہتا ہے کہ "اگرچہ تیرا بھتیجا تیرے گلے میں بانہیں ڈال کر تجھ سے لپٹے اگرچہ تیری ماں دودھ کا واسطہ دے کر تجھے روکے۔ اگرچہ تیرا باپ تجھے روکنے کے لئے تیرے آگے لیٹ جائے' پھر بھی تو سب کو چھوڑ کر اور ماں باپ کے جسم کو روند کر' ایک آنسو بہائے بغیر صلیب کے جھنڈے کی طرف دوڑ جا۔ اس معاملہ میں بے رحمی ہی تقویٰ ہے" صفحہ ۳۸۔

اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ بے رحمی' سنگدلی اور قساوت برتنے کی جو مشق یہ لوگ کرتے تھے اس کی وجہ سے ان کے انسانی جذبات مرجاتے تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں سے انہیں مذہبی اختلاف ہوتا تھا ان کے مقابلے میں یہ ظلم و ستم کی انتہا کردیتے تھے۔ چوتھی صدی تک پہنچتے پہنچتے مسیحیت میں ۸۰ - ۹۰ فرقے پیدا ہوچکے تھے۔ یہ فرقے ایک دوسرے کے خلاف سخت نفرت رکھتے تھے۔ اس نفرت کی آگ کو بھڑکانے والے بھی راہب ہی تھے۔ اسکندریہ اس فرقہ وارانہ کشمکش کا ایک بڑا اکھاڑا تھا۔ وہاں پہلے ایرین (Arian) فرقے کے بشپ نے اتھاناسیوس کی پارٹی پر حملہ کیا۔ اس کے خانقاہوں سے کنواری راہبات پکڑ پکڑ کر نکالی گئیں ان کو برہنہ کرکے خاردار شاخوں سے پیٹا گیا اور ان کے جسم پر داغ لگائے گئے تاکہ وہ اپنے عقیدے سے توبہ کریں۔ پھر جب مصر میں کیتھولک گروہ کو غلبہ حاصل ہوا تو اس نے ایرین فرقے کے خلاف یہی سب کچھ کیا۔ حتیٰ کہ غالب خیال یہ ہے کہ خود ایریس (Arius) کو بھی زہر دے کر مار دیا گیا اسی اسکندریہ میں ایک مرتبہ سینٹ سائرل (ST. Cyril) کے مرید راہبوں نے ہنگامہ عظیم برپا کیا یہاں تک کہ مخالف فرقہ کی ایک راہبہ کو پکڑ کر اپنے کلیسا میں لے گئے۔ اسے قتل کیا اس کی لاش کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالی اور پھر اسے آگ میں جھونک دیا۔ روم کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا ۳۶۶ء میں پوپ لبریس (Liberius) کی وفات پر دو گروہوں نے پاپائی کے لئے اپنے اپنے امیدوار کھڑے کئے۔ دونوں کے درمیان سخت خونریزی ہوئی۔ حتیٰ کہ ایک دن میں صرف ایک

چرچ سے ۷۳۱ لاشیں نکالی گئیں۔ [39]

افسوسناک امر یہ ہے کہ اس ترک دنیا کے ساتھ ساتھ ہی دولت دنیا سمیٹنے میں بھی کوئی کمی نہیں کی گئی۔ پانچویں صدی کے آغاز ہی میں حالت یہ ہو چکی تھی کہ روم کا بشپ بادشاہوں کی طرح اپنے محل میں رہتا تھا اور اس کی سواری جب شہر میں نکلتی تھی تو اس کے ٹھاٹھ باٹھ قیصر کی سواری سے کم نہ ہوتے تھے۔ سینٹ جیروم اپنے زمانے (چوتھی صدی عیسوی کے آخری دور) میں شکایت کرتا ہے کہ بہت سے بشپوں کی دعوتیں اپنی شان میں گورنروں کی دعوتوں کو شرماتی ہیں۔ خانقاہوں اور کلیساوں کی طرف دولت کا یہ بہاو ساتویں صدی عیسوی (نزول قرآن کے زمانے) تک پہنچتے پہنچتے سیلاب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ یہ بات عوام کے ذہن نشین کرا دی گئی تھی کہ جس سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہو جائے اس کی بخشش کسی نہ کسی ولی کی درگاہ پر نذرانہ چڑھانے' یا کسی خانقاہ یا چرچ کو بھینٹ دینے سے ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد وہی دنیا راہبوں کے قدموں میں آرہی جس سے فرار ان کا طرہ امتیاز تھا۔ خاص طور پر جو چیز اس تنزل کا موجب ہوئی وہ یہ تھی کہ راہبوں کی غیر معمولی ریاضتیں اور ان کی نفس کشی کے کمالات دیکھ کر جب عوام میں ان کے لئے بے پناہ عقیدت پیدا ہو گئی تو بہت سے دنیا پرست لوگ لباس درویشی پہن کر راہبوں کے گروہ میں داخل ہو گئے اور انہوں نے ترک دنیا کے بھیس میں جلب دنیا کا کاروبار ایسا چمکایا کہ بڑے بڑے طالبین دنیا ان سے مات کھا گئے۔ [40]

عفت کے معاملہ میں بھی فطرت سے لڑکر رہبانیت نے بارہا شکست کھائی۔ خانقاہوں میں نفس کشی کی کچھ مشقیں ایسی بھی تھیں جن میں راہب اور راہبات مل کر ایک ہی جگہ رہتے تھے اور بسا اوقات ذرا زیادہ مشق کرنے کے لئے ایک ہی بستر پر رات گزارتے تھے۔ مشہور راہب سینٹ ایواگریس بڑی تعریف کے ساتھ فلسطین کے ان راہبوں کے ضبط نفس کا ذکر کرتا ہے جو اپنے جذبات پر اتنا قابو پا گئے تھے کہ عورتوں کے ساتھ یکجا غسل کرتے تھے اور ان کی دید سے ان کے لمس سے حتیٰ کے ان کے ساتھ ہم آغوشی سے بھی ان کے اوپر فطرت غلبہ نہ پاتی تھی"۔ آخرکار اسی فلسطین کے

متعلق نیسا (Nyssa) کا سینٹ گریگوری (م ۳۹۶ء) لکھتا ہے کہ وہ بدکاری کا اڈہ بن گیا ہے۔

دراصل انسانی فطرت کبھی ان لوگوں سے انتقام لئے بغیر نہیں رہتی جو اس سے جنگ کریں رہبانیت بالا خر فطرت سے لڑ کر بداخلاقی کے جس گڑھے میں جا گری اس کی داستان آٹھویں سے گیارھویں صدی عیسوی تک کی مذہبی تاریخ کا بدنما ترین داغ ہے۔ دسویں صدی کا ایک اطالوی بشپ لکھتا ہے "اگر چرچ میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کے خلاف بدچلنی کی سزائیں نافذ کرنے کا قانون عملاً جاری کردیا جائے تو لڑکوں کے سوا کوئی سزا سے نہ بچ سکے گا اور اگر حرامی بچوں کو بھی مذہبی خدمات سے الگ کردینے کا قاعدہ نافذ کیا جائے تو شائد چرچ کے خادموں میں کوئی لڑکا تک باقی نہ رہے۔"

قرون متوسط کے مصنفین کی کتابیں ان شکایتوں سے بھری ہوئی ہیں کہ راہبات کی خانقاہیں بداخلاقی کے چکلے بن گئی ہیں۔ ان کی چار دیواریوں میں نوزائیدہ بچوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ پادریوں اور چرچ کے مذہبی کارکنوں میں محرمات تک سے ناجائز تعلقات اور خانقاہوں میں خلاف وضع فطری جرائم تک پھیل گئے ہیں اور کلیساؤں میں اعتراف گناہ (Confession) کی رسم بدکاری کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔ [۴۲]

الغرض چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں رومی سلطنت کی حالت یہ تھی کہ ایک طرف تو معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے تار و پود بکھیر کر رکھ دینے والی رہبانیت تھی تو دوسری طرف انتہا درجہ کی عیاشی و بدکاری معاشرے میں جاری تھی۔ رہبانیت صحراؤں میں گوشہ نشیں تھی اور شہروں میں فسق و فجور اپنی عروج پر تھا۔

رومی اور ایرانی اس وقت مشرق و مغرب کی امامت اور دنیا کی قیادت کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے وہ دنیا کے لئے کوئی اچھا نمونہ ہونے کے بجائے ہر قسم کی خرابیوں اور فساد کے علمبردار و ذمہ دار تھے۔ مذہب عیسوی بھی انسانی مسائل کو نہ سلجھا سکا کیونکہ اس میں اس درجہ تفصیل و وضاحت نہ تھی کہ اس کی بنیاد پر تہذیب و تمدن کی تعمیر ہو سکے اور پھر مسیحیت زیادہ عرصہ خالص بھی نہ رہ سکی چوتھی صدی تک آتے آتے

عیسائیت ایک معجون مرکب بن کر رہ گئی تھی جس میں یونانی خرافات رومی بت پرستی مصری افلاطونیت اور رہبانیت کے اجزاء شامل تھے۔ الغرض رومی تہذیب اور مسیحیت کے پاس انسانی دکھوں کا کوئی شافی علاج نہ تھا اور انسان کسی نجات دہندہ کے انتظار میں تھا۔

حواشی وحوالہ جات

۱ ۔ پیونک جنگیں ۱۴۶ تا ۲۶۴ ق ۔ م کے درمیان لڑی گئیں۔ ایک سو اٹھارہ سالہ دور میں تین پیونک جنگیں ہوئیں۔

۲ ۔ گبن جلد اول ص ۱۱

۳ ۔ ہارمسورتھ ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۷ ص ۲۳۸۸

۴ ۔ ۱۴۶۰ء میں یونان بھی عثمانیوں کے قبضے میں آگیا۔

۵ ۔ ندوی ص ۴۳۔۲۴۲

۶ ۔ امیر علی ص ۲۶۰

۷ ۔ محمد قطب، شبہاب حول الاسلام، (اسلام اور جدید ذہن کے شبہات) مترجم محمد سلیم کیانی، لاہور

۸ ۔ محمد قطب

۹ ۔ امیر علی ص ۲۶۰

۱۰ ۔ تمدن عرب جلد ۲ ص ۴۹۷

۱۱ ۔ القرآن ۱۹ ۔ ۲۱

۱۲ ۔ القرآن ۳ ۔ ۴۲ ۔ ۴۷

۱۳ ۔ القرآن ۳ ۔ ۴۵

۱۴ ۔ دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۴، حصہ دوئم ص ۳۶۳

۱۵ ۔ القرآن ۵ ۔ : ۴، ۱۹ : ۴، ۵۱ : ۵، ۷۹ : ۷۲

۱۶ ۔ القرآن ۳ ۔ ۵۰

۱۷ ۔ دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۴، حصہ دوئم ص ۷۔۳ (مضمون عیسٰی)

۱۸ - انجیل کے مطابق یہ شخص یہوداہ اسکریوتی' تھا جو کہ حضرت عیسیٰ کا ایک شاگرد تھا جسے ۳۰ دینار پر جاسوسی کے لئے تیار کرلیا گیا تھا اور اس نے رومی حکام کو حضرت عیسیٰ کے ٹھکانے تک جنگل میں پہنچایا تھا (بحوالہ دائرہ معارف اسلامیہ)

۱۹ - ندوی ص ۲۴۵

۲۰ - امیر علی' روح اسلام ص ۲۲۴

۲۱ - تنذ تیس ص ۴۹۷

۲۲ - امیر علی ص ۲۲۴

۲۳ - امیر علی ص ۲۲۴

۲۴ - ندوی ص ۲۸۲

۲۵ - گبن جلد اول ص ۵۰۵

۲۶ - ندوی ص ۵۱ - ۲۵۰

۲۷ - رہبانیت کے معنی خوف کے ہیں۔ اصطلاحاً اس سے مراد ہے کہ کسی شخص کا خوف کی بناء پر (قطع نظر اس سے کہ وہ کسی کے ظلم کا خوف ہو۔ یا دنیا کے فتنوں کا خوف یا اپنے نفس کی کمزوریوں کا خوف) تارک الدنیا بن جانا اور دنیوی زندگی سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لینا یا گوشہ ہائے عزلت میں جا بیٹھنا (بحوالہ تفہیم القرآن مودودی جلد ۵ ص ۳۲۴)

۲۸ - مودودی' ابوالاعلیٰ' تفہیم القرآن' جلد ۵ ص ۳۲۷' لاہور ۱۹۸۴

۲۹ - تفہیم القرآن جلد ۵ ص ۳۲۷

۳۰ - ایضاً

۳۱ - تفہیم القرآن ص ۳۲۸

۳۲ - تفہیم القرآن' جلد ۵ ص ۳۲۹

۳۳ - تفہیم القرآن جلد ۵ ص ۳۳۰

۳۴ - ایضاً

۳۵ - ایضاً

۳۶ - ایضاً

۳۷ ۔ تفہیم القرآن جلد ۵ ص ۳۳۱

۳۸ ۔ ایضاً

۳۹ ۔ تفہیم القرآن جلد ۵ ص ۳۳۲

۴۰ ۔ تفہیم القرآن جلد ۵ ص ۳۳۲

۴۱ ۔ غسل اگرچہ رہبانیت میں سخت ناپسندیدہ تھا مگر نفس کشی کی مشق کے لئے اس قسم کے غسل کر لئے جاتے تھے۔

۴۲ ۔ تفہیم القرآن جلد ۵ ص ۳۳۲

باب ششم

عربی تہذیب

عرب کا قدیم نام ''عربة'' تھا جو بعد میں ''عرب'' ہو گیا، جو ملک کا نام ہونے کے ساتھ ساتھ قوم کا نام بھی قرار پا گیا۔ تمام سامی زبانوں میں ''عربہ'' صحرا اور بادیہ کا مفہوم رکھتا ہے، عبرانی میں ''عربا'' بیابان اور میدان کو کہتے ہیں۔ خود عربی زبان میں ''عرابة'' کے معنی ریت کے ہیں اور ''اعراب'' اہل بادیہ اور صحرانشینوں کے لیے اب تک مستعمل ہے۔[۱]

قرآن مجید میں لفظ ''عرب'' ملکِ عرب کے لیے کہیں نہیں بولا گیا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سکونت کے ذکر میں ''وادٍ غیر ذی زرع'' یعنی ''ناقابلِ کاشت وادی'' کہا گیا ہے۔ توراۃ میں لفظ ''عربا'' متعدد بار آیا ہے جس سے وہ قطعہ زمین مراد لیا گیا ہے جو حجاز سے شام اور سینا تک وسیع ہے۔[۲] عام ملکِ عرب کے لیے زیادہ تر ''مشرق کی زمین'' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور کبھی جنوب کا، کیونکہ ملکِ عرب، فلسطین کے مشرق اور جنوب دونوں اطراف میں ہے۔ لفظ ''عرب'' سب سے پہلے ۱۰۰۰ ق۔م میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں استعمال ہوا اور پھر اس کے بعد اس کا استعمال عام طور سے عبرانی، یونانی اور رومانی تاریخوں میں نظر آتا ہے، اسلام سے پہلے ہی یہ لفظ پورے ملک کو جو یمن سے شام تک وسیع ہے، محیط تھا۔[۳]

عرب کا ملک حدودِ طبعی کے لحاظ سے ایک جزیزہ نما ہے لیکن اہل عرب اس کو ہمیشہ جزیرۃ العرب کہتے ہیں، اس کے مشرق میں خلیج فارس[۴] (Persian Gulf) مغرب میں بحیرۂ احمر (Red Sea) اور جنوب میں بحیرۂ ہند (Indian Ocean) اور شمال (وشمال مغرب میں) خلیج عقبہ، شام و فلسطین کے علاقے واقع ہیں۔

عرب کا ملک زیادہ تر بے آباد، خشک اور شور ریگستان ہے۔تمام ملک میں پہاڑوں کا جال ہے۔ملک میں کوئی دریا نہیں لیکن عجیب قدرتِ الٰہی یہ ہے کہ یہاں کے پہاڑوں سے ہمیشہ چشمے جاری رہتے ہیں جن سے دامن کوہ اور وادیاں عموماً سرسبز و شاداب رہتی ہیں۔شاہان عرب نے انہیں چشموں کو روک کر بند بنائے تھے۔عرب کے وہ مقامات جو سواحل سمندر پر واقع ہیں بالعموم سرسبز و شاداب ہیں۔خصوصاً یمن، اس کے علاوہ عمان، حضر موت، نجد اور طائف سرسبزی و شادابی کے اعتبار سے ملک کا بہترین حصہ ہیں۔اس ملک کا سب سے طویل پہاڑی سلسلہ ''جبل السراۃ'' ہے جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک چلا گیا ہے۔

آب و ہوا کے اعتبار سے ملک عرب نہایت گرم ہے۔میدانوں میں جب بادِ سموم چلتی ہے تو کوسوں تک زندگی دشوار ہو جاتی ہے۔کبھی اس کے ساتھ جب ریگ کا طوفان آتا ہے تو پورے کا پورا قافلہ اور آبادی کی آبادی ریگ کے ڈھیر کے نیچے دب جاتی ہے اسی لیے ملک عرب میں موسم اور آب و ہوا کے کسی واقف کار اور آبادی و صحرا کے کسی راہنما کے بغیر سفر کو ہمیشہ خطرناک سمجھا گیا ہے۔

اس ملک کا سب سے بڑا صحرا شمال میں شام و عرب کے درمیان ریگستانی میدان ہے جس کو عموماً بادیہ شام کہتے ہیں، تاہم غیر عرب اس کو بادیہ عرب بھی کہتے ہیں۔دوسرا ریگستان جنوبی حد میں یمن، عمان اور یمامہ کے درمیان واقع ہے۔اس وسیع و عریض اور بے آب و گیا صحرا کو ربع الخالی کہتے ہیں (اسی کو ''دہنا'' اور ''صحرائے اعظم'' بھی کہتے ہیں۔)

اس قطعہ زمین یعنی عرب میں رہنے والوں کی تہذیب کے مطالعہ کے لیے یہ نہایت ضروری تھا کہ ملک کے طبعی حالات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے کیونکہ جیسا کہ باب سوئم میں بھی کہا گیا، جغرافیائی عامل تشکیل تہذیب و تمدن کا اہم عامل سمجھا گیا ہے۔

عرب کے اقوام و قبائل:

مورخین عرب نے اقوام و قبائل عرب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔عرب بائدہ ۲۔عربِ عاربہ ۳۔عرب متعربہ

ذیل میں ان کی تفصیل دی جاتی ہے۔

عربِ بائدہ:

ان سے مراد عرب کے وہ قدیم ترین قبائل ہیں جو اسلام سے بہت پہلے فنا ہو چکے تھے۔ بائدہ کے معنی "برباد ہو جانے والے" کے ہیں۔ عرب بائدہ کو مندرجہ ذیل شاخوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(الف) عادِ اولیٰ

(ب) عادِ ثانیہ

(ج) ثمود

(د) طسم و جدیس

(ہ) اہل معین

جہاں تک عادِ اولیٰ کا تعلق ہے وہ عرب کے سب سے پہلے اور ابتدائی باشندے تھے، جو ایک مدت کے اتحاد و اجتماع کے بعد ملک عرب سے نکل نکل کر اطراف کے ممالک مثلاً بابل، شام، مصر، فلسطین وغیرہ میں پھیل گئے اور وہاں انہوں نے زور و اقتدار پیدا کیا۔ قوم نوح کی بربادی کے بعد عرب میں جو سب سے پہلی مقتدر اور حکمران جماعت ظہور پذیر ہوئی قرآن کی رُو سے اسی کا نام عادِ اولیٰ ہے۔[۵]

مورخین عرب نے عاد کو عوض بن ارم بن سام کا حقیقی فرزند لکھا ہے اس لیے ان کا زمانہ تین ہزار سال قبل مسیح (۳۰۰۰ ق۔م) کا قرار دیا ہے تاہم ان کی حقیقی عظمت و ترقی کا زمانہ ۲۲۰۰ ق۔م سے ۱۷۰۰ ق۔م کا سمجھا جاتا ہے۔[٦] اندرون عرب، عاد کی مرکزی آبادی، عرب کے بہترین حصے یعنی یمن، حضر موت میں سواحلِ خلیج فارس سے حدودِ عراق تک تھی۔ لیکن بعد میں عاد اولیٰ، عرب سے نکل کر بابل، شام اور مصر تک پھیل گئے۔ عاد کوئی محدود یا مختصر قبیلہ نہ تھا بلکہ وہ ایک عظیم الشان قوم تھی جو دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی۔ ایشیا اور افریقہ کا کثیر حصہ اس کے زور

وقوت کی تماش گاہ تھا۔ بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں ان کے دستِ صنعت کا نتیجہ تھیں۔ قرآن مجید نے اس عظیم الشان قوم کی داستان بار بار دہرائی ہے۔ انہی کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔[۷] بہرحال جب یہ قوم اللہ سے گمراہی کی مرتکب ہوئی تو تباہ کر دی گئی۔ البتہ حضرت ہود علیہ السلام مع اپنے متبعین کے عذاب سے ذرا پہلے عاد کی آبادی سے نکل کر حجاز چلے گئے۔ یہ "عادِ ثانیہ" کہلاتے ہیں۔ عادِ ثانیہ نے جزیرہ نمائے عرب آنے کے بعد بھی تقریباً ڈیڑھ سو سال تک اپنے عروج کو قائم رکھا۔ یہ لوگ حضر موت سے سواحلِ خلیج فارس کے طول میں عراق تک پھیلے ہوئے تھے۔ (دیکھیے نقشہ ۳)

عاد کے بعد شہرت وعظمت اور سیاسی جانشینی ثمود کو حاصل ہوئی۔ یہ عادِ ثانیہ کے ہم عصر تھے۔ جس طرح جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی اور مشرقی حصے پر جو خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جاتا ہے، پر عادِ ثانیہ قابض تھے۔ اس کے مدمقابل عرب کے مغربی اور شمالی حصہ پر ثمود قابض تھے۔ ان علاقوں کا نام اس زمانے میں "وادی القریٰ" [۸] تھا۔ ثمود کے ملک کا دارالحکومت حجر تھا۔ یہ شہر اس قدیم راستہ پر واقع ہے جو حجاز سے شام کو جاتا ہے۔ آج کل اس شہر کو "مدائن صالح" کہتے ہیں۔ قوم ثمود کے سیاسی حالات بالکل معلوم نہیں۔ مورخین صرف اس قدر بیان کرتے ہیں کہ یہ شمالی عرب کی ایک زبردست قوم تھی۔ فن تعمیر میں عاد کی طرح اس کو بھی کمال حاصل تھا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بنانا، پتھروں کے عمارات ومقابر تیار کرنا اس قوم کا خاص پیشہ تھا۔ یہ یادگاریں اب تک باقی ہیں۔ ثمود کی طرف بھیجے جانے والے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام تھے۔ اس قوم نے بھی اپنے پیغمبر کو جھٹلایا، شرک اور گمراہی کے راستے پر چلتے رہے یہاں تک کہ ہلاک کر دیئے گئے۔

عربِ بائدہ کی ایک شاخ طسم وجدیس بھی تھی۔ یہ جنوبی عرب کے علاقے یمامہ، بحرین اور عمان میں آباد تھے۔ یہ عاد کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔ اولاً سیاسی طاقت طسم کو حاصل تھی، بعد میں جدیس غالب آ گئے۔ یمامہ میں جس کو قدیم نام کے لحاظ سے ہجر یا قریہ کہنا چاہیے، آثار قدیمہ کے نشان اسلام کے عہد تک باقی تھے۔ ان اقوام کی تباہی و بربادی کے بعد ایک مدت تک

یہاں ویرانی رہی تا آنکہ آخر میں اسماعیلی وقحطانی عربوں نے ادھر کا رخ کیا اور ان جگہوں کو آباد کیا۔

عربِ بائدہ ہی میں اہل معین بھی تھے، جن کا تعلق جوفِ یمن سے تھا۔ عام طور سے ان کا زمانہ ۱۲۰۰ ق۔م سے ۷۰۰ ق۔م سمجھا جاتا ہے۔ مملکت معین کا خاص شہر قرن تھا۔ زمین نہایت زرخیز و سرسبز تھی۔ یہ تجارت پیشہ قوم تھی جو زیادہ تر خوشبودار لکڑی، بخورات اور جانوروں کی تجارت کرتی تھی۔ معین کے کھنڈرات اب تک باقی ہیں۔ علمائے آثار نے تقریباً پچیس (۲۵) شاہان معین کے نام دریافت کیے ہیں۔[۹] اس کے علاوہ بھی بہت سے قبائل بائدہ کے نام منقول ہیں۔[۱۰] لیکن نام کے سوا ان کے حالات کا کوئی علم نہیں۔

عربِ عاربہ (بنوقحطان) کا تمدن:

عرب عاربہ سے مراد بنوقحطان ہیں، جو عربِ بائدہ کے بعد عرب کے اصلی باشندے تھے اور جن کا اصل مسکن ملک یمن تھا۔ (مدینہ کے قبائل اوس وخزرج کا تعلق انہی سے تھا)۔

اسلام سے قبل عرب عاربہ میں پانچ متمدن سلطنتیں گزریں۔ جن میں اہم معینی اور سبائی و حمیری ہیں۔

۱۔ **معینی:** معینی سلطنت جنوبی عرب میں تھی، اس کے صدر مقام قرن اور معین تھے۔ سطورِ بالا میں اس کا ذکر عربِ بائدہ کے حوالے سے کیا جا چکا ہے۔ کتبوں سے اس سلطنت کے تقریباً پچیس (۲۵) حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے۔ محققین یورپ میں اختلاف ہے کہ معینی اور سبائی حکومتیں ہم عصر تھیں یا متقدم ومتاخر۔ ایک یورپی محقق گلازر کا خیال ہے کہ معینی حکومت، سبائی حکومت سے بہت پہلے گزری تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پندرہ سو برس قبل موجود تھی، (اسی حوالے سے اہل معین کا تذکرہ عربِ بائدہ کے ضمن میں بھی کیا گیا ہے۔) جبکہ ایک دوسرے یورپی محقق ولر کا بیان ہے کہ کوئی معینی کتبہ آٹھ سو برس قبل مسیح سے پہلے کا نہیں ملتا، اس بناء پر سبائی اور معینی حکومتیں ہم عصر ہیں۔[۱۱]

۲۔ **سبائی حکومت:** جیسا کہ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

سے سات سو برس قبل سبا کی حکومت قائم تھی، اس سلطنت کا پایہ تخت مآرب تھا۔ اس زمانے کے سنگی کتبے بہ کثرت موجود ہیں۔ ۱۱۵ ق۔م تک اس حکومت کا پتہ چلتا ہے اس کے بعد حمیر حکومت سبا پر قابض ہو گئے۔ ان کے زمانے میں ایک بار رومی بادشاہ نے عرب پر چڑھائی کی کوشش کی، یہ پہلی کوشش، آخری بھی ثابت ہوئی۔ اے لیس گالس جس نے ۱۸ ق۔م میں عرب پر چڑھائی کی تھی، بالکل ناکامیاب رہا اس کے رہبر دغا بازی سے اس کو لشکر سمیت صحرا میں لے گئے، ریگستان میں پہنچ کر اس کا سارا لشکر تباہ ہو گیا۔[۱۲]

حمیر نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا۔ اسی زمانے کے قریب حبشیوں نے عرب کے جنوب میں حکومت قائم کرنی شروع کی اور ۵۲۵ء میں اہل حمیر کو شکست دے کر اپنی مستقل حکومت قائم کر لی۔ یمن پر حبشیوں کی حکومت تقریباً ۴۷ سال تک رہی۔ ساتویں صدی کے آغاز میں ایرانیوں نے حبشیوں کو شکست دے کر یمن پر قبضہ کر لیا۔ یاد رہے آل حمیر نے اپنے دور میں ایران کے انتہائی مقامات فتح کر لیے تھے۔ بہرحال ظہور اسلام تک یمن پھر ایرانی سلطنت کا ایک حصہ رہا۔ آخری ایرانی گورنر باذان نے رسول اللہ کی دعوت قبول کر لی تھی جس کے ساتھ ہی یمن اسلامی عمل داری میں شامل ہو گیا۔

سبا، حمیر کے دور میں جنوبی عرب کا سیاسی اور معاشی نظام بہت ترقی یافتہ تھا۔ موسیو گستالیبان نے قبل مسیح کے قدیم حوالوں سے یمن کی مدنیت، شہر مآرب اور سد مآرب کی تفصیل بیان کی ہے جو عرب مورخین کے بیانات کی تصدیق کرتی ہے۔[۱۳] سبا اور حمیر کے اعلیٰ درجہ کے تمدن کے بارے میں مشہور جرمن مستشرق نولد یکی لکھتے ہیں:

> ”ولادتِ مسیح سے ہزار سال قبل جنوبی و مغربی عرب یعنی یمن جو حمیر اور سبا کا ملک تھا اور اپنی بارش گرما کے باعث زراعت کے لیے نہایت موزوں تھا۔ تمدن کے اس درجہ تک پہنچ چکا تھا کہ اس کے کثیر التعداد کتبات اور شاندار عمارات کے آثار سے آج بھی ہمارے جذباتِ مدح و ستائش کو تحریک ہوتی ہے، اور اہل یونان و

روم نے اس کو "دولت مند عرب" کا جو لقب دیا تھا وہ بے جا نہ تھا.........توراۃ میں متعدد عبارتیں ہیں جو سبا کی عظمت و شوکت کی شہادت دیتی ہیں چنانچہ ملکہ سبا کا سلیمان سے ملاقات کا قصہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

کتابت کا فن جو اہل سبا نے بہت ابتدائی زمانہ سے شمال سے لیا تھا، اب اس کو خود انہوں نے عرب کے اکثر حصوں میں ہر طرح کے کاروبار میں جاری کر دیا، یہاں تک کہ ایک طرف دمش اور دوسری طرف ابی سینیا تک اس کو پھیلا دیا۔" [۱۴]

سبا اور حمیر کے زمانے کا تمدن ہر اعتبار سے ترقی یافتہ تھا۔ ان کی کئی شاندار عمارات میں سے ایک قصر غمدان تھا جس کا تذکرہ بڑے طلسماتی انداز میں کیا گیا ہے۔ اسی طرح مشہور و معروف سد مآرب ہے، یہ شاندار بند تھا جسے سبا نے پہاڑوں کے بیچ میں تقریباً ۸۰۰ ق۔م میں تعمیر کیا تھا۔ [۱۵] شہر مآرب کے جنوب میں دو پہاڑ ہیں جنہیں کوہِ ابلق کہا جاتا ہے۔ دونوں پہاڑوں کے درمیان وادی اذنیہ ہے۔ پہاڑوں سے پانی جمع ہو کر وادی میں ایک دریا سا جاری ہو جاتا ہے۔ سبا نے ان پہاڑوں کے بیچ میں اس بند کی تعمیر کی تھی۔ یہ بند تقریباً ۱۵۰ فیٹ لمبی اور ۵۰ فیٹ چوڑی ایک دیوار تھی۔ اس بند میں اوپر نیچے بہت سی کھڑکیاں تھیں جو حسب ضرورت کھولی اور بند کی جاتی تھیں۔ بند کے دائیں بائیں دو بڑے بڑے دروازے تھے، جن سے پانی تقسیم ہو کر چپ و راست کی زمین کو سیراب کرتا تھا، بعد میں جب ملک میں سیاسی انتشار پھیلا اور بند کی نگرانی کی طرف سے غفلت برتی گئی تو یہ بتدریج تباہ ہو گیا، تاہم اس کی باقیات آج بھی موجود ہیں۔ [۱۶]

بنو قحطان کی ان اہم حکومتوں کے علاوہ ایک حکومت حضر موت تھی جس کا صدر مقام یمن کا مشہور مقام حضر موت تھا، اسی طرح جنوبی عرب کے علاقے عدن میں قتبانی حکومت قائم ہوئی۔ نابتی حکومت جو شام کے حدود سے متصل تھی اور قوم ثمود کی قائم مقام تھی، ان سب کی تمدنی ترقیاں عروج پر تھیں۔ اسلام سے قبل یہ تمام سلطنتیں برباد ہو چکی تھیں ان کی جگہ یمن میں صرف بڑے بڑے

سردار رہ گئے تھے۔البتہ عراق میں آل منذر کے خاندان کے تحت حکومت حیرہ اور شام کی حدود میں غسانی خاندان فرمانروا تھا، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔حکومت حیرہ:

حیرہ کی حکومت عراق عرب میں قائم قحطانی عربوں کی نیم خود مختار حکومت تھی ۔ایرانی بادشاہ، شاہ پور۔اول کے عہد (۲۴۰ء) میں حکومت ایران نے نہر فرات کے کنارے حیرہ کی مملکت کی بنیاد رکھ کر عمرو بن عدی کو اس کا امیر مقرر کیا تھا۔یہ ایک طرح کی بفراسٹیٹ تھی۔حیرہ کی حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ ایران پر اس کی سمت سے حملہ آور کے خلاف مدافعت کرے۔اس کے عوض ایران نے اسے ٹیکس کی ادائیگی سے معافی دے رکھی تھی ۔ایرانی حکومت عموماً حیرہ کے عربوں پر قحطانی عربوں کے مشہور قبیلہ بنو قضاعہ کی ایک شاخ بنو لخم کے کسی فرد کو مقرر کرتی تھی اسی لیے اس کو آلِ لخم یا لخمی حکومت بھی کہتے ہیں۔پایہ تخت حیرہ کی مناسبت سے یہ ملک حیرہ ہی کہلائے جاتے تھے، نیز متعدد حکمرانوں کے نام "منذر" ہونے کی وجہ سے اس حکومت کو مناذرہ کی حکومت بھی کہتے تھے۔حیرہ پر مناذرہ کے بائیس بادشاہوں نے تین سو چونسٹھ (۳۶۴) سال تک حکومت کی ۔قبیلہ لخم کی امارت کا نظام جو بوجوہ ۶۰۲ء میں ختم کر دیا گیا۔اس کے بعد یہاں ایرانی حکومت اپنی طرف سے ایرانی گورنر مقرر کرتی تھی جس کی اطاعت حیرہ کے تمام امرائے عرب کیا کرتے تھے۔یہ دستور ۶۳۳ء تک باقی رہا جبکہ حیرہ کو مسلمان جرنیل حضرت خالد بن ولید نے فتح کیا۔[۱۷] حیرہ کا شہر تمدن کے ایک خاص معیار تک پہنچ گیا تھا۔آراستگی اور خوبی میں دارالسلطنت ایران اور قسطنطنیہ کا مقابلہ کرتا تھا۔[۱۸] بادشاہوں کے دربار میں شعرا جمع رہتے، حیرہ کا شہر عالی شان محلات، شاداب باغات اور نظر فریب نہروں کی وجہ سے اس عہد کا بارونق شہر سمجھا جاتا تھا۔

۲۔حکومت غساسنہ:

شام کی سرحد پر غساسنہ (آل جفنہ) کی حکومت رومیوں کے زیر اثر قائم تھی۔قحطان کی ایک شاخ بنو کہلان کے عربوں کی یہ ایک نیم خود مختار حکومت تھی جس کا پایہ تخت بصریٰ کا شہر تھا۔یہ

حکومت حوران اور بلقاء کے دونوں منطقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بھی اپنے وقت کی خاص متمدن حکومت تھی، آثار قدیمہ کی جدید تحقیقات نے ان کی ترقی کی عظمت کو ثابت کر دیا ہے۔ یہ حکومت تیسری صدی عیسوی میں وجود میں آئی اور اس کا خاتمہ ۶۳۳ء میں عہد فاروقی میں ہوا۔ یوں آل غسان کے حکمرانوں نے کم وبیش چار سو سال حکومت کی۔ ان حکمرانوں نے رومیوں کے زیر اثر عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ بنو کہلان کے عربوں کی اس حکومت کو غساسنہ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یمن سے ہجرت کے بعد یہ لوگ تہامہ میں نہر غسان کے کنارے آباد ہوئے تھے اسی نسبت سے وہ غسان کے نام سے معروف ہوئے۔ انہیں بانی خاندان کے نام سے آل جفنہ بھی کہتے ہیں۔[۱۹] غسانیوں کا اخری فرمانروا جبلہ بن ایہم تھا۔[۲۰]

عرب مستعربہ (عدنانی)

یعنی بنو اسماعیل۔ یہ حضرت اسماعیل کی اولاد تھی جو حجاز میں آباد ہوئی۔ حضرت اسماعیل جب مکہ میں آباد ہوئے جو جزیرہ العرب کا وسطی علاقہ ہے، تو حوائی مکہ میں بنو جرہم آباد تھے۔ حضرت اسماعیل نے اس خاندان میں شادی کی۔ اس سے جو اولاد ہوئی وہ عرب مستعربہ کہلائی۔ عرب عاربہ یعنی بنو قحطان اور عرب مستعربہ یعنی بنو اسماعیل کی تہذیبی حالت میں نمایاں فرق تھا۔ بنو قحطان نے جنوبی اور شمالی عرب میں بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں اور تہذیب وتمدن کے بلند تر معیار تک پہنچے۔ جس کا تذکرہ اوراق گزشتہ میں کیا گیا جبکہ عرب مستعربہ یعنی بنو اسماعیل جو وسطی عرب یعنی حجاز میں آباد تھے، بادیہ نشینی اور قبائلی زندگی گزارتے رہے، اور شمالی و جنوبی عرب کی مقابلتاً متمدن ریاستوں کا کوئی خاص اثر وسطی عرب پر نہیں تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شمالی، وسطی اور جنوبی عرب میں سرحدی اتصال کے باوجود تہذیب وتمدن کا اتنا واضح فرق کیوں نظر آتا ہے؟

اس کی سب سے قوی وجہ ان علاقوں کے مختلف جغرافیائی حالات وعوامل ہیں۔ کسی جگہ کی تہذیب وتمدن کے تشکیلی عناصر میں وہاں کے طبعی حالات کو ایک طاقت ور عامل سمجھا جاتا ہے۔ یہ انسانی خدوخال سے لے کر طرزِ معاشرت ومعیشت تک ہر معاملہ میں حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ وسطی عرب

کے ریگستانی علاقوں کے عربوں کا گلہ بان ہونا اور شمالی یا جنوبی عرب کے رہنے والوں کا اہل زراعت و تجارت ہونا کچھ اُن کی اپنی پسند یا صوابدید پر منحصر نہیں تھا بلکہ یہ وہاں کے جغرافیائی حالات کا حکم تھا کہ وہ ایسا کریں اور جہد للبقا کے لیے انھوں نے ایسا ہی کیا۔[۲۱] جس کی وجہ سے دو مختلف قسم کے تہذیبی رویے سامنے آئے۔

المختصر وسطی عرب میں دو طرح کی معاشرت نظر آتی ہے، یہ معاشرتی تفاوت دراصل طرز معیشت کی بناء پر تھی۔

۱۔ حضری (یعنی اہل المدر)

۲۔ بدوی (یعنی اہل الوبر)

شہروں کے رہنے والے حضری تھے۔ ان کا پیشہ زراعت اور تجارت تھا۔ بدویوں کی نسبت ان کی تعداد بہت کم تھی اسی لیے وسطی عرب میں شہروں کی تعداد بہت کم تھی مثلاً حجاز میں مکہ، مدینہ اور طائف اس کے علاوہ خیبر اور نجد وغیرہ۔ یہاں کے رہنے والے زراعت اور تجارت پیشہ تھے۔ حجاز میں قریش کے مختلف بطون پھیلے ہوئے تھے۔

وسطی عرب کے عربوں کے دوسرے گروہ کا پیشہ گلہ بانی تھا۔ یہ اہل البادیہ تھے۔ یہ منتشر اور مسافرت میں رہتے۔ انہیں اپنے مویشیوں کے لیے نئی چراگاہوں اور نئے چشموں کی تلاش میں سرگرداں رہنا پڑتا تھا۔ یہ کثیر التعداد تھے۔ یہ اہل البادیہ حضارت اور مدنیت سے دور بھاگتے تھے۔ حضری باشندوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور انہیں غلام سمجھتے تھے۔ یہ بدوی اپنی آزادی کو انتہائی عزیز رکھتے تھے۔ یہ کبھی مفتوح نہیں ہوئے۔ ان کے پڑوس میں دو بڑی مملکتوں کی موجودگی کے باوجود انہیں کوئی فتح نہیں کر سکا۔ ان میں وحشت کا عنصر زیادہ تھا۔ جنگجویانہ اوصاف کے حامل تھے۔ اسلحہ کا استعمال ان کا دن رات کا مشغلہ تھا۔ ریگستانی راہوں پر قافلوں اور مسافروں کو لوٹ لینا ان کی معاشی مجبوری تھی۔ وہ آرام و آسائش کی متمدن زندگی سے آشنا ہی نہیں تھے، ان کی معاشرت میں حیرت انگیز سادگی تھی۔ وہ خیموں کی زندگی گزارتے، پانی اور چارے کی تلاش میں گھومتے پھرتے

رہتے اورلوٹ اورلڑائی پرزندگی بسر کرتے تھے۔

بہرحال خواہ اہل حضارۃ ہوں یا اہل البادیہ، ان کا طرزِ زندگی ''قبائلی'' تھا۔وسطی عرب میں عہد جاہلیہ میں قبیلہ ہی وہ وحدت تھی جس پرعربوں کی اجتماعی زندگی کا دارو مدار تھا۔حجاز کا سب سے بڑا قبیلہ قریش تھا۔جس کے مختلف بطون گردونواح میں پھیلے ہوئے تھے۔قریش کے اجداد میں ایک اہم شخصیت قصی بن کلاب کی تھی جس نے مکہ میں ایک شہری نظام متعارف کرایا۔اسی سے قریش کی حقیقی عظمت کا آغاز ہوتا ہے۔قصی نے مکہ کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے قبائل قریش کو منظم کیا،مکہ سے بنوخزاعہ کو نکال کر وہاں قریش کی بستیاں بسائیں۔اس نے مکہ میں ایک شہری ریاست کی بنیاد رکھی،جس کے چودہ عہدے دار تھے،جن پر قریش کے مختلف خاندانوں کے لوگ مقرر تھے۔خود قصی کی حیثیت رئیس اعلیٰ کی تھی۔اس ریاست کا ایوانِ حکومت خانہ کعبہ سے متصل دارالندوہ کی عمارت میں تھا۔یہ شہری ریاست اپنے عہد کی ایک متمدن ریاست تھی جو قریش کی نسبتاً ترقی یافتہ سوسائٹی کی خبر دیتی تھی۔دراصل قصی نے حدودِ شام میں تربیت پائی تھی،ہوسکتا ہے قصی نے تہذیب زندگی،نظم حکومت اور تاسیس قومیت کے اصول شام ہی کے ملک سے سیکھے اور جوانی میں حجاز آ کر اسی اصول پر قریش کے منتشر قبائل کو یکجا کیا اور ان میں ایک چھوٹی سی جمہوری ریاست کی بنیاد ڈالی۔ریاست کے مختلف عہدے قبائل قریش کے درمیان تقسیم تھے جو وراثتاً انہی خاندانوں میں رہتے تھے اس طرح سے دیکھا جائے تو یہ نظام بھی قبائلی ہی تھا۔

گویا وسطی عرب کے صحرا ہوں یا شہر،طرزِ زندگی بہرحال قبائلی تھا۔اور جہاں قبائلیت ہوتی ہے وہاں سیاسی لامرکزیت ہوتی ہے عرب معاشرے میں ہرقبیلہ ایک اکائی اور سیاسی اعتبار سے خودمختار تھا۔ پورے وسطی عرب میں کسی ایسی منظم حکومت کا پتہ نہیں چلتا جس کے سامنے سارے قبائل جوابدہ ہوں اس لئے قبائل کو من مانی کرنے کی یک گونہ آزادی تھی کسی مرکزی حکومت کی عدم موجودگی خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ملک میں معاشی وسائل محدود ہوں آئے دن کی جنگوں کا باعث تھی۔عرب قبل اسلام کی ان قبائلی جنگوں کو''ایام العرب'' کہتے ہیں۔

المیدانی نے "مجمع الامثال" کے ۲۹ ویں باب میں "ایام العرب" سے بحث کرتے ہوئے زمانہ قبل از اسلام کے ۱۲۳ ایام کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایام کسی ایک نسلی گروہ کے مابین یا دو مختلف نسلی گروہوں کے درمیان ہی موجود نہ تھے بلکہ ایک ہی نسلی گروہ سے تعلق رکھنے والے قبائل آپس میں دست بگریباں ہوجاتے تھے۔ اسی طرح عرب وعجم کی متحارب جماعتیں بھی مصروف جنگ رہتی تھیں۔ چند مشہور ایام العرب میں سے ایک جنگ بسوس تھی جو ربیعہ کے دو قبائل بنو بکر اور بن تغلب کے درمیاں ہوئی اور جس کی اصل وجہ چراگاہ میں اونٹ کو چرانے کا حق تھا۔ دوسری مشہور جنگ حرب داحس والغبراء تھی جو دو گھوڑوں کی مسابقت اور شرط کی رقوم کی ہار جیت پر اختلاف ہوجانے کے باعث مضر کے دو قبائل عبس وذبیاں کے درمیان ہوئی تیسری مشہور جنگ حرب فجار تھی جس میں ایک فریق قریش اور کنانہ تھے اور دوسرے فریق ہوازن (قیس عیلان) تھے۔ ایام العرب میں چوتھی قابل ذکر جنگ حرب ذی قار کے نام سے مشہور ہے جو ربیعہ کے قبائل اور ایران کی شاہی فوج کے مابین، شاہان حیرہ کے امانت رکھے ہوئے سامان کی واپسی کے تنازعہ پر ہوئی۔[۲۲]

یہ جنگیں عرب معاشرے کا المناک باب تھیں۔ جنگ بسوس کا نقشہ ایک عرب شاعر مہلہل نے اس طرح کھینچا ہے:

"دونوں خاندان مٹ گئے
ماؤں نے اپنی اولاد کھوئی
بچے یتیم ہوئے
آنسو خشک نہیں ہوئے
لاشیں دفن نہیں کی جاتیں"۔

جہاں تک ان کی معیشت کا تعلق ہے۔ حضری عربوں کا پیشہ تجارت تھا۔ ان کے تاجر حبشہ، عراق، ایران، شام بلکہ ایشیائے کوچک تک جاتے تھے۔ غیر ملکی تاجروں سے جو ان کے شہر میں داخل ہوتے تھے۔ وہ تجارتی ٹیکس بھی وصول کرتے تھے۔ چونکہ عرب میں کسی مرکزی حکومت کی عدم

موجودگی کی وجہ سے امن وامان کی صورتِ حال تسلی بخش نہیں تھی اور تجارتی قافلوں کو لوٹ لینا عربوں کی معاشی ضرورت تھی۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے قریش اور دیگر قبائل عرب نے تجارتی قافلوں کی بسلامت آمدورفت کی غرض سے مختلف ممالک سے معاہدے بھی کئے تھے۔

کاروانِ تجارت کی بسلامت آمدورفت کی غرض سے قریش نے بیرون واندرون عرب متعدد معاہدے کئے تھے۔ مکہ میں عبد مناف کے بیٹوں میں ہاشم نے شاہان روم اور آل غسان سے، عبد شمس نے نجاشی الا اکبر سے، مطلب نے ملوک حمیر سے اور نوفل نے اکاسرہ ایران سے، ان کے ممالک میں تجارتی قافلوں کی بحفاظت آمدورفت اور عربوں کی نوآبادیوں کے لئے اجازت حاصل کی اور معاہدے کئے۔ اسی طرح رابیہ (حضر موت) میں قریش، ملوک کندہ کی حفاظت میں اپنا مال لے جاتے تھے۔ تمام قبائل عرب میں قریش سامان تجارت لے کر جاتے تھے اور ایک تو اس وجہ سے کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی تھے اور دوسرے ان معاہدوں کی وجہ سے انہیں کوئی گزند نہیں پہنچائی جاتی تھی۔[۲۳]

قرآن مجید میں سورۃ قریش میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی احسان کی طرف اہل قریش کو متوجہ کیا ہے۔ ایک تو جی کی وجہ سے قریش کو کھانے پینے کی فراغت تھی اور چونکہ وہ خانہ کعبہ کے متولی تھے اور کعبہ کی عام عظمت اہل عرب کے دلوں میں موجود تھی اس کی بناء پر وہ "جیران اللہ" یعنی خدا کے پڑوسی سمجھے جاتے تھے۔ لوگ ان کو نہیں ستاتے تھے اور ان کے تجارتی قافلے بے دھڑک گزرا کرتے تھے۔

تجارتی غرض سے پورے جزیرہ نمائے عرب میں سال کے مختلف مہینوں میں بازار لگا کرتے تھے۔ عام تاجروں کے علاوہ بڑے سرداروں کے اسبابِ تجارت بھی ان بازاروں میں اسی وقت بحفاظت آسکتے تھے جب ان کی بار برداری اور صیانت کی ضمانت قرب و جوار کے قبائل نے دی ہو۔ عرب کے مختلف بازاروں میں اسباب وتجارت کو بحفاظت پہنچانے کی غرض سے تاجروں کو ایک رقم دینا پڑتی تھی جسے "خفارہ" کہتے تھے۔ جس کے لفظی معنی ہیں کسی کو اپنی پناہ میں لینا۔ خواہ معاوضہ

کے ساتھ یا بلا معاوضہ۔ دومتہ الجندل کے بازار میں جو ربیع الاول کے پہلے پندرہواڑے میں لگتا تھا، تجار، بنوکلب وجدیلہ کی حفاظت میں خرید وفروخت کرتے تھے۔ مشقر کے بازار میں جو جمادی الاخرۃ میں لگتا تھا، بنوعبدالقیس اور بنوتمیم کا عمل دخل تھا اور ان کی رضامندی کے بغیر یہاں مال لانا ممکن نہ تھا۔ رابیہ (حضرموت) میں بنوآکل المرار (ملوک کندہ) اور آل مسروق بن وائل حضرمی کے زیر خفارہ مال تجارت لایا جاتا تھا۔ عکاظ کا مشہور بازار جو اشہر حرام (ذوالقعدہ اور ذی الحجہ) میں لگتا تھا البتہ خفارہ سے پاک تھا۔ خفارہ کی رقم عشور کے علاوہ ہوتی تھی جو تجار کو بازار کی زمین استعمال کرنے اور راہداری کے عوض دینا پڑتی تھی۔[۲۴]

الغرض ایک ایسا معاشرہ جس کی بنیاد لاقانونیت، جس کا مزاج لامرکزیت اور جس کی معیشت غنائم پر ہو اس میں ذاتی واجتماعی حفاظت کے لئے جو طریقہ رائج ہوگا وہ قبائلی ہوگا۔ کسی مضبوط حکومت اور مذہب کی عدم موجودگی میں انفرادی اور اجتماعی بقا کی ضمانت قبائل کی باہمی عصبیت پر ہوگی۔ چنانچہ عرب جاہلیہ میں معاشرے کی ہیئت ترکیبی قبائلی نوعیت کی تھی اور قبائلی عصبیت کے باعث لوگ اپنی جان اور اپنے مال کو محفوظ تصور کرسکتے تھے۔ عربوں کی اس قبائلی عصبیت کی اساس اتحاد نسب تھی۔ چنانچہ ایک باپ کی نسل سے تعلق رکھنے والے افراد ایک رشتہ اتحاد میں پروئے ہوئے تھے۔ جب کسی قبیلے کی تعداد بڑھ جاتی تو وہ کئی حصوں میں تقسیم ہو جاتا اور یہ تمام حصے الگ الگ آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے اور صرف خاص خاص موقعوں پر مشترکہ مفاد وحفاظت کے لئے یا کسی غیر معمولی فوجی مہم کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہوجاتے تھے۔

ان قبائل کے داخلی طبقات یہ تھے۔

۱۔ شعب: (جمع شعوب) یہ بعید ترین نسبی تعلق ہوتا تھا اس کی مثال عدنان اور قحطان ہیں۔

۲۔ قبیلہ: (جمع قبائل) ایک شعب سے تعلق رکھنے والے مختلف نسلی گروہ الگ الگ شاخوں میں تقسیم ہوجاتے تھے۔ ان میں ہر شاخ ایک قبیلہ کہلاتی تھی مثلاً عدنان کی نسل سے تعلق

رکھنے والے دو بڑے قبائل میں تقسیم ہوئے جن میں ایک مضر تھے اور دوسرے ربیعہ۔قبائل کو ''جماجم'' کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

۳۔عمارۃ: (جمع عمائر یا عمارات) ایک قبیلہ مختلف نسلی سلسلوں میں بٹ جاتا تھا ان میں سے ہر سلسلہ کو عمارہ کہا جاتا تھا مثلاً مضر کا قبیلہ مختلف عمائر میں تقسیم ہوا جن میں سے ایک قریش اور دوسرے بنو غفار تھے۔

۴۔بطن: (جمع بطون یا ابطن) عمارہ کی نسلیں مختلف شاخوں میں پھیل جاتی تھیں ان میں سے ہر شاخ کو بطن کہتے تھے مثلاً قریش کی متعدد شاخوں میں سے ایک بنو عبد مناف اور دوسری بنو مخزوم وغیرہ تھی۔

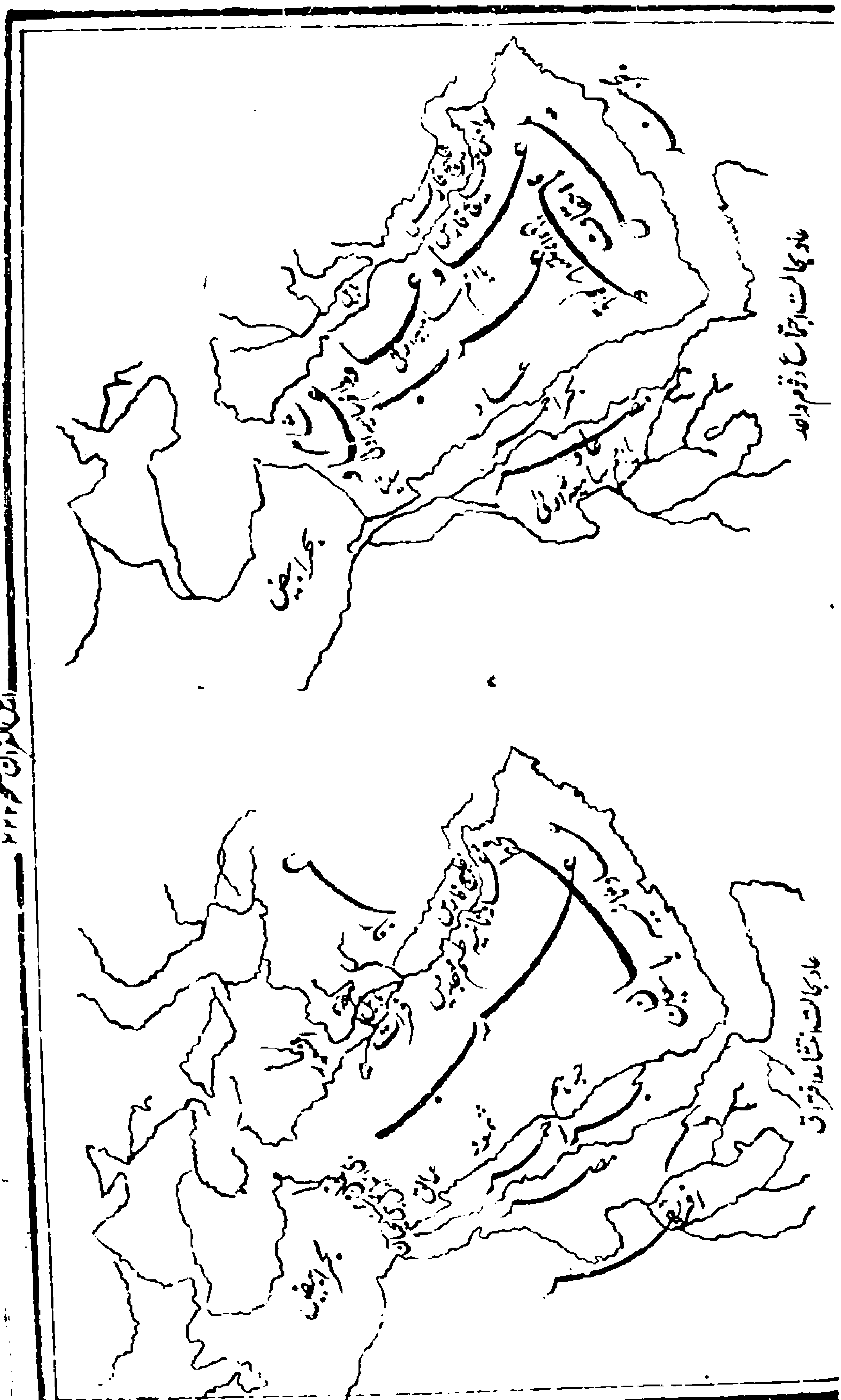
۵۔فخذ: (جمع افخاذ) بطن کے متعدد انساب الگ الگ فخذ کہلاتے تھے مثلاً بطن عبد مناف میں بنو ہاشم اور بنو امیہ کے فخذ تھے۔

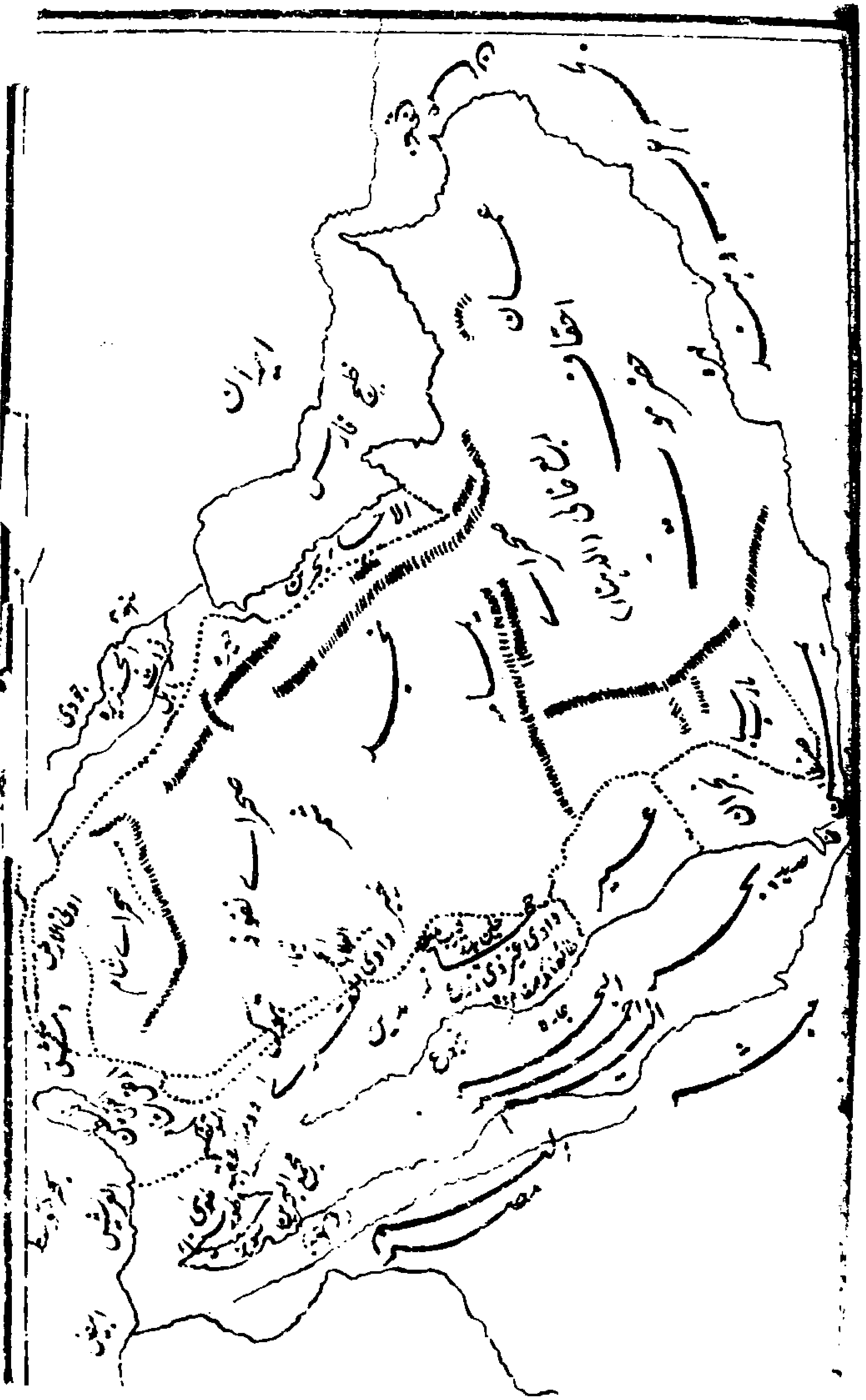
۶۔فصیلہ: (جمع فصائل) فخذ کی مزید تقسیم کو فصیلے کی اصطلاح سے ظاہر کرتے تھے مثلاً فخذ بنو ہاشم میں بنو ابی طالب اور بن عباس کے فصیلے تھے۔

۷۔اسرہ یا عائلہ: فصیلہ متعدد خاندانوں میں تقسیم ہوتا تھا ہر خاندان کو ایک الگ اسرہ یا عائلہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ مثلاً آل ابی طالب کے اسروں میں آل جعفر، آل علی اور آل عقیل کے نام ملتے ہیں۔[۲۵]

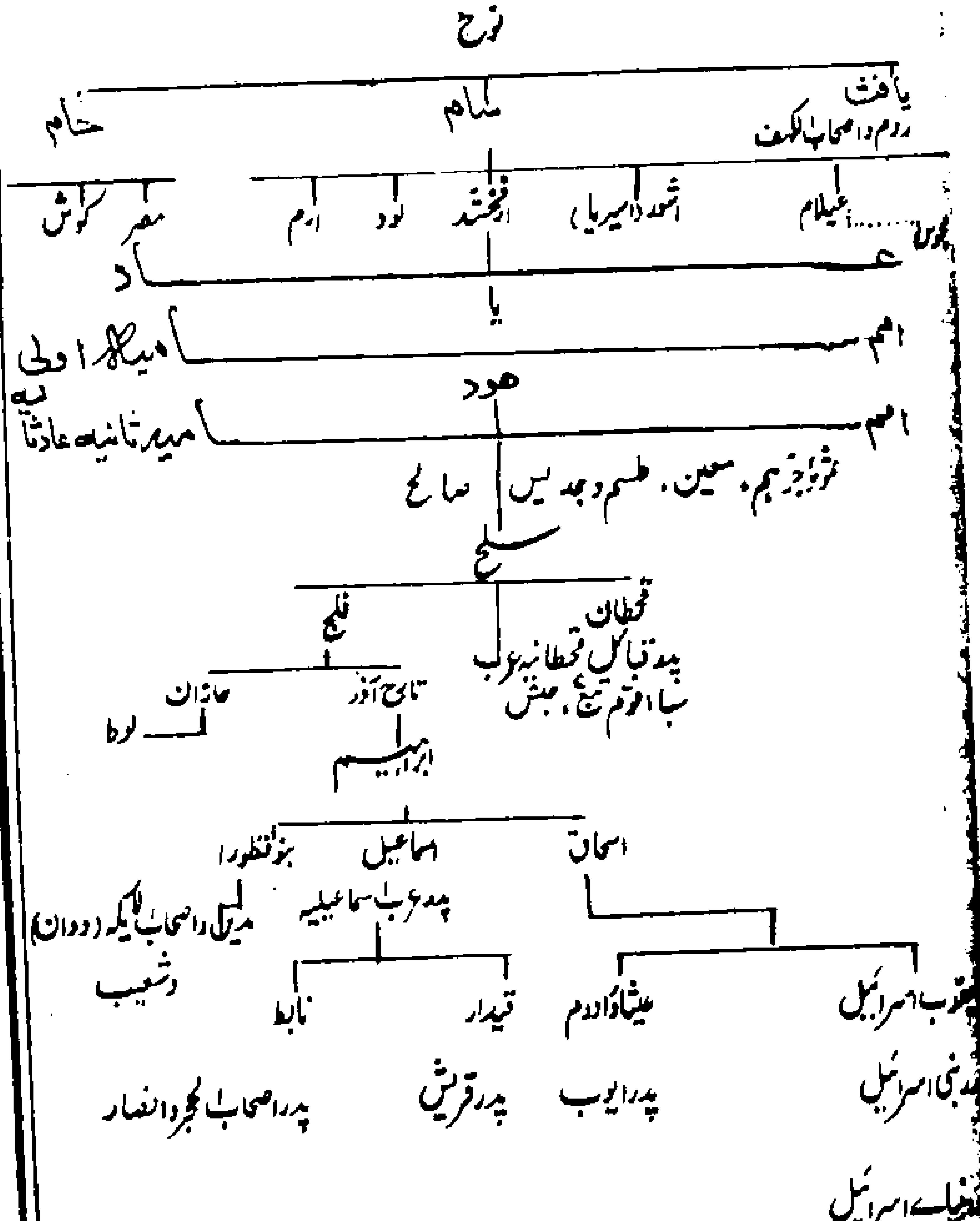
قبائل کی داخلی تقسیم

شعب	عدنان	قحطان	
قبیلہ	مضر	ربیعہ	
عمارۃ	قریش	بنوغفار	
بطن	بنوعبدمناف	بنومخزوم	
فخذ	بنوہاشم	بنوامیہ	
فصیلہ	آل ابی طالب	آل عباس	
اسرہ/عائلہ	آل جعفر	آل علی	آل عقیل





شجرۂ اقوام ارض القرآن بمطابقت توراۃ



اس تمام سلسلۂ انساب میں سے عرب اور قرآن کی تاریخ کو امم سامیہ اولیٰ، ثانیہ، بنو قحطان، بنو ابراہیم سے بحث ہے، اور یہی تین سلسلے عرب کے مستقل اور دائمی باشندے ہیں اور ان ہی کے واقعات کی تشریح اس کتاب کا موضوع ہے۔

قبائل کے ان طبقات کے درمیان اتحاد اور یک جہتی کا فقدان ہوتا تھا تاہم جب دوسروں سے مقابلہ پیش آجائے تو یہ ایک ہو جاتے تھے مثلاً ایک عائلہ کے افراد دوسرے عائلہ کے افراد کے مقابلے میں، ایک فصیلہ کے لوگ دوسرے فصیلے کے لوگوں کے مقابلے میں، ایک فخذ سے تعلق رکھنے والے فصیلے، دوسرے فخذ کے فصیلوں کے مقابلے میں وعلی ھذا القیاس

عربوں کا یہ قول مشہور تھا، میں اور میرا بھائی، چچا کے لڑکے سے جنگ کر سکتے ہیں لیکن غیر کے مقابلے میں، میں اور میرا چچازاد دونوں ایک ہیں۔[۲۶] اس قبائلی عصبیت کی حد یہ تھی کہ ہر شخص اپنے بھائی کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا تھا، خواہ اس کا بھائی ظالم ہو یا مظلوم۔ بقول ابن خلدون انسان کا یہ طبعی خاصہ ہے کہ وہ اپنے کسی عزیز، رشتہ دار پر ظلم ہوتے برداشت نہیں کرسکتا۔[۲۷]

اب ایسی حالت میں جبکہ طاقت وعصبیت کا دارو مدار قبائل پر ہوا اور ملک میں عام لاقانونیت کا چلن ہو، کوئی مربوط سیاسی نظام بھی نہ ہو تو ہر قبیلہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ اپنی قوت اور طاقت میں اضافہ کرے۔ قوت میں یہ اضافہ، کثرت تعداد ہی کی صورت میں ممکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک اولاد نرینہ کی کثرت انتہائی طمانیت کی بات تھی۔ عرب جاہلیہ میں سرداری کے لوازمات میں سے ایک کثیر العیال ہونا بھی تھا۔ جماعت کی تعداد، اکثریت کی قوت اور رشتہ داریوں کے زیادہ سے زیادہ پھیلنے کو عرب عزت وغلبہ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے عرب متعدد عورتوں سے بیک وقت نکاح کیا کرتے تھے۔

یوں تو عربی معاشرے میں عورتوں کی کوئی خاص عزت و مرتبہ نہیں تھا مگر صاحب اولاد خواتین کے شرف وعزت میں یقیناً اضافہ ہو جاتا تھا۔ عربوں میں کثیر الاولاد عورت کو ''ناتق'' کہتے تھے اور یہ عورتوں میں پسندیدہ صفت سمجھی جاتی تھی۔

جہاں تک عربوں کی مذہبی حالت کا تعلق ہے تو حضرت ابراہیم واسماعیل کی تعلیمات کو

بھلا کر اہل عرب بت پرست بن چکے تھے۔ عرب میں ہر قبیلہ، ہر شہر اور ہر علاقے کا اپنا خاص بت تھا بلکہ ہر گھر کا بت جدا تھا۔ بتوں کے بارے میں اس قدر غلو اور انہماک تھا کہ اگر کوئی شخص بت نہ تراش سکتا یا بت خانہ نہ بنا سکتا تو حرم کے سامنے یا حرم کے علاوہ جہاں بہتر سمجھتا ایک پتھر گاڑ دیتا اور اس کے ارد گرد اس شان سے طواف کرتا جس طرح بیت اللہ کے گرد طواف کیا جاتا ہے ان پتھروں کو وہ ''انصاب'' کہا کرتے تھے۔[۲۸] خود خانہ کعبہ کے اندر اور اس کے صحن میں ۳۶۰ بت تھے۔[۲۹]

بخاری میں ابو رجاء العطاردی سے روایت ہے ''ہم لوگ پتھر کو پوجتے تھے اگر اس سے اچھے قسم کا پتھر مل جاتا تو اس کو پھینک کر اس نئے پتھر کو لے لیتے اور اگر پتھر نہ پاتے تو مٹی کا ایک ڈھیر بناتے اور اس پر بکری کو لا کر دوہتے، پھر اسی کا طواف کرتے۔ کلبی کا بیان ہے کہ کوئی شخص سفر میں کسی نئے مقام پر اترتا تو چار پتھر لے آتا جو پتھر اس کو اچھا معلوم ہوتا اس کو معبود قرار دیتا اور باقی تین پتھروں کو اپنی ہانڈی کا پتھر بناتا اور جب وہاں سے جاتا تو سب پتھروں کو چھوڑ جاتا۔[۳۰]

عرب میں بت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لحی تھا اس کا اصل نام ربیعہ بن حارثہ تھا۔ عرب کا مشہور قبیلہ خزاعہ اسی کی نسل سے ہے وہ ایک دفعہ شام کے کسی شہر میں گیا وہاں کے لوگوں کو بت پوجتے دیکھا تو پوچھا کہ ان کو کیوں پوجتے ہو انہوں نے کہا یہ حاجت روا ہیں۔ لڑائیوں میں فتح دلاتے ہیں۔ قحط پڑتا ہے تو پانی برساتے ہیں۔ عمرو نے چند بت ان سے لے لئے اور لا کر کعبہ کے آس پاس نصب کئے کعبہ چونکہ عرب کا مرکز تھا اس لئے تمام قبائل میں بت پرستی کا رواج ہو گیا۔ ان میں سب سے قدیم بت مناۃ تھا یہ سمندر کے کنارے قدید کے قریب نصب تھا۔ اوس اور خزرج اسی پر قربانی چڑھاتے تھے اور جب کعبہ کا حج کر کے آتے تو احرام یہیں اتارتے تھے۔ ہذیل اور خزاعہ بھی اس کی پرستش کرتے تھے۔ سب سے بڑا بت ہبل تھا جو کعبہ کی چھت پر منصوب تھا۔[۳۱]

بتوں کے علاوہ بھی عربوں کے متعدد اور مختلف معبود تھے۔ فرشتوں کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اس لئے ان سے شفاعت کے طلبگار ہوتے ان کی پرستش کرتے اور ان کو وسیلہ بناتے۔ جنوں کو اللہ کا شریک کار سمجھتے۔ کلبی کا بیان ہے کہ قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ بنو ملیح تھی

خو جنوں کو پوجتی تھی۔[۴۲] قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش کرتا، کنانہ کا قبیلہ چاند کا پرستار تھا۔ بنو تمیم دبران کی لخم و جذام مشتری کی، بنو قیس شعری اور بنو اسد عطارد کی پرستش کرتے تھے۔[۴۳]

عرب میں یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت بھی موجود تھی۔ یہودیوں نے جنہیں آشوریوں، یونانیوں اور رومیوں نے یکے بعد دیگرے گھر سے بے گھر کیا تھا عرب میں پناہ لی تھی اور عربوں میں بہت سے لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کرلیا تھا۔ خصوصاً یثرب میں ان کا غلبہ تھا۔ عیسائیت بھی چند قبیلوں کی حد تک پھیل چلی تھی۔ مثلاً بنو حارث (نجران)، بنو حنیف (یمامہ) بنی تغلب (بین النہرین) بنی عبدالقیس (بحرین) اور خزاعہ (دومۃ الجندل) عیسائیت کے پیروکار بن چکے تھے۔ اگرچہ عیسائیت کی تبلیغ پانچ صدیوں سے ہو رہی تھی تاہم عرب میں اسے بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ مجوسیت کے نام لیوا بالخصوص آل حمیر میں موجود تھے۔

بت پرستی تو خیر بے روح چیز تھی لیکن یہودیت و عیسائیت بھی ان عربوں کی تہذیب نفس میں بری طرح ناکام رہی تھی اخلاقی اعتبار سے عرب صریح جہالت میں مبتلا تھے۔ شراب ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور عام طور سے پی جاتی تھی شراب کی دوکانیں برسرراہ ہوتی تھیں اور علامت کے طور پر ان پر جھنڈا لہراتا تھا۔ ان عربوں کی زندگی میں جوا کھیلنا بڑی خوبی کی بات تھی اور اس میں شرکت نہ کرنا پست ہمتی اور مردہ دلی سمجھی جاتی تھی۔ عالم قتادہ (تابعی) کا بیان ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک شخص اپنے گھر بار کو داؤں پر لگا دیتا تھا پھر لٹا ہوا حسرت سے اپنے مال کو دوسروں کے ہاتھ میں جاتے دیکھتا اس سے نفرت و عداوت کی آگ بھڑکتی اور جنگوں کی نوبت آجاتی۔[۴۴]

حجاز کے عرب اور یہودی سودی لین دین اور سود در سود کا معاملہ کرتے، اس سلسلہ میں بڑی بے رحمی اور سخت دلی کے مظاہرے ہوتے۔ عرب اور بالخصوص اہل مکہ شراب، جوئے اور گانے کے والہ و شیدا تھے۔ دوسرے ایشیائی ملکوں کی طرح عرب میں بھی ناچ گانا ادنیٰ طبقے کی عورتوں کا پیشہ تھا جنھیں قیان(Kiyan) کہتے تھے اور جن کی عصمت فروشی ضرب المثل تھی۔ اس کے باوجود ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی اور بڑے بڑے سرداران سے مفاخرانہ عشق بازی کرتے تھے۔ ان لوگوں کی

اخلاقی ذلت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ عورتیں اپنے گھروں میں ضیافتیں دیا کرتی تھیں جن میں شہر کے روساء وامراء شامل ہوتے تھے۔[۳۵] بے حیائی کی یہ حالت تھی کہ سب سے نامور شاعر امراء القیس ایک قصیدہ میں اپنی پھوپی زاد بہن کے ساتھ اپنی بدکاری کا قصہ مزے لے لے کر بیان کرتا ہے اور یہ قصیدہ کعبہ پر آویزاں کیا جاتا ہے۔[۳۶]

ہندوؤں کی طرح عربوں میں بھی تعداد ازدواج بے حد وحساب تھا۔ یمن کے نیم صابی اور نیم یہودی قبائل کے یہاں تو ایک عورت کا بیک وقت کئی مردوں کی بیوی ہونے کا دستور تھا۔ سامان اور حیوانات کی طرح عورتیں بھی وراثت میں منتقل ہوتی تھیں چنانچہ ایک متوفی مرد کی بیوائیں دوسرے املاک کی طرح اس کے بیٹوں کو ورثے میں ملتی تھیں۔ حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی۔ کھانے میں بہت سی چیزیں تھیں جو مردوں کے لیے خاص تھیں اور عورتیں اس سے محروم تھیں۔[۳۷]

لڑکیوں سے نفرت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ انہیں زندہ درگور کرنے کا بھی رواج تھا۔ یہ خوفناک دستور قریش اور کندہ کے قبیلوں میں سب سے زیادہ تھا اس کے علاوہ عرب کے تقریباً تمام ہی قبائل بعض ننگ و عار کی بناء پر اور بعض مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرتے۔ عرب کے بعض شرفاء و روساء ایسے موقعوں پر بچیوں کو خرید کر ان کی جانیں بچاتے۔ زید بن عمرو بن نفیل[۳۸] کے بارے میں تاریخی طور پر پتہ چلتا ہے کہ وہ قریش کے پہلے شخص تھے جنھوں نے لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی مخالفت کی، جب کوئی شخص ایسا کرتا تو وہ جا کر اس لڑکی کو مانگ لیتے اور خود اس کی پرورش کرتے۔

صعصعہ بن ناجیہ کا بیان ہے: "اسلام کے ظہور کے وقت تک میں تین سو زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو فدیہ دے کر بچا چکا تھا۔[۳۹]" بعض اوقات کسی سفر یا مشغولیت کی بناء پر لڑکی سیانی ہو جاتی اور دفن کرنے کی نوبت نہ آتی، ایسے میں جاہلی باپ دھوکہ دے کر اپنی بچی کو لے جاتا اور بڑی بے دردی سے اس کو زندہ درگور کر آتا۔

عرب میں قبائلی نظام تھا اور قبائلی نظام کی بقا شدید عصبیت میں پنہاں ہوتی ہے۔ اس

جاہلی عصبیت کے مزاج کو اس مشہور عربی جملے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ "انصر اخاک ظالما او مظلوما" یعنی اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔ اس پر مستزاد یہ کہ عرب فطرتاً جنگجو واقع ہوئے تھے۔ دراصل ان کی صحرائی اور غیر متمدن زندگی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ جنگ ان کے لیے زندگی کی ایک ضرورت ہی نہیں بلکہ تفریح و دلبستگی کا سامان بھی بن گئی تھی جس کے بغیر ان کا جینا مشکل تھا۔ ایک شاعر فخریہ کہتا ہے کہ اگر ہم کو کوئی حریف قبیلہ نہیں ملتا تو اس خواہش کی تسکین کے لیے ہم اپنے برادر و حلیف قبیلہ پر حملہ کر دیتے ہیں۔

واحیانا علی بکر اخینا اذا مالم نجد الا اخانا (حماسہ)

پورا ملک عرب گویا شکاری کا جال تھا کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ کہاں لوٹ لیا جائے گا اور کب دھوکے سے قتل کر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ بڑی سلطنتوں کو بھی اپنے قافلوں اور سفارتوں کے لیے چوکی، پہرہ اور مضبوط بدرقہ اور قبائلی سرداروں کی ضمانت کی ضرورت پڑتی تھی۔

المختصر جہاں تک چھٹی صدی کا تعلق ہے تو اس زمانے میں عربوں سمیت روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نہیں تھی کہ جو من حیث القوم صالح کہی جا سکے اور کوئی معاشرہ ایسا نہیں تھا جو اخلاق کی اعلیٰ اقدار کا حامل ہو۔ اس عالمگیر تاریکی کا نقشہ سورۃ روم میں کھینچا گیا ہے۔

ظہر الفساد فی البر و البحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون (الروم۔۴۱)

ترجمہ: خرابی پھیل گئی ہے خشکی اور تری میں۔ لوگوں کے اعمال کے نتیجے میں تاکہ اللہ ان کے بعض اعمال کا مزا چکھا دے اور وہ باز آ جائیں۔

○○○○○

حواشی و حوالہ جات

[۱] ندوی، سید سلیمان، تاریخ ارض القرآن ص ۵۷ و ۵۸

[۲] ایضاً ص ۵۹، (بحوالہ بائبل، کتاب استثناء)

[۳] ایضاً

[۴] عرب اس کو خلیج عرب (Arabian Gulf) کہتے ہیں۔

[۵] القرآن، سورہ اعراف ۔۹ (ترجمہ: (اے عاد کے لوگو) خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ اس نے قوم نوح کے بعد تم کو اپنی خلافت (یعنی حکومت) عطا کی)

[۶] تاریخ ارض القرآن، ص ۱۲۹

[۷] ابن قتیبہ، المعارف، ص ۶۵، (مترجم علی محسن صدیقی) قرطاس، کراچی، ۱۹۹۹ء

[۸] اس کو وادی القریٰ اس لیے کہتے تھے کہ عہد قدیم میں یہ وادی چھوٹی چھوٹی آبادیوں سے جابجا آباد تھی۔ اس کے کھنڈر اب بھی باقی ہیں، راقمہ نے بھی یہ کھنڈرات ۱۹۹۷ء میں دیکھے ہیں۔

[۹] تاریخ ارض القرآن، ص ۳۱۶

[۱۰] مشہور جاہلی شاعر نابغہ زبیانی، جو اسلام سے کچھ پہلے گزرا ہے، اس نے ایک قصیدہ میں عرب کے قبائل بائدہ کا ذکر کیا ہے۔ دیکھئے ارض القرآن، ص ۲۲۰

[۱۱] نعمانی، شبلی، سیرۃ النبی، جلد اول، ص ۱۱۰، اعظم گڑھ، انڈیا، طبع چہارم، (تاریخ ندارد)

[۱۲] ایضاً، ص ۱۱۱، (بحوالہ آر، نکلسن لٹریری ہسٹری آف دی عربس، کیمبرج، ص ۴ تا ۶)

[۱۳] دیکھئے موسیو گستاد لیبان، تمدن عرب، صفحات ۱۹۲ تا ۱۹۵، نیز ''العرب قبل الاسلام'' از ڈاکٹر جواد علی

[۱۴] پروفیسر نولد یکی (Historians History of the World)، جلد ۸

[۱۵] اس کا ذکر قرآن مجید، سورۃ سبا، آیات ۱۵، ۱۶ میں بھی آیا ہے۔

[۱۶] ارض القرآن، جلد اول، ص ۲۵۴

[۱۷] المصری، احمد امین، فجر الاسلام، ص ۱۷، الجنتہ التالیف والترجمہ والنشر، قاہرہ، ۱۹۶۵ء

[۱۸] گستاولیبان، تمدن عرب ص ۱۹۶۔

[۱۹] تاریخ ارض القرآن، جلد ۲، ص ۳۸۳

[۲۰] دورِ عمر فاروق میں شام کی فتح کے دوران جبلہ مسلمان ہوگیا، بعد میں مسلمانوں کے جذبہ مُساوات کی تاب نہ لاتے ہوئے مدینہ سے بھاگ کر قیصر کے پاس چلا گیا اور قسطنطنیہ میں ہی ۲۰ ھ میں فوت ہوا۔

[۲۱] ظہیر، نگار سجاد، عرب اور موالی ص ۲۲، قرطاس، کراچی، ۲۰۰۶ء

[۲۲] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، جلد اول ص ۱۹۵ تا ۱۹۸، نیز ص ۳۰۷، مصطفیٰ بابی حلبی، مصر ۱۹۵۵ء، عزالدین ابی الحسن علی بن محمد، ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، جلد اول، ص ۵۰۲ تا ۶۸۴، دار صادر، بیروت، ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء

[۲۳] ابن سعد، طبقات الکبریٰ جلد اول، ص ۷۵، ۷۸، دار صادر، بیروت، ۱۹۸۵ء، تاریخ طبری، جلد ۲، ۲، ص ۲۵۲۔ صدیقی، علی محسن، "عرب جاہلیہ میں موالی" ماہنامہ آگہی، جلد ۲، شمارہ ۵، بابت مئی ۱۹۹۰ء، ص ۶۷

[۲۴] مرزوقی، شیخ ابی علی الاصفہانی، الازمنہ والامکنہ، جلد ۲، ص ۱۶۱، ۱۶۷، حیدرآباد دکن، ۱۳۳۳ھ، صدیقی، علی محسن۔ "عرب جاہلیہ میں موالی، ص ۶۹

[۲۵] ابن منظور افریقی، لسان العرب، جلد ۵، ص ۷۷، بولاق مصر، ۱۳۰۷ھ

[۲۶] جرجی زیدان، تاریخ تمدن الاسلامی، جلد ۴، ص ۱۹، دار الہلال، قاہرہ، ۱۹۴۷ء

[۲۷] ابن خلدون، مقدمہ، ص ۱۰۸، دار صادر، بیروت

[۲۸] امام بخاری، صحیح بخاری، مترجم امجد العلی، محمد سعید اینڈ سنز، کراچی، جلد ۲، ص ۶۳

[۲۹] ندوی، ص ۷۰

[۳۰] نعمانی، شبلی، سیرۃ النبی جلد اول، حصہ اول، ص ۱۲۱-۱۲۰، طبع چہارم، اعظم گڑھ

[۳۱] ندوی، ص ۷۰ (بحوالہ کتاب الاصنام)

[۳۲] شبلی، ص ۱۱۹

[۳۳] ندوی، ص ۷۱، (بحوالہ تفسیر طبری)

[۳۴] روح اسلام، امیر علی، ص ۲۱

[۳۵] شبلی، ص ۱۲۷

[۳۶] امیر علی، ص ۲۲۸

[۳۷] القرآن، سورۃ انعام، ص ۱۴۰

[۳۸] شبلی، ص ۱۲۵

[۳۹] ندوی، ص ۷۳، (بحوالہ کتاب الاغانی)

باب نہم

اسلامی تہذیب

اس ہمہ گیر تاریکی میں جس سراج منیر نے روشنیاں پھیلائیں وہ حضرت محمدؐ تھے۔

الر کتب انزلنہ الیک لتخرج الناس من الظلمت الی النور باذن ربھم الی صراط العزیز الحمید (ابراہیم - ۱)

آپ نے قرآن کے حوالے سے دین اسلام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اسلام کوئی نیا دین نہیں تھا بلکہ اس کی ابتداء حضرت آدمؑ سے ہوئی تھی۔ مختلف انبیاء نے مختلف زمانوں میں اپنی تعلیمات کا پرچار کیا اور بالآخر اسے رسول اللہ کے ہاتھوں مکمل کیا گیا۔

"اسلام" کے لفظی معنی اطاعت و فرمانبرداری کے ہیں۔ اس کے دوسرے معنی سلامتی' عیوب و آفات سے پاک اور آفتوں سے بہت زیادہ محفوظ کے لئے جاتے ہیں۔[1] اصطلاحاً اسلام سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے حکم کے سامنے بلا چوں و چرا سر جھکا دیا جائے۔ اور غیر مشروط اطاعت کی جائے۔ اسلام کے قریب قریب ہم معنی لفظ "صلح" ہے۔ صلح کے معنی سلامتی' رضامندی' دوستی اور مصالحت کے ہیں صلح کے مخالف لفظ "فساد" ہے۔[2] فساد کے معنی خراب ہونے اور بگڑ جانے کے ہیں یہ اسلام کی ضد ہے۔

اسلام جسے قرآن "دین" سے تعبیر کرتا ہے پہلے عقائد و ایمانیات کے ذریعہ انسانی فکر کی تطہیر کرتا ہے۔ پھر اسی مطہر فکر پر عبادات و معاملات کے ذریعہ صالح اعمال کی بنیاد رکھتا ہے اور یوں ایک مکمل تہذیبی نظام نوع انسانی کو عطا کرتا ہے۔ یہ اسلامی تہذیب فی نفسہ چند ایسی امتیازی خصوصیات کی حامل ہے جو کسی دوسری عالمی تہذیب

میں نہیں ہو سکتیں۔

اسلامی تہذیب کی خصوصیات

(ا) آفاقیت : ۔ اسلام چونکہ ایسا دین ہے جو پوری دنیا کے لئے ہے۔ اس کا مخاطب انسان ہے جو دنیا کے کسی بھی علاقہ سے تعلق رکھتا ہو لہذا اس دین پر تعمیر ہونے والی تہذیب بھی مقامی نہیں آفاقی ہوگی۔ اگر ہم علاقائی اعتبار سے دیکھیں تو رومی یا ایرانی یا ہندوستانی یا چینی تہذ یبیں مقامی تہذ یبیں تھیں اور اگر ہم مذہب کے اعتبار سے دیکھیں تو عیسائی یا بدھ تہذیب کو بھی آفاقیت کا دعوی نہیں جب کہ اسلامی تہذیب وہ تہذیب ہے جو جغرافیائی حدوں سے بالا تر ہے اور اپنے میلان و رجحان کے اعتبار سے پوری انسانیت پر حاوی ہے۔ محمدؐ کوئی علاقائی پیغامبر نہیں تھے بلکہ رحمتہ العالمین (تمام دنیا کے لئے رحمت تھے) اور اسلام کا پیغام تمام دنیا کے لئے ہے۔

ان ھو الا ذکری للعلمین (انعام - ۹۰)

(نہیں ہے مگر نصیحت تمام دنیا کے لئے)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

تبرک الذی نزل الفرقان علے عبدہ لیکون للعلمین نذیرا الذی لہ ملک السموات والارض (فرقان)

(برکت والا ہے وہ (خدا) جس نے اپنے بندہ پر فیصلہ والی کتاب اتاری تاکہ وہ تمام دنیا کو ہوشیار کرنے والا ہو وہ (خدا) کہ اسی کی ہے سلطنت آسمان اور زمین کی)

نیز

وما ارسلنک الا کافۃ للناس بشیرا و نذیرا (سبا)

(اور ہم نے نہیں بھیجا تم کو (اے محمدؐ) لیکن تمام انسانوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر)

ان حوالوں سے یہ بات پوری طرح ثابت ہوتی ہے کہ سارے مذاہب میں صرف اسلام نے ہی اپنی آفاقیت اور اپنے عالمگیر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "مجھ سے پہلے تمام انبیاء صرف اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے اور میں تمام قوموں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔"

یہی وجہ ہے کہ ہر دوسری تہذیب صرف ایک ہی نسل اور ایک ہی قوم کے ناموروں پر فخر کر سکتی ہے لیکن اسلامی تہذیب ان تمام اقوام و قبائل کے سپوتوں پر فخر کر سکتی ہے جنھوں نے مشترکہ طور پر اس تہذیب کو اپنایا ہو۔ سلمان فارسی' عمر بن خطاب' بلال حبشی' ابو حنیفہ' مالک' شافعی' احمد' الکندی' الفراء' الفارابی' ابن رشد اور سینکڑوں دوسرے مشاہیر مختلف قوموں اور ملکوں سے تعلق رکھنے کے باوجود فرزندان اسلام ہی تھے جن کے ذریعے سے اسلامی تہذیب نے انسانیت کے سامنے فکر سلیم کے بہترین نتائج و ثمرات پیش کیے۔

الغرض اسلامی تہذیب کوئی قومی یا نسلی تہذیب نہیں بلکہ صحیح معنوں میں انسانی تہذیب ہے۔ یہ انسان کو بحیثیت انسان کے خطاب کرتی ہے اور ہر اس شخص کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہے جو اس کی فکر (ایمانیات) کو قبول کرے۔ اس طرح اس تہذیب نے ایک ایسی قومیت بنائی ہے۔ جس میں بلا امتیاز رنگ و نسل ہر انسان داخل ہو سکتا ہے۔

(۲) الہامیت :- اسلامی تہذیب کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ الہامی تعلیمات پر مبنی ہے اس نظام کی فکری بنیادیں عقل انسانی کی کوششوں کا نتیجہ نہیں بلکہ ربانی ہدایات پر مشتمل ہیں۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدی ودین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون (الصف۔۹) (وہی (پاک ذات) ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام دیگر ادیان پر غلبہ عطا کرے خواہ یہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔)

جب کہ دوسری تہذیبیں' بدھ مت' مانویت' زرتشتیت اور کمیونزم وغیرہ انسانی فکر کے نتائج ہیں بلاشبہ ان میں سے بعض انسانی مسائل کے حل کرنے کی بڑی مخلصانہ کوشش ہیں لیکن انسان بہرحال انسان ہے مخلوق خالق کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا لہٰذا انسانی ذہن کی پرواز بھی ایک حد سے آگے نہیں جا سکتی۔ انسانی ذہن کی اسی کمزوری کی وجہ سے یہ سارے نظام ہائے حیات جزوی اور وقتی ہیں۔ اس کے برخلاف اسلام خالق کی طرف سے آیا ہوا نظام حیات ہے جس میں کسی کے لئے اپنی طرف سے کسی بات کے بڑھانے یا گھٹانے کی گنجائش نہیں۔ اس کے تمام بنیادی اصول غیر متبدل ہیں۔

یوں تو نصرانیت اور عیسائیت بھی الہامی مذاہب تھے لیکن اب ان کی تعلیمات محفوظ نہیں کچھ اس وجہ سے کہ وہ مذاہب اپنے زمانوں میں ضبط تحریر میں نہیں لائے جاسکے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ بعد میں ان مذاہب کے پیروکاروں نے ان میں بے شمار تبدیلیاں کیں اور اپنی من مانی باتیں داخل کر دیں۔ ان میں سے کوئی پیغام بھی اپنی اصلی اور خالص شکل میں نہیں ہے۔ چنانچہ اسلام ہی موجودہ دنیا کا واحد الہامی مذہب رہ جاتا ہے اور یہ الہامیت اسے تمام دوسرے نظامہائے حیات سے مختلف اور ممتاز کرتی ہے۔

(۳) جامعیت :- اسلام زندگی کا ایک نہایت منظم ضابطہ ہے۔ حیات انسانی کا کوئی گوشہ اسلام کی ہدایات سے محروم نہیں رہا ہے انفرادی معاملہ ہو یا اجتماعی' دینی ہو یا دنیاوی' قومی ہو یا بین الاقوامی' معاشی ہو یا معاشرتی' عدالتی ہو یا سیاسی ہر شعبۂ ہائے حیات کے لئے اسلام مکمل راہنمائی فراہم کرتا ہے لہٰذا وہ تہذیب جو اسلامی فکر پر تعمیر ہوئی ہو ایک مکمل اور جامع تہذیب کہلائے گی۔

جب کہ بعض مفکرین نے جو نظریات پیش کئے وہ پوری زندگی کا احاطہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مثلاً بدھ اور جین مت کی تعلیمات میں خدا کی ذات' صفات' حقوق اللہ اور اس کی اطاعت ووفا کیشی کا سرے سے کوئی باب ہی نہیں۔ اسی طرح

دنیاوی معاملات میں بھی یہ مذاہب تشنہ تعلیمات فراہم کرتے ہیں۔ بدھ نے اپنے تمام اہل و عیال، حکومت و خاندان کو چھوڑ کر ایسا سنیاس لیا کہ پھر کبھی اپنی پیاری بیوی اور اکلوتے بیٹے سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ ان حالات میں بدھ کی سیرت ان انسانوں کی کیا راہنمائی کر سکتی ہے جو اس دنیا میں رہتے بستے ہیں "کیا بدھ کی زندگی میں ایسی جامعیت ہے جو تاریک الدنیا بھکشوؤں اور کاروباری انسانوں دونوں کے لئے قابل تقلید ہو؟ اسی لئے اس کی زندگی کبھی بھی اس کے ماننے والے کاروباریوں کے لئے قابل تقلید نہ بنی ورنہ چین، جاپان، سیام و انام تبت و برما کی تمام سلطنتیں، ضاعیاں اور دیگر کاروباری مشاغل فوراً بند ہو جاتے اور بجائے آباد شہروں کے صرف سنسان جنگلوں کا وجود رہ جاتا۔ [۳]

اسی طرح سے اب تک آنے والے انبیاء و پیغمبروں کی سیرتیں قابل تقلید ہونے کے باوجود نہ تو اس قدر جامع تھیں کہ زندگی کے تمام معاملات کا احاطہ کرتیں اور نہ ہی بد قسمتی سے وہ محفوظ رہ سکیں۔ حضرت موسیٰ کی زندگی کا ایک ہی پہلو نہایت واضح ہے اور وہ ہے جنگ اور سپہ سالاری کا پہلو ورنہ اس کے علاوہ ان کی سیرت کی پیروی کرنے والوں کے لئے دنیاوی حقوق، واجبات، فرائض اور ذمہ داری کا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ نے شادی نہیں کی تھی لہٰذا معاملات کا یہ اہم ترین باب ان کی سیرت میں موجود نہیں پھر انہوں نے محکومی کی زندگی بسر کی اس لئے ان کی سیرت تمام حاکمانہ فرائض کی مثالوں سے خالی ہے۔

اس کے برعکس رسول اللہ ؐ کی سیرت اور اسلام کی ایک ایک تعلیم نہ صرف محفوظ ہے بلکہ بجا طور پر اپنی جامعیت کی دعویدار ہے۔ پھر اسلام ہر دو معاملہ میں عادلانہ توازن بھی قائم کرتا ہے۔ انفرادیت و اجتماعیت میں توازن قائم کرتا ہے۔ دین و دنیا میں توازن قائم کرتا ہے۔ رسول اللہ ؐ کا ارشاد ہے۔ "میں تو سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں۔ روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ عائلی زندگی بھی گذارتا ہوں، پس اللہ سے ڈرو، تمہارے نفس کا تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے۔ ہر حق اس کے حقدار کو ادا کرو۔

(۴) کاملیت : - اسلام ایک ایسا مکمل دین ہے جس کا اپنا نظام فکر، اپنا نظام عمل اور اپنا نظام نفاذ ہے۔ اسلام پہلے انسانی ذہن کو ایمانیات سے جلا بخشتا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کا واضح تصور دے کر اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ان ایمانیات کا دو طرح سے اظہار کرے ایک عبادات (نماز، روزہ، حج، زکواۃ، جہاد) کے ذریعہ تو دوسرا تعلقات و معاملات میں اسلام کے متعین کردہ اصولوں پر پابندی کے ذریعہ۔ نیز سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام اپنے اسی نظام فکر و عمل میں سے قوت نافذہ بھی مہیا کرتا ہے اور وہ ہے خوف خدا اور آخرت کا تصور۔

ایک ایسی جگہ جہاں کسی پولیس یا فوج یا محتسب کا ڈر نہ ہو ایک مومن برائی سے کیوں بچتا ہے؟ کیونکہ اس کا ایمان ہے کہ خدا دیکھ رہا ہے اور قیامت میں اسے اس عمل کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ جس تہذیب کی بنیاد ایسے کامل دین پر ہوگی اسے بجا طور پر اپنی کاملیت کا دعویٰ بھی ہوگا۔

حواشی و حوالہ جات

۱ - المنجد ص ۴۸۸

۲ - ایضاً ص ۵۷۳

۳ - ندوی، سید سلیمان "خطبات مدارس" کراچی ۱۹۶۶ ص ۵۰

باب دہم

اسلامی تہذیب کی بنیادیں

(توحید ۔ رسالت ۔ آخرت)

اسلامی تہذیب کی عمارت جن بنیادوں پر قائم ہے وہ اسلامی عقائد ہیں۔ انسان[1] کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ یہ عام خیالات درحقیقت اس کے چند پختہ، غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں انہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں اور یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے بالفاظ دیگر عقیدہ عمل کی اساس ہے۔

عقیدہ پر یقین کرنے کا نام ایمان ہے۔ ایمان کے لغوی معنی محفوظ کرنے یا کسی یا شخص پر اعتماد رکھنے کے ہیں۔ اس کے دوسرے معنی طمانیتہ النفس (اطمینان قلب) اور زوال الخوف (خوف کا نہ ہونا) کے ہیں۔ جو اونٹنی غریب اور مطیع ہوتی ہے اس کو "امون" کہتے ہیں۔

اسلامی اصطلاح میں ایمان سے مراد یہ ہے کہ انسان دل کی تصدیق سے حق کا اقرار اور اس کی متابعت کرے۔ چنانچہ جو شخص اسلام کے بنیادی اصولوں کی تصدیق کرتا ہے وہ مومن ہے اور جو اس کی تکذیب کرتا ہے وہ کافر ہے۔

ایمان اور اسلام بالعموم مترادف الفاظ ہیں لیکن جہاں جہاں الگ معنوں میں استعمال ہوئے ہیں وہاں "اسلام" ظاہری اقرار و عمل اور "ایمان" قلبی تصدیق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام، ایمان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں امام غزالیؒ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اسلام اور ایمان مترادف (ہم معنی) بھی ہیں، مختلف المعنی بھی اور بر سبیل تداخل بھی ہیں (یعنی ایک کے مفہوم کا ایک حصہ، دوسرے میں موجود ہے)۔

یہ اسلامی عقائد اسلامی تہذیب کے تشکیلی عناصر ہیں یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح ضروری ہے کیونکہ انسان کے خیالات اور ارادوں پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔ صالح عقائد موجب بنتے ہیں صالح اعمال کے اور صالح اعمال ایک صالح فرد کو جنم دیتے ہیں اور پھر صالح افراد کی وجہ سے ایک پاکیزہ معاشرہ اور ایک پاکیزہ تہذیب وجود میں آتی ہے۔ بالفاظ دیگر جب اشتراک فکر کا نتیجہ اشتراک عمل کی صورت میں ظاہر ہوگا تو وہ انسانوں کو ایک قوم بنادے گا۔ اس اعتبار سے اسلامی تہذیب کی تاسیس و تشکیل میں ان عقائد کا بڑا دخل ہے جو قومی سیرت کو بناتے اور پختہ کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں اسلام کے یہ بنیادی عقائد اتنی تفصیل اور تکرار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں کہ ان میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔ مجموعی طور پر قرآن پانچ عقائد (عقائد خمسہ) پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ یہ ہیں :-

۱ - خدا پر ایمان

۲ - ملائکہ پر ایمان

۳ - الہامی کتب ایمان

۴ - انبیاء علیہم السلام پر ایمان

۵ - یوم آخر یعنی قیامت پر ایمان[۳]

یہ پانچوں ایمانیات مل کر ایک ناقابل تجزیہ کل بناتے ہیں یعنی ان کے درمیان ایسا ربط ہے کہ ان میں سے کسی ایک جز کا بھی اگر انکار کیا جائے تو اس سے کل کا انکار لازم آتا ہے اسلام جس قسم کی تہذیب قائم کرنا چاہتا ہے اس کے لئے انہی ایمانیات کی اس کو ضرورت ہے نیز اس میں کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو عقلی و علمی ترقی کا ساتھ نہ دے سکتی ہو یا جس کو ماننے سے عقل سلیم انکار کرتی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ

عقل ان کا احاطہ نہیں کر سکتی اور اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتی لیکن ہمارے اہل علم و حکمت نے اب تک جتنے مجردات و مفارقات کی تصدیق کی ہے ان سب کا یہی حال ہے۔ توانائی (Energy)' حیات (Life)' جذب و کشش اور نشو و ارتقاء اور ایسے ہی دوسرے امور کی تصدیق ہم نے اس بناء پر نہیں کی ہے کہ ہم ان کی حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں بلکہ اس بنا پر کی ہے کہ ہم نے جن مختلف قسم کے مخصوص آثار کا مشاہدہ کیا ہے ان کی توجیہہ و تعلیل کے لئے ہمارے نزدیک ان امور کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اور ظواہر اشیاء کے باطنی نظام کے متعلق جو نظریات ہم نے قائم کئے ہیں وہ ان امور کے موجود ہونے کا تقاضا کرتے ہیں۔ پس اسلام جن مجردات پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے ان کی تصدیق کے لئے بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہماری عقل ان کی حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ لے اور ان کا احاطہ کر لے۔ بلکہ اس کے لئے عقلی طور پر صرف اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہے کہ کائنات اور انسان کے متعلق جو نظریہ اسلام نے پیش کیا ہے وہ خلاف عقل نہیں ہے۔[؎]

الغرض خدا کی حقیقت خواہ ہماری سمجھ میں نہ آئے مگر اس کا وجود تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر کائنات کا معمہ کسی طرح حل نہیں ہوتا۔ اسی طرح ملائکہ کے وجود کی کیفیت ہم متعین نہیں کر سکتے مگر ان کے نفس وجود میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ تمام اہل علم و حکمت نے ان کی ہستی کو کسی نہ کسی طور پر تسلیم کیا ہے اگرچہ وہ ان کو ان ناموں سے یاد نہیں کرتے جس سے قرآن انہیں موسوم کرتا ہے۔[5]

یہی معاملہ وحی اور رسالت کا ہے کہ اس ضمن میں کوئی سائنٹیفک ثبوت تو پیش نہیں کیا جاسکتا مگر جن کتابوں کو وحی الٰہی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے ان کے معانی' اور جن لوگوں کو خدا کا رسول کہا گیا ہے ان کی سیرتوں پر غور کرنے سے ایک شخص بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ نوع انسانی کے افکار و اعمال پر ان کے جیسے پائیدار' مفید اور وسیع اثرات کسی کتاب اور کسی راہنما نے نہیں ڈالے۔ یہ بات اس امر کا یقین کرنے کے لئے کافی ہے کہ ان میں کوئی غیر معمولی بات ضرور تھی جو نہ

انسانی تصنیفات کو نصیب ہے اور نہ معمولی انسانی لیڈروں کو۔

قیامت کا آنا نہ صرف عقلی قیاسات کی رو سے اغلب بلکہ قریب بہ یقین ہے۔ انسان کا اپنے خدا کے آگے جوابدہ ہونا اور اپنے اعمال کے لئے مستوجب جزا و سزا ہونا کسی قطعی دلیل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا مگر عقل سلیم اس حد تک تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ انسان کی موت اور موت کے بعد کی حالت کے بارے میں جتنے نظریات قائم کئے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ' بہتر' نتیجہ خیز اور اقرب الی القیاس نظریہ وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔[6]

الغرض اسلامی عقائد میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ علمی اور عقلی ارتقاء کی کسی منزل پر پہنچ کر انسان ان کو رد کر دینے پر مجبور ہو بلکہ جیسے جیسے علم ترقی کر رہا ہے عقل اس کی اغلبیت کا حکم لگاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار اپنے مخاطب انسان کو غور و فکر کرنے اور عقل استعمال کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ بار بار انسان سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ کائنات کی نشانیوں پر غور و فکر اور تدبر کرے تاکہ خدا اور اس کے اصولوں کی حقانیت کو جان سکے۔

بظاہر کبھی کبھی عقل و مذہب آپس میں متضاد نظر آتے ہیں ایسا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ عقل انسانی نے ابھی اپنا سفر تحقیق مکمل نہیں کیا ہے اور نہ ہی اس کے نتائج و ثمرات نے قطعیت کا درجہ حاصل کیا ہے۔ چنانچہ عقل انسانی ابھی اس لائق نہیں ہو پائی کہ الٰہیات کی گتھیوں کو مکمل طور پر سلجھا سکے اور حیات و کائنات کے تمام تر اسرار و رموز کو قطعی اور واضح انداز میں بیان کر سکے جب کہ مذہب نے اپنا سفر مکمل کر لیا ہے اور ان تمام حقائق کو کھول کر واضح کر دیا ہے جو زندگی کی راہنمائی کے لئے ضروری ہیں۔

المختصر اسلامی عقائد پر ایمان' اسلامی تہذیب کی بنیادیں ہیں انسان سے اسلام کا اولین و بنیادی مطالبہ یہی ہے کہ وہ ان اصولوں (عقائد) پر ایمان لائے۔ ایمان کا مطالبہ اس قدر شدت سے اسی لئے کیا گیا ہے کہ اسلام کا نظام تہذیب اسی پر مبنی ہے اور ایک مستحکم اور صالح معاشرہ کی بنیاد کا دار و مدار انہی عقائد پر ایمان میں پنہاں ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱ - ندوی، سید سلیمان "سیرۃ النبی جلد ۳ ص ۳۰۵" لاہور، ۱۹۸۱ء، طبع دوئم

۲ - امام غزالی، احیاء علوم

۳ - اگرچہ حدیث میں ایک چھٹی چیز کا ذکر بھی آتا ہے یعنی "والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ" لیکن درحقیقت یہ ایمان باللہ ہی کا ایک جزو ہے اور قرآن میں اسی حیثیت سے اس کو بیان کیا گیا ہے۔ حدیث میں اس کے علیحدہ ذکر کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایمان باللہ کا یہ جزاہم بھی ہے اور خفی بھی۔ اس لئے ذہن میں اس کو مستحضر رکھنے کی خاطر علیحدہ ذکر کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔

(بحوالہ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ص ۳۲

۴ - مودودی، سید ابوالاعلیٰ "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول اور مبادی" لاہور ۱۹۹۰ء ص ۳۵

۵ - ایضا

۶ - "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" ص ۳۷

باب یازدہم

توحید

توحید کے معنی ہیں اللہ کو ایک ماننا۔ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک نہ مانا جائے یعنی یہ اعتقاد رکھا جائے کہ الٰہ ہونے میں اور الوہیت کی خصوصیات میں اس کا کوئی ساجھی یا شریک نہیں ہے۔ کمال توحید یہ ہے کہ نفس میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جائے جس سے وہ بے اختیار اللہ کو اپنی ذات وصفات اور افعال میں یکتا جان لے۔

عقیدہ توحید جملہ اسلامی عقائد کی بنیاد اور رسول اللہ کے نصاب درس کا پہلا سبق ہے۔ اسلام کے پورے اعتقادی اور عملی نظام میں پہلی اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے باقی جتنے اعتقادات و ایمانیات ہیں سب اسی ایک اصل کی فرع ہیں اور جتنے اخلاقی احکام اور تمدنی قوانین ہیں سب اسی مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ ملائکہ پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے ملائکہ ہیں۔ کتابوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کی نازل کردہ ہیں۔ رسولوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے ہیں۔ یوم آخرت پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے انصاف کا دن ہے۔ حقوق و فرائض پر عملدرآمد اور اوامر کا امتثال اور نواہی سے اجتناب اس لئے ضروری ہے کہ وہ من جانب اللہ ہیں غرض اسلام میں ہر عقیدہ و ہر عمل کی بنیاد توحید پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ نے توحید کو تمام اقسام نیکی میں بمنزلہ دل کے قرار دیا ہے۔ اگر وہ درست ہے تو سب نیکیاں درست ہیں اور اگر وہ فاسد ہے تو سب نیکیاں فاسد ہیں۔

دنیا کے تقریباً سارے ہی مذاہب میں خدا یا خداؤں کا تصور پایا جاتا ہے۔ لہٰذا

اسلام نے اپنی تعلیمات میں وجود ذات باری کا مسئلہ نہیں چھیڑا کیونکہ یہ دنیا کے لئے پہلے ہی قابل قبول تھا۔ انسان فطرتاً ایک قادر مطلق اور خالق کائنات ہستی کا معترف ہے۔ متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی اقوام میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے اور جماعت انسانی کا کوئی حصہ' زمین کا کوئی گوشہ اور زمانہ کا کوئی عہد بھی اس تخیل سے خالی نہیں ملتا البتہ اسلام کے مختصات میں جو چیز ہے وہ توحید ہے کیونکہ دوسرے مذاہب میں یا تو سرے سے توحید تھی ہی نہیں اور اگر تھی تو کامل نہیں تھی۔ اسی بناء پر قرآن نے بار بار کہا کہ کفار کو بھی خدا سے انکار نہیں کفار کو جو وحشت ہے وہ توحید سے ہے۔

"جب اکیلا خدا پکارا جاتا ہے تو تم منکر ہو جاتے ہو اور اگر کوئی اور شریک کرلیا جائے تو تم مان لیتے ہو اور جب خدا کا تنہا ذکر کیا جاتا ہے تو منکرین قیامت کے دل بدک جاتے ہیں"۔(القرآن)

توحید کامل کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح خدا کی ذات میں کوئی شریک نہیں اسی طرح وہ اپنی صفات میں بھی یکتا ہے نیز اس کے اختیارات اور اس کے حقوق میں بھی کوئی شریک یا ساجھی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم جن اسباب کی وجہ سے خدا کے وجود کا یقین کرتے ہیں بالکل وہی اسباب اس کے ایک ہونے کا بھی تقاضا کرتے ہیں نظام عالم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو بظاہر وہ کثیرالاجزاء یا کثیرالافراد ہے لیکن سب مل کر ایک کل بناتے ہیں اور اس کل کا ہر ہر پرزہ دوسرے سے اسقدر وابستہ ہے کہ وہی ایک شخص اس کو چلا سکتا ہے جو تمام پرزوں کا موجد اور ان کے باہمی تناسب کا محافظ ہو۔

اسی بات کو امین احسن اصلاحی اس طرح کہتے ہیں کہ اس کائنات کے مختلف اجزاء میں کمال درجہ کی موافقت اور باہمی سازگاری ہے اور اس کائنات کی ہر چیز اپنی ہستی کی بقا اور اپنے وجود کی نشوونما کے لئے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ حیات اس کے لئے سرگرم کار رہے گیہوں کا ایک پودا وجود میں آکر اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کائنات کے تمام عناصر اس کی پرورش و

نگہداشت میں اپنا اپنا حصہ پورا نہ کریں' زمین اس کے لئے گہوارہ مہیا کرے ابر اس کے لئے رطوبت فراہم کرے' سورج اس کو گرمی اور شبنم اس کو ٹھنڈک پہنچائے اور جب یہ سب کچھ ایک نظم و ضبط کے ساتھ مکمل ہو لے تب گیہوں کا ایک دانہ کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے۔ یہی حال دنیا کی ہر ہر چیز کا ہے۔

اب اگر ایک سے زائد خدا موجود ہوں کوئی بارش برسائے' کوئی پھل پھول لائے' زندگی عطا کرنے والا کوئی ہو اور موت دینے والا کوئی تو کائنات کی موافقت اور باہمی سازگاری بالکل باقی نہ رہ سکے اور بدنظمی و افراتفری پھیل جائے اور چونکہ یہ کارخانہ قدرت بغیر کسی ہنگامہ اور فساد کے نہایت ترتیب و تنظیم سے چل رہا ہے۔ عالمی نظام میں ایک یکسانیت اور ایک وحدت ہے۔ نظام شمسی' انسان' حیوان' ہوا پانی' بارش' موسموں کا بدلنا' نباتات کا اگنا یہ سب ایک مقررہ نظام اور متعین اصول کے ماتحت ہیں جن میں سرمو فرق نہیں ہوتا۔ ہر شے ایک اصول کی پابند اور ایک عادت جاریہ کے مطابق چل رہی ہے لہٰذا اگر ایک کے علاوہ چند اور خدا بھی ہوتے تو نظام کائنات ان کی آپس کی رسہ کشی کی نذر ہو جاتا اور یہ ترتیب و نظم لمحہ بھر بھی قائم نہ رہ سکتا[۳]

الغرض کائنات کی ترتیب و تنظیم' اس کا نظم و ضبط' اور کائنات کے حسن و جمال کے توازن و اعتدال کو دیکھ کر صرف اس بات کا ہی احساس نہیں ہوتا کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ خالق بہترین خالق ہے۔ یکسر خیر و برکت ہے اس نے جو چیز بنائی ہے وہ کمال قدرت کمال صنعت اور کمال خیر و برکت کا کامل نمونہ ہے۔

فتبرک اللہ احسن الخالقین ○

(بڑا ہی خیر و برکت والا ہے اللہ جو تمام صانعوں سے بڑھ کر ہے) (سورۃ مومنون ۱۴)

توحید کی ضد شرک ہے۔ شرک کے معنی ہیں ساجھی بنانا۔ اصطلاحاً اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی خدائی میں کسی غیر کو شریک کرنا اور خدا کے ساتھ ساتھ کسی اور کی بھی ایسی تعظیم و تکریم کرنا جس کی حق دار صرف خدا کی ذات ہے۔ یا خدا کی صفات کو خدا

کی ذات کے علاوہ کسی اور سے منسوب کر دینا۔

وسیع تر معنوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی ذات[۴] صفات' اختیارات اور حقوق میں کسی کو شریک ٹھہرانا شرک ہے۔

ذات میں شرک یہ ہے کہ جو ہر الوہیت میں کسی کو حصہ دار قرار دیا جائے مثلاً نصاریٰ کا عقیدہ تثلیث' مجوسیوں کی ثنویت اور مشرکین عرب کا علانیہ دیوی دیوتاؤں کو خدا ماننا یہ سب شرک فی الذات ہیں۔

صفات میں شرک یہ ہے کہ وہ صفات جو خدا کے لئے مخصوص ہیں۔ کسی دوسرے کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ وہ ان اوصاف سے متصف ہے۔ مثلاً کسی کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ غیب کی باتیں جانتا ہے۔ قرآن نے اس اعتقاد کو یہ کہہ کر مٹایا ہے کہ :

وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو

(اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا)

(سورۃ انعام۔۵۹)

رسول اللہ نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان فرمائی کہ "مفاتح الغیب" پانچ ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا

۱ ۔ حمل یعنی لڑکا ہوگا یا لڑکی؟

۲ ۔ کل کیا ہوگا؟

۳ ۔ بارش کب ہوگی؟

۴ ۔ موت کس جگہ آئے گی؟

۵ ۔ قیامت کب آئے گی؟

(صحیح بخاری کتاب التوحید والرد علی الجھمیتہ وغیرہم جلد ۳ ص ۸۵۰)

علم نجوم جس کے زور سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدعی بنتے تھے رسول اللہ نے اس کا سیکھنا بھی جادو کی طرح گناہ قرار دیا ہے' یہ حدیث ابوداوٗ' ابن ماجہ اور مسند احمد میں موجود ہے۔اسی طرح کسی کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ تمام

نقائص اور تمام کمزوریوں سے منزہ اور بالکل بے خطا ہے شرک فی الصفات ہی کی قسم ہے۔

اختیارات میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے جو اختیارات صرف اللہ کے لئے مخصوص ہیں ان کو یا ان میں سے کسی کو اللہ کے سوا کسی اور کے لئے تسلیم کیا جائے۔ مثلاً **فوق الفطری** طریقے سے نفع و ضرر پہنچانا' اس میں آیات قرانی کے سوا ہر قسم کے جھاڑ پھونک' منتر' تعویذ' گنڈے' ٹوٹکے وغیرہ شامل ہیں۔

"بے شک جھاڑ پھونک' گنڈے اور میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈلوانے والے تعویذ شرک ہیں" (ابو داؤد۔ ابن ماجہ)

حاجت روائی و دست گیری کرنا' حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا نیز انسانی زندگی کے لئے قانون و شرع تجویز کرنا یہ سب اللہ کے لئے مخصوص اختیارات ہیں جن میں کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔ اسلام واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ خدا کے آگے کسی کی نہیں چل سکتی۔ حضرت ابراہیم نے اپنے والد سے کہا تھا "میں آپ کے لئے اللہ سے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا لیکن مجھ کو خدا کے سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں"

اسی طرح جب قرآن مجید میں یہ آیت نازل ہوئی

وانذر عشیرتک الاقربین

تو آپؐ نے اپنے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا "اے اہل قریش! اے اولاد **عبدالمطلب**' اے عباس' اے صفیہ اے فاطمہ میرے مال میں سے جو مانگو دے سکتا ہوں لیکن خدا کے یہاں میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا" [5]

اسی طرح بعض لوگ انبیاء یا علما کو تحریم و تحلیل کا مجاز سمجھتے تھے۔ یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حلال کر دیں۔ عموماً اہل مذاہب پیغمبروں کو شارع مستقبل سمجھتے ہیں یہ بھی شرک ہے۔ شریعت کی تاسیس' حلال و حرام کی تمیز' جائز و ناجائز کی تفریق' امر و نہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔ پیغمبر کا اس میں کوئی دخل نہیں وہ صرف مبلغ' پیغام رساں اور شارح ہے۔ [6]

حقوق میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر خدا کے جو مخصوص حقوق ہیں وہ یا ان میں سے کوئی حق خدا کے سوا کسی اور کے لئے مانا جائے۔ مثلاً سجدہ تعظیمی، غیراللہ کی قسمیں کھانا، غیراللہ کے نام پر نذر و نیاز اور قربانی دینا، غرض یہ اللہ کا حق ہے کہ اس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے اور اس کی ہدایت کو صحیح و غلط کا معیار مانا جائے اور کسی ایسی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں نہ ڈالا جائے جو اللہ کی اطاعت سے آزاد ایک مستقل اطاعت ہو اور جس کے حکم کے لئے اللہ کے حکم کی سند نہ ہو۔ خدائی حقوق میں سے جو حق بھی دوسروں کو دیا جائے گا وہ اللہ کا شریک ٹھہرے گا خواہ اس کو خدائی ناموں سے کوئی نام دیا جائے یا نہ دیا جائے۔

قرآن مجید نے بڑی سختی سے شرک کی مذمت کی ہے اور اس کو سب سے بڑا اور قبیح گناہ قرار دے کر مشرکین کو سخت سزاؤں کی بشارت دی ہے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ قرآن نے توحید کو اسلام کی بنیاد قرار دیا ہے جب کہ شرک توحید کی ضد کامل ہے اس لئے اس کی مذمت بھی زیادہ کی گئی ہے کیونکہ شرک کے بعد اسلام رہتا ہی نہیں اور دین کی جملہ مصلحتوں اور نیکیوں کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

توحید کے فوائد و اثرات :-

توحید مجرد ایک علمی حقیقت ہی نہیں بلکہ ایک نہایت اہم عملی حقیقت بھی ہے اور انسان کی زندگی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی توحید کے تصور سے انقلابی طور پر بدل کررہ جاتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا اجتماعی فائدہ یہ ہے کہ یہ اپنے پیروکاروں میں زبردست وحدت اور اخوت پیدا کرتا ہے۔ یہ انسانوں کو متحد کرنے والی طاقت ہے۔ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ توحید کے سوا کوئی دوسری چیز انسانوں کو جمع کرنے والی پائی گئی ہو۔ جب کہ اس کے برعکس شرک انسانیت کو بانٹتا اور انسانوں کو انسانوں سے جدا کرتا ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جو یہ شہادت دیتی ہو کہ تمام دنیا کے مشرکین کسی ایک یا چند مخصوص معبودوں پر کبھی جمع ہوئے ہوں اس طرح شرک کبھی کسی دور میں بھی انسانیت کو جمع کرنے والی طاقت نہیں رہا بلکہ ایک

تفرقہ پرداز طاقت رہا ہے۔ اور صرف عقیدے کے اعتبار سے انسانوں کو انسانوں سے نہیں پھاڑتا بلکہ اس کی فطرت چونکہ متحد کرنے کی صلاحیت سے عاری ہے اس لئے جو تفرقے اس کی بدولت برپا ہوتے ہیں وہ رفتہ رفتہ انسانوں میں قوموں اور قبیلوں، نسلوں اور زبانوں، رنگوں اور وطنوں کے اختلافات ابھار دیتے ہیں۔ پھر یہی اختلافات آگے بڑھ کر لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت وعداوت کے جذبات پیدا کرتے ہیں اور ظلم و ستم اور جنگ و خونریزی کا باعث بنتے ہیں [صـ۸]

توحید کے اس زبردست اجتماعی فائدہ سے الگ اس عقیدہ کے بے انتہا فوائد ہیں جو انفرادی طور پر توحید کے پیرو کاروں میں پیدا ہوتے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

ایمان باللہ کا پہلا خاصہ [صـ۹] یہ ہے کہ وہ انسان کے زاویہ نظر کو اتنا وسیع کر دیتا ہے جتنی خدا کی غیر محدود سلطنت وسیع ہے۔ انسان جب تک دنیا کو اپنے نفس کے تعلق سے دیکھتا ہے اس کی نگاہ اسی تنگ دائرے میں محدود رہتی ہے جس کے اندر اس کی اپنی قوت اس کا اپنا علم اور اس کے اپنے مطالبات محدود ہیں۔ چنانچہ اسی دائرے میں اس کی دوستی، دشمنی، محبت اور نفرت محدود رہتی ہے جس کے لئے بجز اس کے اپنے نفس کے اور کوئی معیار نہیں ہوتا۔ لیکن خدا پر ایمان لانے کے بعد وہ کائنات کو اپنے نفس کے نہیں بلکہ مالک کائنات کے حوالے سے دیکھتا ہے تو اسے خدا کے سوا کوئی قوت والا، کوئی ضار یا نافع نظر نہیں آتا۔ اب اس کی دوستی اور دشمنی، محبت اور نفرت اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ میں جس خدا کو مانتا ہوں وہ صرف میرا یا میرے خاندان یا میری قوم کا ہی خالق و مالک نہیں بلکہ زمین و آسمان کا خالق اور تمام جہانوں کا پروردگار ہے یہ عقیدہ اس کو وسعت نظر عطا کر کے "آفاقی" و "کائناتی" بنا دیتا ہے۔

[صـ۱۰] توحید کا یہ عقیدہ انسان کو ذلت و پستی سے اٹھا کر عزت نفس کے بلند ترین مدراج پر پہنچا دیتا ہے۔ جب تک اس نے خدا کو نہ پہچانا تھا، دنیا کی ہر طاقتور چیز، ہر نفع یا نقصان پہنچانے والی چیز، ہر شاندار اور بزرگ چیز کے سامنے جھکتا تھا، اس سے خوف کھاتا تھا، اس سے امیدیں وابستہ کرتا تھا لیکن جب اس نے خدا کی معرفت حاصل

کی تو معلوم ہوا کہ جن کے آگے وہ ہاتھ پھیلا رہا تھا وہ تو خود محتاج ہیں' جن کی وہ بندگی کر رہا تھا وہ خود اس کی طرح بندے ہیں' جن سے وہ امیدیں وابستہ کر رہا تھا وہ اس کی مدد تو در کنار آپ اپنی ہی مدد نہیں کر سکتے۔ ان دنیاوی طاقتوں کے بجائے حقیقی طاقت کا مالک خدا ہے۔ وہی حکمران اور صاحب امر ہے۔ مدد اسی کی طرف سے ملتی ہے۔ رزق دینے والا وہی ہے' مارنے اور جلانے والا وہی ہے اور نفع و ضرر پہنچانے کی اصل طاقت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ علم حاصل ہونے کے بعد وہ تمام دنیا کی قوتوں سے بے نیاز اور بے خوف ہو جاتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان میں کمال درجہ کی خودداری اور عزت نفس پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ وہ کسی دنیاوی طاقت سے مرعوب ہوتا ہے اور نہ خوف کھاتا ہے۔ جب کہ مشرک اور کافر کا حال اس سے برعکس ہو گا یعنی یہ کہ انسان مخلوقات کے آگے جھکے' ان کو نفع و نقصان کا مالک سمجھ کر ان سے خوف کھائے اور امیدیں باندھے اور یوں اپنے شرف اور اپنی عزت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

عزت نفس کے ساتھ ساتھ جو خوبی لازماً ایمان باللہ سے پیدا ہوتی ہے وہ انکساری و تخشع' عاجزی و فروتنی ہے۔ کیونکہ توحید کا قائل جانتا ہے کہ وہ خدا کی طاقت کے آگے بالکل بے بس ہے اور خدا کی فرمانروائی سے نکلنا انسان تو انسان کسی بھی ہستی یا مخلوق کے بس میں نہیں' تمام عالم اس بے نیاز خدا کا محتاج ہے وہ جانتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا کا دیا ہوا ہے۔ عزت' دولت' اقتدار' جاہ و حشمت' مال و اولاد غرض جو نعمت بھی ہے خدا ہی کی دی ہوئی ہے اور وہ جس طرح دینے پر قادر ہے اسی طرح چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ اس عقیدہ کے بعد غرور و تکبر کہاں رہ سکتا ہے بلکہ انسان سراپا انکسار بن جاتا ہے[ص۱۱]

وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا

واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلما (الفرقان۔ ۶۳)

ترجمہ: خدائے رحمان کے خاص بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جہلا ان سے جہالت کی باتیں کرتے ہیں تو وہ سلام کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں کسی ملحد کو جب کوئی دنیاوی کمال حاصل ہوتا ہے تو وہ متکبر

ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس کمال کو محض اپنی قابلیت کا نتیجہ سمجھتا ہے۔

عقیدہ توحید کا ایک اور مثبت اثر رجائیت اور اطمینان قلب ہے۔ ایمان باللہ مومن میں ایک ایسی رجائی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جو کسی حال میں مایوسی اور شکستہ دلی سے مغلوب نہیں ہوتی۔ مایوسی کو کفر قرار دے کر مومن کو ہمیشہ اللہ کی رحمت سے پر امید رہنے کی تلقین کی گئی ہے لہٰذا چاہے وہ دنیا کے تمام دروازوں سے ٹھکرا دیا جائے۔ سارے اسباب کا رشتہ ٹوٹ جائے' وسائل و ذرائع ایک ایک کرکے اس کا ساتھ چھوڑ دیں مگر ایک خدا کا سہارا اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتا کیونکہ خدا کہتا ہے۔

واذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (البقرہ۔۱۸۶)

ترجمہ اور اے نبی میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتادو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔

مومن بڑے سے بڑے ارتکاب جرم و گناہ کے بعد بھی خدا سے مایوس نہیں ہوتا کیونکہ خدا کا اس سے رحمت و مغفرت کا وعدہ ہے۔

قل یعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمتہ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا (الزمر۔۵۳)

ترجمہ (اے نبی) کہہ دو کہ اے میرے بندو۔ جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

اس کے برخلاف کفار و مشرکین کے دل چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان کا بھروسہ محدود طاقتوں پر ہوتا ہے۔ اس لئے مشکلات میں بہت جلد مایوسی ان کو گھیر لیتی ہے اور اکثر ایسی حالت میں وہ خودکشی تک کر گزرتے ہیں مسلمان اس حیثیت سے تاریخ میں ممتاز ہیں کہ ان میں خودکشی کی وارداتیں شاذ و نادر ہوتی ہیں۔ یہ خدا پر ایمان ہی کا نتیجہ ہے۔

اسی رجائیت کی اگلی منزل صبر و استقامت اور توکل علی اللہ ہے۔ یہ قوت انسان کو

بجز ایمان باللہ کے اور کسی ذریعہ سے حاصل نہیں ہوتی کیونکہ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتا اس کا بھروسہ ان مادی اور وہمی اسباب ووسائل پر ہوتا ہے جو خود کسی طاقت کے مالک نہیں ہیں۔ ان کے بل پر جینے والا گویا تار عنکبوت کا سہارا لیتا ہے مگر جس نے خدا پر بھروسہ کیا اس نے سب سے مضبوط اور ناقابل شکست سہارا حاصل کیا۔

انبیاء علیہم السلام نے جس فوق البشری قوت سے دنیا کے ہولناک مصائب کا سامنا کیا وہ یہی صبر و توکل کی قوت تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے ملک کے جبار فرمانروا سے مناظرہ کرتے ہیں بے خوف آگ میں کود پڑتے ہیں۔ حضرت ہودؑ کو دیکھئے کس طرح عاد کی زبردست قوت کو چیلنج دیتے ہیں۔

فکیدونی جمیعا ثم لا تنظرون انی توکلت علی اللہ ربی وربکم مامن دابتہ الا ھو اخذبناصیتھا(ہود۔۵۶۔۵۵)

ترجمہ : "تم سب مل کر اپنی چالیں چل دیکھو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ میں تو اس خدا پر بھروسہ کرچکا ہوں جو میرا اور تمہارا رب ہے۔ کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو"۔

حضرت موسیٰؑ کو دیکھئے۔ خدا کے بھروسے پر فرعون کی زبردست طاقت سے مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ قتل کی دھمکی دیتا ہے تو جواب دیتے ہیں کہ میں ہر متکبر کے مقابلے میں اس کی پناہ لے چکا ہوں جو میرا اور تم سب کا رب ہے۔ سب سے آخر میں نبی آخر الزماں کو دیکھئے ہجرت کے موقع پر ایک غار میں تشریف رکھتے ہیں صرف ایک رفیق ساتھ ہے۔ خون کے پیاسے کفار سر پر آپہنچے ہیں مگر آپ اس وقت بھی کمال استقامت سے فرماتے ہیں۔

لا تحزن ان اللہ معنا(توبہ۔۴۰)

ترجمہ : ہرگز نہ گھبراؤ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اسی سے ملتی جلتی ایک اور صفت جرات وبہادری اور شجاعت و شہامت کی ہے جو ایمان باللہ کا نتیجہ ہے۔ انسان کو دو چیزیں بزدل بناتی ہیں ایک محبت جو وہ اپنی جان اپنے اہل و عیال اور اپنے مال سے رکھتا ہے۔ دوسرے خوف جو نتیجہ ہے اس غلط

اعتقاد کا کہ نقصان پہنچانے اور ہلاک کردینے کی قوت دراصل ان اشیاء میں ہے جو محض آلہ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ ایمان باللہ ان دونوں امراض کا علاج کرتا ہے۔ پہلے مرض کا علاج اس تعلیم کے ذریعہ کہ خدا اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ مال و اولاد سب سے بڑھ کر اس سے محبت کی جائے۔ عقیدہ توحید اپنے ماننے والے کے دل میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ مال و اولاد سب دنیا کی زینتیں ہیں جن کا کبھی نہ کبھی ضائع ہونا یقینی ہے رہا خوف تو اس کے لئے مومن کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ نقصان پہنچانے اور ہلاک کرنے کی حقیقی قوت انسان یا حیوان توپ یا تلوار میں نہیں بلکہ خدا کے قبضہ قدرت میں ہے۔ تمام دنیا کی قوتیں مل کر بھی اگر کسی کو نقصان پہنچانا چاہیں اور خدا کا اذن نہ ہو تو اس کا بال تک بیکا نہیں ہو سکتا اسی طرح اگر اس کی موت کا وقت آہی گیا ہے تو تمامتر دنیاوی طاقتیں مل کر بھی اس کو ٹال نہیں سکتیں۔

عقیدہ توحید سے ایک اور خوبی جو مومنین میں پیدا ہوتی ہے وہ قناعت و استغناء ہے مومن بلا وجہ دوسروں سے دنیاوی معاملات میں مقابلہ یا منافست نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ باعزت طریقے سے اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے اور جو کچھ ملتا ہے اس پر قناعت کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مشرکین و کفار اپنی کامیابی اور ناکامی کو اپنی کوششوں اور دنیاوی طاقتوں کی مخالفت یا مدد پر موقوف سمجھتے ہیں۔ اسی لئے ان پر حرص و ہوس کا غلبہ رہتا ہے کامیابی حاصل کرنے کے لئے رشوت' خوشامد' سازش غرضکہ ہر قسم کے بدترین ذرائع اختیار کرنے میں انہیں باک نہیں ہوتا۔

قناعت کا مطلب بے عملی نہیں۔ اسلام اپنے پیروکاروں کو زیادہ سے زیادہ محنت اور جدوجہد کی تلقین کرتا ہے۔ اور جتادیتا ہے کہ ہر شخص کے لئے اتنا ہی ہے جتنے کی وہ کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح قیامت میں بخشش اور شفاعت کا معاملہ ہے بعض مشرکین یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے کاموں میں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا بھی شریک ہیں اور ہم ان کی خوشامد کرکے سفارش کرالیں گے۔ عیسائی سمجھتے ہیں کہ خدا کے بیٹے نے کفارہ بن کر ہمارے لئے نجات کا حق محفوظ کردیا ہے۔ ایسی ہی اور بہت سی غلط توقعات ہیں جو ایک طرف تو انسان کو گناہ کے چکر میں پھنسائے رکھتی ہیں تو دوسری

طرف انہیں بے عمل بنادیتی ہیں۔

تاسیس تہذیب میں ایمان باللہ کا حصہ

عقیدہ توحید سے یہ سارے جملہ اوصاف مسلمانوں میں پیدا ہوجاتے ہیں جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا۔ اس سے افراد میں احساس ذمہ داری پیدا ہوتا ہے۔ نفوس میں پاکیزگی اور اعمال میں پرہیز گاری پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کے باہمی معاملات درست ہوتے ہیں۔ پابندی قانون کی حس پیدا ہوتی ہے۔ اطاعت امر اور ضبط و نظم کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور افراد ایک زبردست باطنی قوت سے اندر ہی اندر سدھر کر ایک صالح اور منظم سوسائٹی بنانے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ یہ دراصل توحید کا معجزہ ہے کہ وہ اپنے پیرو کے اعمال ہی نہیں سدھارتا بلکہ اس کی روح میں انقلابی مثبت تبدیلیاں لاتا ہے۔ دنیا کی کسی حاکمانہ قوت' یا تعلیم و تربیت' یا وعظ و تلقین سے اصلاح اخلاق اور تنظیم اعمال کا کام اتنے وسیع پیمانے اور اتنی گہری بنیادوں پر انجام نہیں پاسکتا۔ دنیوی قوتوں کی رسائی صرف جسم تک ہوتی ہے اور وہ بھی ہر وقت اور ہر جگہ نہیں لیکن ایمان باللہ صرف فکر و عمل کو درست کرنے والی قوت ہی نہیں بلکہ اس پر عملدر آمد کرانے والی قوت بھی ہے' کیونکہ اللہ پر ایمان لانے والا جانتا ہے کہ وہ علیم و خبیر ہے اور دنیا میں خفیہ اور علانیہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے خدا کو اس کا علم ہے۔

اولا یعلمون ان اللہ یعلم مایسرون وما یعلنون (البقرہ۔ ۷۷)

ترجمہ : "کیا وہ نہیں جانتے ہیں کہ وہ خفیہ اور علانیہ جو کچھ بھی کرتے ہیں خدا کو اس کا علم ہے"۔

یوں توحید اسلام کے پورے قانون کے لئے ایک زبردست قوت نافذہ ہے۔ [صـ ۱۳] اسلام نے حرام و حلال کے جو حدود بھی مقرر کئے ہیں اخلاق' معاشرت اور معاملات کے متعلق جو احکام بھی دیئے ہیں ان کے نفاذ کا اصلی انحصار نہ فوج اور پولیس پر ہے نہ وعظ و تلقین پر بلکہ اس کا اصل انحصار ایمان باللہ پر ہے۔ جس کی وجہ سے ایک مومن اس وقت بھی کسی گناہ سے باز رہتا ہے جب اسے کسی پولیس یا محتسب کا ڈر نہیں ہوتا

اور جب اس تک کسی پکڑنے والے کی رسائی نہیں ہوتی۔ اس وقت اسے حدود سے تجاوز کرنے سے روکنے والی اور گناہ سے بچانے والی قوت ایمان باللہ ہوتی ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے خدا اسے دیکھ رہا ہے اور اس دنیا میں اگر وہ پولیس اور محتسب سے بچ بھی گیا تو قیامت کے دن خدا کی سخت پکڑ سے بچانے والا اسے کوئی نہیں ہوگا۔

اس طرح ایمان باللہ نہ صرف پاکیزہ اسلامی تہذیب کی تاسیس میں مدد کرتا ہے بلکہ بہترین قوت نافذہ کے طور پر بھی عمل کر کے اسے مستحکم اور مضبوط و پائیدار بناتا ہے۔

ملائکہ پر ایمان :-

ملائکہ یا فرشتوں پر ایمان کا بیان توحید کے باب میں کرنے کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں پر ایمان کا عقیدہ دراصل توحید کا تتمہ اور اس کا ضمیمہ لازمہ ہے۔ اس کا مقصد محض یہی نہیں ہے کہ فرشتوں کے وجود کا اثبات و اقرار کیا جائے بلکہ مقصد اصلی یہ ہے کہ نظام وجود میں ان کی صحیح حیثیت کو سمجھ لیا جائے تاکہ ایمان باللہ خالص توحید پر قائم ہو۔

"ملک" کے لغوی معنی قاصد اور پیام رساں کے ہیں۔ اس سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں جو اللہ تعالی کے حکم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب و علل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں۔[14]

ملائکہ کا ایک اجمالی تصور تمام ملتوں اور مذہبوں میں کسی نہ کسی طرح موجود رہا ہے۔ کسی کے نزدیک وہ نوامیس فطرت اور قدرت کی وہ طاقتیں ہیں جو نظام کائنات کے مختلف شعبوں کو چلا رہی ہیں۔ کسی کے خیال میں وہ دیوتا ہیں جن میں سے ہر ایک کار گاہ عالم کے ایک ایک محکمہ کا صدر ہے مثلاً کوئی ہوا کا مالک' کوئی بارش کا' کوئی روشنی' حرارت اور آگ کا' کسی کے اعتقاد میں وہ خدا کے نائب اور مددگار ہیں۔ کسی کے نزدیک وہ ارباب الانواع ہیں۔ کسی کے خیال میں وہ عقول ہیں۔ کسی کے خیال میں وہ خدا کے تصورات ہیں اور کوئی ان کو خدا کی اولاد سمجھتا ہے۔ پھر کسی نے

ان کا مادی و جسمانی وجود مانا ہے اور کسی نے ان کو مجردات اور مفارقات میں سے شمار کیا ہے الغرض ارباب مذاہب میں فرشتوں کے متعلق یہ اعتقاد عام رہا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طور پر خدا کی خدائی میں شریک ہیں اور اس لئے ان کے ہیکل یا بت بنا کر' یا ان کی تصویریں نقش کر کے ان کی عبادت کی گئی اور ان کو حاجت روا' فریادرس اور شفیع قرار دیا گیا۔ عربوں میں فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھا جاتا تھا اور ان کی اسی حیثیت سے پوجا کی جاتی تھی۔

قرآن مجید نے ایک طرف خدا کے وجود' صفات اور افعال میں خالص اور کامل توحید قائم کی اور دوسری طرف ملائکہ کا صحیح تصور پیش کر کے شرک کا دروازہ بند کر دیا۔ قرآن مجید نظام وجود میں فرشتوں کی مندرجہ ذیل حیثیت متعین کرتا ہے۔

اولاً فرشتے وہ غیر مادی' ذی روح مخلوقات ہیں جن کا کام خدا کی حمد و ثنا اور اطاعت و فرمانبرداری ہے ایک لمحہ کے لئے بھی وہ اپنے وظیفہ سے غافل نہیں ہوتے اور ہر دم اپنے رب کی تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں۔

ولہ من فی السموت والارض ومن عندہ لا یستکبرون عن عبادتہ ولا یستحسرون یسبحون اللیل والنہار لا یفترون (الانبیاء۔ ۲۰۔۱۹)

ترجمہ : "اسی کے مملوک ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور جو اس کے پاس (مقرب) ہیں۔ وہ اس کی بندگی سے سرتابی نہیں کرتے' تھکتے نہیں' شب و روز اس کی تسبیح میں لگے رہتے ہیں اور سستی نہیں کرتے"۔

اس تصور نے شرک کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رکھی کیونکہ جن پر خدائی کا گمان کیا جا سکتا تھا وہ سب عاجز و درماندہ ثابت ہوئے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ انسان مسجود ملائکہ ہے گویا وہ فرشتے جو نہایت برگزیدہ اور نیک ہستیاں ہیں انسان کے آگے وہ بھی سر بسجود ہو چکے ہیں۔ اس طرح فرشتوں کی عبادت کرنا انسانوں کے لئے قطعی بے معنی ہو گیا اور اس طرح توحید کو خالص اور منزہ کیا گیا۔

ثانیاً : ملائکہ کی دوسری حیثیت جو قرآن مجید میں بتائی گئی وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی کے ذریعہ اپنے پیغمبروں کے پاس اپنا کلام اور اپنے احکام بھیجتا ہے۔ چونکہ یہ فرشتے

نہایت فرمانبردار اور نفسانی اغراض سے پاک ہیں اس لئے جو پیغام ان کے توسط سے بھیجا جاتا ہے اس میں وہ اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہ تو کرتے ہیں اور نہ کرسکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اس قدر طاقتور ہیں کہ ان کی پیغام رسانی اور نگرانی میں کوئی شیطانی قوت ذرہ برابر بھی خلل نہیں ڈال سکتی۔

نزلہ روح القدس من ربک بالحق (النمل)

ترجمہ : "اسے روح القدس نے تیرے رب کی طرف سے ٹھیک نازل کیا ہے"۔

ثالثاً : فرشتوں کی جو تیسری حیثیت قرآن مجید میں متعین کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی سلطنت کے کارندے ہیں اس طور سے ان کی حیثیت مدبرات امر کی ہے یعنی وہ صرف ان امور کی تدبیر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کردیئے ہیں اس میں ان کی مرضی کو کوئی دخل نہیں ہے۔[15]

ان فرشتوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کسی پر عذاب نازل کرتا ہے اور کسی پر رحمت' کسی کی روح قبض کرتا ہے اور کسی کو زندگی بخشتا ہے۔ کسی جگہ بارش برسواتا ہے اور کہیں قحط ڈلواتا ہے۔ وہ ہر انسان کے اعمال' اقوال اور خیالات تک کا پورا ریکارڈ رکھ رہے ہیں۔ آدمی جب تک خدا کی دی ہوئی مہلت کے اندر کام کررہا ہے یہ تمام کارکن اس کی ساری بری بھلی باتوں سے واقف ہونے کے باوجود امرالٰہی کے تحت اس کے ساتھ تعاون کرتے رہتے ہیں اور اس کے سارے کام بنائے چلے جاتے ہیں مگر جونہی اس کی مہلت عمل ختم ہوئی پھر وہی خادم اس کو گرفتار کرلیتے ہیں جو ایک لمحہ پہلے تک اس کی خلافت کا کارخانہ چلا رہے تھے۔ وہی ہوا جس کے بل پر آدمی جی رہا تھا یکایک اس کی بستیوں کو الٹ دیتی ہے۔ وہی پانی جس کا سینہ آدمی چیرتا پھر رہا تھا اچانک اسے غرق کردیتا ہے۔ وہی زمین جس پر آدمی ماں کی گود جیسے اطمنان کے ساتھ بس رہا تھا یک لخت ایک جھٹکے میں اسے پیوند خاک کردیتی ہے۔ یہ نقشہ قرآن مجید میں بڑی تفصیل سے باربار کھینچا گیا ہے۔

اس لحاظ سے ایمان بالملائکہ' ایمان باللہ کا ایک لازمی جزاور توحید کو کامل و منزہ

اور خالص کرنے والا عقیدہ ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱ - حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ص ۱۵۸

۲ - شبلی نعمانی "الکلام و علم الکلام" حصہ دوئم ص ۴۸

۳ - "اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا چند اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان برباد ہو جاتے"۔ (انبیاء۔ ۲)

"اور نہ اس خدائے برحق کے سوا کوئی اور خدا ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا"۔ (مومنون۔ ۵)

۴ - مودودی، سید ابوالاعلیٰ " "تفہیمات" جلد ۳ ص ۳۹ ادارہ، ترجمان القرآن، لاہور ۱۹۸۹ء

۵ - سیرۃ النبی جلد ۴ ص ۳۲۵ ٭

۶ - ایضاً ص ۳۳۰

۷ - تفہیم القرآن جلد اول ص ۵۹۹

۸ - تفہیمات جلد ۳ ص ۱۱۸۔۱۱۷

۹ - اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ص ۱۵۲

۱۰ - ایضاً ص ۱۵۵۔ ۱۵۳

۱۱ - اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

۱۲ - اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ص ۱۶۱

۱۳ - اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ص ۱۶۹

۱۴ - سیرۃ النبی جلد ۴ ص ۵۵۴

۱۵ - اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

رسالت

توحید کے بعد اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ "رسالت" ہے۔ جس طرح اعتقاد کی جہت میں توحید اصل دین ہے اسی طرح اتباع کی جہت میں رسالت اصل دین ہے۔ رسالت کے لفظی معنی "پیامبری" کے ہیں۔ جو شخص کسی کا پیغام کسی دوسرے شخص کے پاس لے جائے وہ "رسول" ہے۔ مگر اسلام کی اصطلاح میں رسول اس کو کہتے ہیں جو خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچائے اور خدا کے حکم سے راہ راست کی طرف ان کی راہنمائی کرے اسی لئے قرآن میں رسول کے لئے "ہادی" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یعنی وہ جو سیدھا راستہ دکھائے۔ص۱

انسان کی اصل کامیابی نیز اس کی تخلیق کا مقصد بھی اطاعت خداوندی ہے۔ خدا کی اطاعت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے احکام و اوامر و نواہی سے آگاہی ہو۔ اس کا ایک ذریعہ تو انسان کی اپنی عقل اور اس کا اپنا نفس ہے جو بہت حد تک صحیح یا غلط میں تمیز کر سکتا ہے لیکن انسانی عقل کی رسائی محض ایک حد تک ہے اسی طرح انسانی نفس کی ہدایات واضح نہیں۔ اس داخلی قوت پر اثر انداز ہونے والی بہت سی خارجی قوتیں بھی ہیں جو انسان کو برائی کی طرف مائل کرتی رہتی ہیں لہٰذا اس کمی کو ایک خارجی قوت کے ذریعہ پورا کرنے کا انتظام اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا گیا ہے اسی خارجی انتظام کو نبوت یا رسالت کہتے ہیں۔

یہی بات امام غزالی اس طرح کہتے ہیں کہ انسان کے لئے سیکھنے سکھانے کا ابتدائی

درجہ محسوسات کا ہے۔ اس سے اگلا درجہ عقل کا ہے۔ اور عقل سے آگے ایک اور درجہ ہے جس کا نام نبوت ہے۔ بعض عقلا اس درجہ کے منکر ہیں لیکن یہ اس قسم کا انکار ہے جس طرح وہ شخص عقلی چیزوں کا انکار کرتا ہے جس کو عقل کی قوت عطا نہیں کی گئی اور وہ خبطی یا پاگل ہے۔

ایک پیغمبر یا رسول کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ پیغام الٰہی من وعن انسانوں تک پہنچا دے بلکہ اس پر عمل کر کے دکھانا اور لوگوں کا تزکیہ کرنا بھی اس کے فرائض منصبی میں شامل ہے اور یہ کام انبیاء محض ظن و تخمین کی بناء پر نہیں کرتے بلکہ "علم الیقین" کے ساتھ کرتے ہیں۔

چونکہ نبوت' انسانی ضرورت ہے لہٰذا یہ بھی فطری ہے کہ انبیاء کی تعلیمات کو انسان قبول کرے اور اس کی تصدیق کرے اگر کسی پیاسے کو پانی دیا جائے تو وہ یہ بحث نہیں کرے گا کہ پہلے یہ ثابت کیا جائے کہ یہ پانی ہے تب میں اسے پیوں گا بلکہ پیاس کی وجہ سے وہ فوراً پانی پی جائے گا۔ اسی طرح نبوت کی تصدیق اور نبی کی باتوں کو سچ سمجھنا خود انسان کی فطرت صحیح کا تقاضا ہے۔ ایک شخص جو حق کی تلاش میں ہو کسی نبی کی حق بات سنتا ہے تو بیہودہ کج بحثیوں میں نہیں پڑتا بلکہ اس کی تصدیق کرتا ہے اور عملاً اس کا ساتھ دیتا ہے۔

اسلام سے قبل نبوت سے متعلق ایک عالمگیر غلطی پھیلی ہوئی تھی ہر فرقہ اور ہر گروہ یہ سمجھتا تھا کہ انبیاء انسان کے درجہ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ یہی خیال تھا جس نے رام کرشن' زرتشت اور حضرت عیسیٰؑ کو عین خدا یا کم از کم مظہر خدا بنا دیا تھا اسلام نے نہایت وضاحت سے بتا دیا کہ انبیاء بشریت کے دائرہ سے باہر نہیں۔

قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الھکم الٰہ واحد (الکہف - ۱۱۰)

ترجمہ : اے محمد ﷺ! کہدو کہ میں تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں۔ مجھ پر وحی آئی ہے کہ تمہارا خدا واحد ہے۔

دنیا میں جتنے مذاہب گزرے ہیں سب نے خدائی اور نبوت کے ڈانڈے ملا دیئے تھے یا کم از کم قریب کر دیئے تھے۔ صرف اسلام کو یہ عزت حاصل ہے کہ اس نے

دونوں کی حد بالکل جدا کردی۔ خود رسول اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہی اعتراض ہوا تھا کہ اگر خدا کو کوئی پیغمبر بھیجنا ہی تھا تو وہ ہمارے جیسے انسان کے بجائے کسی فرشتے کو بھیجتا۔ قرآن نے اس کا نہایت حکیمانہ جواب یہ دیا تھا کہ ------"اگر اس زمین پر فرشتے ہی چلتے پھرتے اور آباد ہوتے تو ضرور ان پر ہم آسمان سے فرشتے ہی کو رسول بنا کر بھیجتے"۔ (بنی اسرائیل۔ ۹۵)

بہرحال جو لوگ منصب رسالت پر فائز کئے گئے وہ گروہ انسانی سے ہونے کے باوجود چند باتوں میں عام انسانوں سے مختلف ہیں ان اضافی خصوصیات میں پہلی صفت یا خصوصیت "علم" ہے۔ وحی کے ذریعہ رسولوں کو علم عطا کیا گیا ہے یہ وہ چیز ہے جو رسولوں کو دوسرے رہنماؤں سے ممتاز کرتی ہے۔ دوسرے رہنماؤں کے پاس یہ علم نہیں وہ محض ظن و تخمین کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہیں جس میں ہوائے نفس کے عناصر بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ اس لئے جو عقائد و قوانین وہ وضع کرتے ہیں وہ کامل حق نہیں ہوتا جب کہ رسولوں کو علم عطا کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے حق ان پر روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتا ہے اور وہ اس قابل ہوجاتے ہیں کہ انسانیت کی راہبری کا کام کرسکیں۔ حضرت ابراہیمؑ سے نبوت کا اعلان اس طرح کرایا جاتا ہے۔

ترجمہ : "اے پدر عزیز یقین جان کہ میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا، لہٰذا تو میری پیروی کر میں تجھے سیدھے راستے پر چلاؤں گا۔" (سورۃ مریم)

اسی طرح حضرت لوطؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت محمد ﷺ کا جہاں ذکر کیا گیا ہے وہاں واضح طور پر فرمایا گیا کہ ہم نے انہیں "علم" عطا کیا ہے۔

نبوتؐ اور رسالت کی دوسری بڑی خصوصیت "عصمت" ہے۔ یعنی نبی اور رسول گناہوں سے پاک، برائیوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ اس عصمت کے تین اسباب بتاتے ہیں۔

اول یہ کہ رسولوں کی فطرت نہایت خالص، پاکیزہ پیدا کی جاتی ہے خصوصاً ان امور کی نسبت جو حدود شرعی کی حفاظت اور پارسائی سے متعلق ہوتے ہیں۔

دوئم یہ کہ --- رسول کو اچھے کام کی خوبی اور برے کام کی برائی دونوں کا انجام وحی الٰہی سے معلوم ہو جاتا ہے۔(لہٰذا وہ گناہوں سے خود کو محفوظ کرلیتا ہے)

سوئم یہ کہ --- رسول اور رذیل خواہشات کے درمیان خدا حائل ہو جاتا ہے اور رسول کی خصوصی حفاظت کرتا ہے۔

درحقیقت نبی کا معصوم ہونا اس مقصد کے لئے بالکل ناگزیر تھا جس کے لئے رسالت کا سلسلہ قائم کیا گیا ایسا شخص جس سے غلطی اور برائی کا احتمال ہو لوگوں کا اعتماد حاصل نہیں کرسکتا اور اس کا عمل دوسروں کے لئے اعلیٰ ترین اور قابل تقلید نمونہ (اسوہ حسنہ) نہیں بن سکتا۔

رسالت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ وہی چیز ہے اکتسابی نہیں' جو محنت اور تلاش و جستجو کے بعد مل جائے۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی عطیہ ہے اور اسی کو ملتا ہے جسے وہ مرحمت فرمانا چاہے۔ اس کے ملنے میں انسانی کوشش' ارادے اور خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس انتخاب کو قرآن کی زبان میں "اصطفا" کہتے ہیں۔ اصطفا کے معنی ہیں بہت سی چیزوں میں سے بہترین چیز کو چن لینا۔ جب حضرت محمدؐ کے مخالفین نے آپ کے نبی بنائے جانے پر اعتراض کیا اور اپنے لئے بھی برابر کے استحقاق کی باتیں کیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اللہ اعلم حیث یجعل رسلتہ (الانعام - ۱۲۴)

ترجمہ : اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اسے اپنی پیغمبری کس کے سپرد کرنی چاہیے۔

امام غزالیؒ اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ انسانی خوبیاں ہر انسان میں ایک جیسی نہیں ہوتیں بلکہ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ہوتی ہیں مثلاً اگر ذہانت کو لیا جائے تو ایک شخص کم ذہین ہوتا ہے دوسرا اس سے زیادہ ذہین اور تیسرا اس سے بھی زیادہ ذہین و فطین ہوسکتا ہے اور یہ ذہانت کوئی دنیاوی تعلیم یا محنت و مشقت سے حاصل نہیں کرسکتا بلکہ یہ خداداد صلاحیت ہے جو کسی کو زیادہ ملتی ہے کسی کو کم اور کسی کو بالکل نہیں۔ اسی طرح بعض اشخاص کو ملکہ نبوت عطا ہوتا ہے ہر ایک کو نہیں اور اس میں نبی کی اپنی محنت و مشقت یا تعلیم و تعلم کو کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ خود خدا کسی خاص

شخص کو اس منصب کے لئے چنتا ہے۔[5]

چونکہ رسالت کا ادارہ اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ لوگوں کی ہدایت و راہنمائی کا کام کیا جاسکے لہٰذا جب سے کائنات میں انسان نے جنم لیا اس وقت سے اصولاً اس ادارے کو موجود ہونا چاہیے اور ہم دیکھتے ہیں کہ فی الواقع ایسا ہی ہے' آدمؑ اولین انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اولین نبی بھی تھے اور ان کی اولاد ان کی امت تھی اس طرح تاریخ انسانی کا آغاز مکمل روشنی اور واضح ہدایت سے ہوا جہالت اور تاریکی سے نہیں۔ آدمؑ سے لے کر نبی آخرالزماں محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ ہزاروں انبیاء دنیا میں مبعوث ہوئے۔ کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی خبردار کرنے والا (رسول) نہ آیا ہو۔

وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر (فاطر - ۲۴)

ترجمہ : کوئی بھی ایسی قوم نہیں جس میں کوئی خبردار کرنے والا (رسول) نہ آیا ہو۔

یہ انبیاء ایک ہی دین حق کی طرف لوگوں کو بلاتے رہے۔ ان سب کی تعلیمات توحید' رسالت اور آخرت کے بنیادی عقائد پر قائم تھی۔ ان سب نے لوگوں کو نیکیوں کی طرف بلایا اور برائیوں اور شرک سے بچنے کی تلقین کی۔ ان میں سے بعض انبیاء کا تذکرہ قرآن مجید میں تصریح کے ساتھ کیا گیا ہے ان پر تصریح کے ساتھ ایمان لانا ہر مسلمان پر فرض ہے اور جن انبیاء کے نام نہیں لئے گئے ان پر بلا تصریح ایمان لانا ضروری ہے اس کے لئے یہ اعتقاد ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کو دین حق کی طرف بلانے والے تھے۔ قرآن پاک میں تین طرح کے انبیاء کا ذکر نام کے ساتھ کیا گیا ہے[6]

۱ - ایک وہ جن سے صرف عرب واقف تھے اور یہود نصاری بے خبر تھے۔ مثلاً حضرات ہودؑ اور شعیبؑ

۲ - دوسرے وہ جن سے یہود نصاری واقف تھے عرب لاعلم تھے مثلاً حضرات داؤدؑ سلیمانؑ

۳ - تیسرے وہ جن سے عرب بھی واقف تھے اور ان کے ہمسایہ یہود و نصاری کے صحیفوں میں بھی جن کے تذکرے تھے۔

اسلام اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ بلا امتیاز انبیاء پر ایمان لائیں اور دوسرا مطالبہ یہ کرتا ہے کہ انبیاء کی اطاعت کریں۔ یہ شرط ایمان ہے۔ دین و شریعت کے دائرے میں ایک نبی جو کچھ کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی بلا چون و چرا تعمیل کرے اور مصلحت خواہ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے بہرصورت یقین رکھے کہ وہ سراسر خیر اور سراپا حق ہیں۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (النساء - ٦٤)

ترجمہ : ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا اسی لئے بھیجا کہ اذن خداوندی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔

رسالت محمدی اور ختم النبوت

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ رسالت کے عام احکام سے متعلق تھا مگر ان کے علاوہ چند امور ایسے بھی ہیں جو خاص طور پر رسالت محمدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلاشبہ نفس منصب رسالت کے اعتبار سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) اور دوسرے انبیاء میں کوئی فرق نہیں اور قرآن مجید کا صریح فیصلہ ہے کہ رسولوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق جائز نہیں۔ لیکن عملاً اللہ تعالیٰ نے چند امور میں حضرت محمدؐ کو دوسرے انبیاء کے مقابلے میں امتیاز عطا فرمایا ہے۔ اور یہ امتیاز محض سطحی نہیں ہے کہ اس کو ملحوظ رکھنے یا نہ رکھنے کا کوئی اثر نہ ہو' بلکہ درحقیقت اسلام کے نظام دینی میں اس کو ایک اساسی حیثیت حاصل ہے اور عملاً اسلام کے تمام معتقدات اور قوانین کی بنیاد رسالت محمدی کی اسی امتیازی حیثیت پر قائم ہے۔

رسول اللہ کو جو پہلا امتیاز حاصل ہے وہ یہ کہ ان کی تعلیمات کا دائرہ کسی خاص علاقہ یا خاص قوم تک محدود نہیں تھا بلکہ ان کی مخاطب پوری انسانیت ہے اور ان کی تعلیمات تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ہیں۔ یہ عالمگیریت کسی اور پیغمبر کو نصیب نہیں ہوئی۔ ہر نبی یا پیغمبر' کسی خاص زمانہ میں' کسی مخصوص علاقہ یا قوم پر بھیجے گئے۔ حضرت

عیسیٰ کی تعلیمات کو بہت زیادہ وسعت ملی مگر خود انہوں نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ ساری دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے ہیں بلکہ مسیح علیہ السلام سے خود انجیل میں یہ قول منقول ہے کہ وہ صرف نبی اسرائیل کی ہدایت کے لئے آئے ہیں۔ انبیاء اور پیشوایان ادیان کے پورے گروہ میں تنہا محمدؐ ہیں جنہوں نے دعویٰ کیا کہ ان کی دعوت کل نوع انسانی کے لئے ہے۔

ترجمہ : "پاک ہے وہ جس نے حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب اپنے بندے پر اتاری تاکہ تمام اہل عالم کے لئے متنبہ کرنے والا بنے"۔ (القرآن)

وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین

ترجمہ : اے محمدؐ! ہم نے تم کو تمام اہل عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ (سورہ الانبیاء)

حضرت محمدؐ کو دوسرا امتیاز یہ حاصل ہے کہ ان کی تعلیمات اور ان کی سیرت نہایت سند کے ساتھ موجود ہیں اور یوں ہمارے پاس قابل عمل تعلیمات کا قابل ذکر ذخیرہ موجود ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لی ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (الحجر - ۱)

ترجمہ : اس ذکر (قرآن) کو ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

جب کہ دوسرے انبیاء اور رسولوں کی تعلیمات تحریفات کا شکار ہو گئیں یا تلف ہو گئیں اور ان کی سیرتیں بھی محفوظ نہ کی جا سکیں چنانچہ انبیاء اور پیشوایان ادیان میں سے کسی کا اتباع اگر کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف محمدؐ ہیں کہ ان کی تعلیمات قرآن کی شکل میں رہتی دنیا تک کے لئے محفوظ ہے اور ان کی سیرت اور ان کا اسوہ حسنہ نہایت سند کے ساتھ تمام تر جزئیات سمیت تاریخ و سیر کی کتابوں میں محفوظ ہے۔

حضرت محمدؐ کا تیسرا امتیازی پہلو یہ ہے کہ وہ خاتم النبیین تھے۔ اور ان پر دین کی تکمیل ہو گئی۔

"محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ مگر وہ اللہ کے رسول اور

خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے"۔ (الاحزاب)

رسول اللہ نے بھی مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ آپؐ آخری نبی ہیں اور آپؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہے۔ مثلاً ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا — "بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء کیا کرتے تھے۔ جب کوئی نبی مرجاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا بلکہ خلفاء ہوں گے" (صحیح بخاری۔ کتاب المناقب)

ایک اور موقع پر وضاحت فرمائی — "میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے عمارت بنائی اور خوب حسین و جمیل بنائی۔ مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر حیرت کرتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔"

اسی طرح ایک دفعہ فرمایا — "رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے نہ نبی"۔ (ترمذی۔ مسند احمد)

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جن لوگوں نے نبوت کا جھوٹا دعوی کیا اور جن لوگوں نے ان کی نبوت قبول کی ان سب کے خلاف صحابہ کرام نے بالاتفاق جنگ کی تھی۔

دراصل دنیا میں انبیاء کی آمد کے تین ہی اسباب ہو سکتے ہیں:۔

ایک یہ کہ کسی قوم کی ہدایت کے لئے پہلے کوئی نبی نہ آیا ہو اور لکل قوم ھاد کی بناء پر اس کے لئے ایک یا ایک سے زائد انبیاء کی ضرورت ہو۔

دوسرے یہ کہ پہلے کوئی نبی آیا تھا مگر اس کی رسالت کے آثار محو ہو گئے۔ اس کی تعلیم اور اس کی لائی ہوئی کتاب میں تحریف ہو گئی اس کی سیرت کے نشانات اس طرح مٹ گئے کہ لوگوں کے لئے اس کی پیروی کرنا اور اس کے اسوہ حسنہ کی تقلید کرنا ممکن نہ رہا۔

تیسرے یہ کہ پہلے نبی یا انبیاء کی تعلیم اور ہدایت مکمل نہ ہو اور اس میں مزید

اضافہ کی ضرورت ہو۔

ان تین اسباب کے سوا انبیاء کی بعثت کا کوئی چوتھا سبب نہ ہے اور نہ عقلا ہو سکتا ہے۔[11] جب کہ ہمارے اوپر کے بیان سے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ رسالت محمدی ﷺ کے ساتھ یہ تینوں ضروریات پوری ہو چکی ہیں یعنی آپ کی دعوت تمام نوع انسانی کے لئے ہے لہٰذا اب جدا جدا قوموں کے لئے نبی آنے کی ضرورت نہیں۔ نیز آپ کی لائی ہوئی کتاب اور آپ کے جملہ آثار رسالت اپنی صحیح شکل میں محفوظ ہیں لہٰذا کسی نئی کتاب یا نئی ہدایت کے آنے کی ضرورت نہیں۔ اور تیسری بات یہ کہ آپ کی تعلیم اور ہدایت مکمل اور جامع ہے لہٰذا اس پر کسی اضافہ کرنے والے کی بھی ضرورت نہیں۔

لہٰذا قرآن مجید وضاحت کے ساتھ کہتا ہے :

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا

(المائدہ)

اس طرح رسول اللہ کی شریعت نے سابقہ تمام شریعتوں کو منسوخ کردیا۔[12] اس سے مراد یہ ہے کہ پچھلے انبیاء نے جو کچھ پیش کیا تھا وہ اب منسوخ ہوگیا ہے۔ ان کی نبوت و صداقت پر اجمالی اعتقاد رکھنا تو ضروری ہے کیونکہ وہ سب ہی اسلام کے داعی تھے لیکن عملاً اتباع اور اطاعت کا تعلق اب ان سے منقطع ہوکر صرف محمدؐ کی تعلیم اور اسوہ حسنہ کے ساتھ وابستہ ہوگیا ہے اس لئے کہ اول تو اصولاً کامل کے بعد ناقص کی ضرورت نہیں رہتی۔ دوسرے انبیاء سابقین کی تعلیم اور سیرت کے آثار تحریف و نسیان کی نذر ہوچکے ہیں جس کی وجہ سے عملاً ان کا صحیح اتباع اب ممکن نہیں رہا۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں جہاں کہیں رسول کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے وہاں الرسول یا النبی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے خاص محمدؐ کی ذات مراد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان قوموں کو بھی محمدؐ پر ایمان لانے اور آپؐ کا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو انبیائے سابقین میں سے کسی کی ماننے والی ہیں۔

"اہل کتاب میں سے ایماندار وہ ہیں جو اس ان پڑھ رسول نبی کا اتباع کرتے ہیں

جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور بدی سے روکتا ہے"۔ (الاعراف)

المختصر تکمیل دین، نسخ ادیان سابقہ، اور ختم النبوت کے یہ تینوں عقائد دراصل رسالت محمدی کے لازمی اجزاء اور اسلام کے ایمانیات میں داخل ہیں۔ اسلام کی دعوت عام اس بنیاد پر قائم ہے کہ نوع انسانی کے لئے دعوت محمدی کی صورت میں ایک ایسا مکمل مذہب پیش کردیا گیا ہے جس میں پچھلی تمام دعوتوں کی کمی پوری کردی گئی ہے اور آئندہ کے لئے کوئی ایسی کمی نہیں چھوڑی گئی جس کو پورا کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

ایمان بالکتب

عقیدہ رسالت کا لازمی نتیجہ کتب الٰہی پر ایمان لانا ہے۔ کیونکہ رسول کو رسول برحق ماننے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کی تعلیمات کی تصدیق کی جائے۔ اسلام کی اصطلاح میں "کتاب" سے مراد وہ کتاب ہے جو بندوں کی راہنمائی کے لئے اللہ کی طرف سے رسول پر نازل کی جائے۔ گویا کتاب وہ کلام الٰہی ہے جنہیں لوگوں تک پہنچانے، اس کی تشریح و توضیح کرنے اور اس پر عمل کرکے دکھانے کے لئے نبی مبعوث کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے رسولوں پر اور کتابوں پر ایمان لانا ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہے اور ایک کے بغیر دوسرے کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان بالکتب کو بالعموم عقیدہ رسالت کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ معلم کے بغیر صرف کتابیں انسانی سیرتوں کو اس درجہ تبدیل نہیں کرسکتیں چنانچہ پوری تاریخ انسانی میں ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ تنہا کسی کتاب نے انسانی معلم کی ہدایت اور تعلیم وتشریح کے بغیر کسی قوم کی ذہنیت اور زندگی میں انقلاب بپا کیا ہو۔ لہٰذا بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کتاب اور رسول کا تعلق ناقابل انقطاع ہے اور انسان کو ہدایت کے لئے دونوں کی یکساں ضرورت ہے۔

جہاں تک ایمان کا تعلق ہے تو جس طرح تمام رسولوں اور نبیوں پر ایمان لانا

ضروری ہے اسی طرح اللہ ان تمام کتابوں اور صحیفوں کے ماننے کا حکم دیتا ہے جو اس کی طرف سے اس کے پیغمبروں پر نازل کی گئیں۔

والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک (البقرہ - ۱)

ترجمہ : اور پرہیزگار وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو تیری طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے اتاری گئی تھیں۔

بعض کتابوں کا قرآن میں تصریح کے ساتھ ذکر آیا ہے مثلاً توراۃ جس کو ایک جگہ صحف موسیٰ بھی کہا گیا ہے۔ حضرت داؤدؑ کی زبور، حضرت عیسیٰ کی انجیل اور خود قرآن ان کے علاوہ ایک موقع پر صحف ابراہیمؑ کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ چنانچہ جن کتابوں کا ذکر تصریح کے ساتھ قرآن میں کیا گیا ہے ان پر صراحتہً اور جن کا ذکر نہیں کیا گیا ہے ان پر اجمالاً ایمان لایا جائے۔

یہود توراۃ کے سوا کچھ نہیں مانتے۔ عیسائی انجیل کے علاوہ توراۃ کی محض اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں۔ پارسی اوستا اور برہمن ویدوں سے باہر خدا کے فیضان کا تصور نہیں کر سکتے لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ اس سے پیشتر نازل ہونے والی تمام کتابوں اور صحائف پر ایمان لائے۔ البتہ جس طرح تمام انبیاء میں محمدؐ کو چند امتیازی خصائص حاصل تھے اسی طرح قرآن مجید کو بھی دیگر آسمانی کتب کے مقابلے میں چند امتیازی خصائص حاصل ہیں۔

(ا) قرآن کی پہلی امتیازی صفت تو یہ ہے کہ اسے اپنی تکمیل کا دعویٰ ہے۔ قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے بلکہ گزشتہ انبیاء نے ایک اور نبی کی بشارت اپنے پیروکاروں کو دی۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی امت کو اس بات کی اطلاع دی کہ ان کے بعد ایک اور صاحب شریعت نبی آئے گا۔

"میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی بپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا"۔

اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے بھی فار قلیط کی بشارت دی جو ان کے کام کی تکمیل

کرے گا۔

"لیکن وہ فار قلیط پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو تم سے کہیں ہیں تمہیں یاد دلائے گا۔" ص۱۵

جب کہ قرآن نے اپنے بعد کسی شریعت یا محمدؐ کے بعد کسی نبی آنے کی اطلاع نہیں دی بلکہ یوں کہا گیا کہ "آج میں نے تمہارا دین مکمل کردیا۔ اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کیا"۔ (مائدہ۔۱۰)

اسی بناء پر قرآن نے ہر جگہ **وما انزل من قبلک** کی تاکید کی لیکن **وما انزل من بعدک** کے قبول کرنے کا کہیں اشارہ تک نہیں دیا اور یوں گویا قرآن خود ختم النبوت کی دلیل بن گیا۔

(۲) قرآن کی دوسری امتیازی صفت یہ ہے کہ یہ تمام حقائق و معارف اور خیرات و صالحات کی جامع ہے۔ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اجتہاد کے ذریعہ جس کا قرآنی حل تلاش نہ کیا جاسکتا ہو۔ جب کہ دوسری کتابیں اور صحیفے اس قدر جامع ہیں نہ مکمل

(۳) قرآن کی تیسری اضافی خصوصیت جو کسی اور کتاب کو نصیب نہیں' یہ ہے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے اٹھائی لہٰذا یہ محفوظ کتاب رہتی دنیا تک لوگوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ قرآن سے قبل ہر کتاب لفظی تحریفات اور تصرفات کا شکار رہی۔ لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ باقی نہیں اور جن کی کتابیں اور صحیفے باقی بھی ہیں ان میں لفظاً اور معناً اس قدر تحریفات ہو چکی ہیں کہ اس بات کا کھوج لگانا کہ ان میں حق کہاں اور کس قدر ہے؟ امر محال ہے۔ جب کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا جو کہ ایک زندہ زبان ہے اور آج بھی انہی الفاظ میں موجود ہے چودہ سو سالوں میں اس میں ایک زبر زیر کا بھی فرق نہیں آیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس کا ضامن خود خدا ہے۔

ان علینا جمعہ و قرانہ (القیمہ)

ترجمہ : بے شک اس (قرآن) کو جمع کرنا اور پڑھا دینا ہمارا ذمہ ہے۔

قرآن کی ان اضافی خصوصیات کی وجہ سے اسلام کو اپنے پیروکاروں سے صرف

یہی مطالبہ نہیں ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے بلکہ چونکہ اس کی تعلیمات مکمل، جامع اور محفوظ ہیں اس بناء پر اسلام کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ تمام کتابوں سے اتباع کا تعلق منقطع کر کے صرف قرآن پاک کا اتباع کیا جائے۔ "پس جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور جنھوں نے اس کی مدد اور حمائت کی اور اس نور کا اتباع کیا جو اس کے ساتھ اترا ہے۔ وہی فلاح پانے والے ہیں"۔ (الاعراف)

جس طرح سے تمام نبیوں اور رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے مگر اتباع کی حد تک محمدؐ کو متبوع بنایا گیا ہے اسی طرح تمام کتب و صحائف آسمانی پر ایمان لانا ضروری ہے مگر اتباع صرف قرآن کا کیا جائے گا کیونکہ اس سے قبل کی کتابیں نہ تو اتنی جامع اور کامل تھیں اور نہ ہی محفوظ ہیں کہ ان پر عمل کیا جا سکے۔

تاسیس تہذیب میں کتاب و رسالت کا حصہ

رسالت کا عقیدہ درحقیقت اسلامی تہذیب کی روح حیات اور بنائے اصلی ہے جیسا کہ ہم ابتدائی ابواب میں بحث کر کے متعین کر چکے ہیں کہ ہر تہذیب کا ایک نظام فکر ہوتا ہے اور ایک نظام عمل اور دونوں کے اشتراک سے تہذیب یا ثقافت وجود پذیر ہوتی ہے۔ اسلامی عقائد میں سے اگر توحید نظام فکر مہیا کرتا ہے تو نظام عمل عقیدہ رسالت سے حاصل ہوتا ہے۔

اسلامی تہذیب کا نظام عمل قرآن اور سنت نبوی اور انہی دونوں کی اتباع میں پنہاں ہے۔ قرآن اپنی مکمل شکل میں اور رسول اللہ کی زندگی اپنی تمام تر جزئیات سمیت موجود ہے عمل کی تمام راہیں واضح اور متعین ہیں۔ اگر قرآن ایک طرف یہ کہتا ہے کہ **اقیموالصلوۃ** تو رسول **صلوا کما رأیتمونی اصلی** کہہ کر اس کی عملاً تشریح کرتا ہے اور یوں فکر و عمل کا نہایت مربوط اور عادلانہ نظام ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ نہ فکر میں کسی قسم کا ابہام اور شک و شبہ ہے اور نہ ہی عمل میں کوئی جھول یا بدصورتی ہے۔ یوں عقیدہ توحید فکر اسلامی کی آبیاری کرتا ہے اور عقیدہ رسالت (بالخصوص عقیدہ رسالت محمدی اور ختم النبوت) ان فکری بنیادوں پر عملاً اسلامی تہذیب کی عمارت تعمیر کرتا

ہے۔

المختصر محمدؐ کو بحیثیت رسول خدا ہونے کے واحد مقتدا اور قرآن کو بحیثیت کتاب الٰہی ہونے کے واحد کتاب آئین تسلیم کرنا اور اسی سرچشمے کو جملہ عقائد اور قوانین کا ماخذ قرار دینا اسلام کو ایک مستقل تہذیب اور مسلمانوں کو ہر قسم کے نسلی و لسانی، لونی و جغرافیائی اختلافات کے باوجود ایک قوم بناتا ہے خواہ ان کے درمیان فروعی امور میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔

حواشی و حوالہ جات

۱ - اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ص ۱۸۰

۲ - الکلام و علم الکلام، جلد ۲ ص ۸۷ (بحوالہ امام غزالی، معارج القدس)

۳ - ایضاً

۴ - حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ص ۲۲۶

۵ - الکلام و علم الکلام، جلد ۲ ص ۸۰ (بحوالہ امام غزالی، منقذ من الضلال)

۶ - طبرانی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے تاہم دوسری روایت میں اس سے کم تعداد مروی ہے۔

۷ - سیرۃ النبی، جلد ۴ ص ۵۸۴

۸ - لا نفرق بین احد من رسلہ (البقرہ)

۹ - اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ص ۱۹۸

۱۰ - اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ص ۴ - ۲۰۳

۱۱ - ایک چوتھا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک نبی کے ساتھ اس کی مدد کرنے کے لئے دوسرا نبی مبعوث کرنے کی ضرورت ہو جیسے حضرت موسیٰ کی مدد کے لئے ان کے بھائی ہارون کو مبعوث کیا گیا لیکن یہاں یہ صورت زیر بحث نہیں ہے کیونکہ مددگار نبی کی نبوت اس نبوت کا ضمیمہ ہوتی ہے جس کی معیت میں اسے وزیر کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے۔

۱۲ - اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ص ۲۰۹

۱۳ - القرآن : سورہ الاعلیٰ

۱۴ - سیرۃ النبی جلد ۴ ص ۳۴۲ (بحوالہ توراۃ، باب ۱ استثناء ۱۹ - ۱۸)

۱۵ - ایضاً (بحوالہ یوحنا ۱۴ - ۲۶)

باب یازدہم

آخرت

اسلام کے سلسلۂ ایمانیات کی آخری کڑی "آخرۃ" پر ایمان ہے۔ "آخرۃ" کے لغوی معنی دوسرا' دیگر یا پچھلے کے ہیں۔ اسلام کی اصطلاح میں آخرۃ سے مراد موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دوسری دنیا یا زندگی کے ہیں اسی لئے اس کو "حیات آخرت" اور "دار آخرت" بھی کہا گیا ہے۔ آخرت پر ایمان' اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے اور قرآن پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی بنیاد آخرت کے تصور پر قائم ہے۔ اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمال انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے۔ اسی لئے یہ تصور یا خیال ہر مذہب و قوم میں کسی نہ کسی طور سے موجود رہا ہے اور یہی وہ قوی تصور ہے جسے دنیا کے تمام معلمین اخلاق نے افراد و اقوام کی سیرت و کردار کو متاثر کرنے کی خاطر استعمال کیا خواہ زردتشت ہوں یا بدھ' حضرت عیسیٰ ہوں یا حضرت موسیٰ۔

قرآن اس دوسری زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلا دور موت سے لے کر قیامت تک کا ہے جسے "برزخ" کا نام دیا گیا ہے۔ اور دوسرا دور قیامت سے لے کر ابد تک جس میں پھر موت و فنا نہیں' اسے "بعث" یا حشر و نشر کا نام دیا گیا ہے' اور ان سب کے معنی جی اٹھنے' اکٹھے کئے جانے' اور کھڑے ہونے کے ہیں۔ لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے اور اسی لئے اس دوسری زندگی کا نام قرآن میں

الدار الاخرہ اور عقبی الدار وغیرہ ہے جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں ص۲
زندگی اور آخرت کے بارے میں ایک تو مادہ پرستوں کا نظریہ ہے۔ ان کے خیال میں جو کچھ بھی ہے اسی زندگی میں ہے اور موت کے معنی کامل فنا کے ہیں اس کے بعد کچھ نہیں ہوگا۔ رہی یہ دنیا تو یہ کارخانہ حیات یونہی چلتا رہے گا۔ اس نظام میں ایسی پائیداری ہے کہ یہ کبھی درہم برہم ہونے والا نہیں۔

"اور (انکار آخرت کرنے والے) لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف پہلی مرتبہ (ایک بار) مرنا ہے اور پھر ہمیں اٹھنا نہیں ہے"۔(الدخان ۔ ۳۵)

"اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس صرف اسی دنیا کی ہے یہیں مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے"۔(الجاثیہ ۔ ۲۴)

مادہ پرست آخرت کا انکار اس بناء پر نہیں کرتے کہ ان کو کسی ذریعہ علم سے بہ تحقیق ایسا معلوم ہو گیا ہے بلکہ انہوں نے اس ضمن میں اپنے حواس پر اعتماد کیا ہے اور یہ رائے اس لئے قائم کی ہے کہ موت کے بعد کی کوئی کیفیت ان کو محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن اس میں کوئی وزن نہیں ہے کہ چونکہ موت کے بعد کی کیفیت ان کے مشاہدے اور تجربے میں نہیں آئی لہٰذا وہ سرے سے موت اور اس کے بعد کے معاملات کا ہی انکار کردیں۔

اسی طرح مادہ پرست اس دنیا کے دائمی اور لازوال ہونے کا حکم محض اس بنا پر لگاتے ہیں کہ انہوں نے اس کو درہم برہم ہوتے نہیں دیکھا۔ یہ انتہائی ناقابل فہم استدلال ہے کیونکہ اس طرح تو کوئی بھی شخص ایک مضبوط عمارت کو دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ عمارت ہمیشہ یونہی قائم رہے گی کیونکہ نہ تو اس نے اس کو گرتے دیکھا ہے اور نہ اس میں ایسی بوسیدگی ہی نظر آتی ہے جو آئندہ اس کے گرنے کی پیش گوئی کرتی ہو ص۳

انسانی اخلاق پر انکار آخرت کے نہایت منفی اثرات پیدا ہوتے ہیں ناموافق حالات میں اس عقیدے سے ایک شدید قسم کی مایوسی اور پست ہمتی انسان پر طاری ہو سکتی ہے کیونکہ جب وہ اپنے اچھے اعمال کا کوئی نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتے نہیں دیکھے گا تو اس کی قوت عمل سرد پڑ جائے گی اور جب وہ مفسدوں اور ظالموں کو دنیا میں پھلتے

پھولتے دیکھے گا تو یا تو خود بھی بالا خرانہی کا ساتھ دے گا اور اگر وہ خود کو ان کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں پائے گا تو مستقل مایوسی' بددلی اور غم کا شکار ہو جائے گا یہی وجہ ہے کہ جن ممالک میں مادہ پرستی کا غلبہ ہے وہاں خودکشی کا رجحان زیادہ ہے جب کہ مسلمانوں میں خودکشی کی شرح سب سے کم ہے اور قرون اولیٰ میں تو اس کا نشان تک نہیں ملتا۔

دوسری طرف اگر مادہ پرست انسان کے حالات موافق ہوں گے تو اس اعتقاد کے اثر سے وہ ایک نفس پرست حیوان بن جائے گا وہ خیال کرے گا کہ جو دن بھی عیش و لطف میں بسر ہو جائیں وہی غنیمت ہیں۔۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

چنانچہ اپنے فائدے اور اپنے نفس کی خواہشات کے لئے کوئی بدتر سے بدتر فعل کرنے میں بھی اس کو باک نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ نیکی جو ایسے شخص کے تصور میں آسکتی ہے وہ بس وہی ہے جس کے اظہار سے نیک نامی' عزت' شہرت یا اور کسی قسم کے دنیوی فائدے حاصل ہو سکیں۔ اسی طرح وہ صرف ایسے ہی جرائم کو جرائم اور گناہوں کو گناہ سمجھے گا جس کا نتیجہ کسی دنیاوی سزا یا جسمانی عقوبت یا مادی نقصان کی شکل میں ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو۔ رہیں وہ نیکیاں جن کا کوئی نفع اس دنیا میں ظاہر ہونے والا نہ ہو تو وہ اس کے نزدیک حماقت سے کم نہ ہوں گی اور وہ برائیاں جن کا کوئی نقصان اس دنیا میں عائد ہونے والا نہ ہو' وہ اس کے نزدیک عین ثواب ہوں گی۔

اب ایسے افراد کے اجتماع سے بننے والا معاشرہ کیسا ہوگا؟ اس کا تصور با آسانی کیا جا سکتا ہے اس سوسائٹی کا پورا نظام اخلاق خود غرضی اور نفسانیت کی بنیاد پر تعمیر ہوگا۔

آخرت کے بارے میں ایک دوسرا نظریہ تناسخ (Transmigration) کا ہے۔ یہ نظریہ سب سے پہلے قدیم مصریوںؔ نے پیش کیا اس کے بعد اس نظریہ کو مختلف اقوام تبدیلیوں کے ساتھ اپناتی گئیں۔ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ موت کے معنی فنائے محض کے نہیں بلکہ تبدیل جسم کے ہیں۔ ایک انسان کی روح اس کے جسم سے جدا ہونے کے بعد اس کے اعمال کی مطابقت سے دوسرا قالب اختیار کر لیتی ہے۔ یعنی

اگر ایک شخص کے اعمال اس دنیا میں برے رہے ہیں اور ان کے اثر سے اس کے نفس میں بری قابلیتیں پیدا ہو گئی ہیں تو اس کی روح ادنی درجہ کی حیوانی یا نباتاتی طبقات میں چلی جائے گی۔ انسانی روح کو بار بار قالب بدل کر دنیا میں آنا پڑے گا اور اپنے اعمال کی سزا بھگتنی پڑے گی یہاں تک کہ اس کے اعمال اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل نہ رہ جائے اس وقت وہ مادی قالبوں کی قید سے نجات پاکر سورج یوک اور چندر یوک وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جاکر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کی وجہ سے بادل 'ہوا' اناج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے اور پھر نئے نئے جنموں میں سزا بھگتنے کا عمل دوبارہ شروع ہو جاتا ہے آواگون کا یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہو گا الا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترک عمل کے ذریعہ سے خود اپنے وجود سے ہاتھ دھولیا جائے اور موکش یا مکتی حاصل کرلی جائے۔[۵]

اسی طرح دنیا کے بارے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ موجودہ مادی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد پھر جب نئے سرے سے بنے گی تو پھر ایک وقت کے بعد دوسرے پرلے (قیامت) سے گذرے گی۔ دوسرے پرلے کے بعد نیا دور اسی طرح شروع ہو گا اور یہ چکر تاابد قائم رہے گا۔

اس میں شک نہیں کہ کم از کم دو اعتبار سے تناسخ کا یہ نظریہ منکرین آخرت کے عقیدے سے بہتر ہے اولاً یہ کہ انسان میں بقائے دوام کی ایک فطری خواہش موجود ہے وہ تناسخ میں ایک حد تک تسکین پاسکتی ہے۔ ثانیاً اس عقیدہ میں جزا و سزا اور اعمال کے اچھے یا برے انجام کا تخیل بہرحال موجود ہے جس کی بناء پر یہ ایک ضابطہ اخلاق کے لئے پشت پناہ بن سکتا ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ عقیدہ عقل و علم کے خلاف اور تہذیب و تمدن کی ترقی میں زبردست طور پر مانع ہے۔

عقیدہ تناسخ کی بنیاد ایسے نظریات پر ہے جو صریحاً عقل و علم کے خلاف ہیں مثلاً

۱۔ تناسخ کا یہ چکر ایسا ہے جس کا کوئی آغاز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ انسان ہونے کے لئے لازم ہے کہ اس سے پہلے نباتات و حیوان ہو اور نباتات و حیوان ہونے کے لئے

لازم ہے کہ ان سے پہلے وہ انسان ہو۔

۲ ۔ اگر تناسخ کا چکر ازلی وابدی ہے تو ماننا پڑے گا کہ نہ صرف وہ ارواح جو بار بار قالب بدلتی ہیں بلکہ وہ مادے بھی جو ان ارواح کو قالب مہیا کرتے ہیں، ازلی اور ابدی ہوں۔ یہ زمین و آسمان، نظام شمسی اور وہ تمام قوتیں جو اس نظام میں کام کررہی ہیں یہ سب بھی ازلی وابدی ہوں لیکن عقل کا دعویٰ ہے اور علمی تحقیقات اس پر شہادت دیتی ہیں کہ ہمارا نظام شمسی نہ ازلی ہے اور نہ ابدی ہے۔

۳ ۔ ماننا پڑے گا کہ نباتات اور حیوانات اور نوع بشری کی جتنی امتیازی خصوصیات ہیں وہ سب دراصل ان کے اجسام کے خاصے ہیں نہ کہ نفوس کے۔ اس لئے کہ جو نفس انسان کے قالب میں عقل و فکر کی قوتیں رکھتا تھا وہ حیوان کے قالب میں پہنچ کر لایعقل ہوگیا اور نباتاتی قالب میں پہنچ کر اس غریب سے حرکت ارادی کی قوت بھی سلب ہوگئی۔

۴ ۔ نیک و بد کا اطلاق دراصل ان اعمال پر ہوتا ہے جو سوچ سمجھ کر بالارادہ کئے جائیں۔ اس لحاظ سے انسانی اعمال تو نیک اور بد ہوسکتے ہیں اور ان پر جزا و سزا مترتب ہوسکتی ہے لیکن نباتات اور حیوانات کے اعمال پر نہ تو نیکی اور بدی کا اطلاق جائز ہے اور نہ ان پر جزا و سزا مترتب ہونے کی کوئی معقول وجہ ہے ایسا حکم لگانے کے لئے یہ ماننا ضروری ہوگا کہ نباتات اور حیوانات میں بھی سوچ سمجھ کر بالارادہ فعل کرنے کی قوت موجود ہے۔

۵ ۔ اگر بعد کی زندگی ہمارے موجودہ جنم کے کرموں کا پھل ہے تو ظاہر ہے کہ برے کاموں کا پھل برا ہی ہونا چاہئے اور جب دوسرے جنم میں وہ برا پھل ہم کو ملا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس برے پھل سے نیک اعمال صادر ہوں؟ لامحالہ اس سے برے ہی اعمال صادر ہوں گے اور پھر ان کا پھل تیسرے جنم میں اور بھی زیادہ برا ہوگا اس طرح بدکار انسان کی روح تناسخ کے چکر میں نچلے سے نچلے طبقوں کی طرف ہی گرتی چلی جائے گی۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ انسان سے حیوان تو بن سکتا ہے مگر حیوان سے انسان بننا غیر ممکن ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جو لوگ اس وقت انسان ہیں وہ کس حسن

عمل کے نتیجے میں انسان ہوئے اور کہاں سے آئے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کی بناء پر عقل سلیم تناسخ کے اعتقاد کو قبول نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان عقل و علم میں جتنی ترقی کرتا گیا تناسخ کا اعتقاد باطل ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اب وہ زیادہ تر ان قوموں میں باقی رہ گیا ہے جو عقلی اور علمی ترقی میں بہت پسماندہ ہیں نیز تناسخ کا عقیدہ ہمتوں کو پست کرنے والا اور ترقی کی روح کو مردہ کرنے والا اعتقاد ہے۔ اس سے "اہنسا" کا عقیدہ نکلا ہے جو انسان کی شخصی اور قومی زندگی کے لئے حد درجہ مہلک ہے۔ جو قوم اس عقیدہ کی قائل ہو اس کی جنگی اسپرٹ فنا ہو جاتی ہے اور اس کی جسمانی قوتیں مضمحل ہو جاتی ہیں اور یا تو وہ قوم محکوم و مغلوب ہو کر صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے اور یا دوسری طاقتور قوموں میں ضم ہو جاتی ہے۔

عقیدہ تناسخ کا دوسرا بڑا نقصان یہ ہے کہ وہ تہذیب و تمدن کا دشمن ہے اور انسان کو رہبانیت، ترک دنیا اور ترک اعمال کی طرف لے جاتا ہے۔

ان اعتقادات کے مقابل اسلام جو تصور آخرت دیتا ہے اس کے اہم نکات یہ ہیں۔

ا۔ اس کائنات کا بنانے والا ایک حکیم ہے جس کا کوئی فعل عبث نہیں اس نے یہ کائنات اور اس کی جملہ اشیاء بشمول انسان خاص مقاصد کی تکمیل کے لئے پیدا کئے ہیں۔ ہر انسان اور ہر ہر چیز فرداً فرداً اپنی ایک عمر رکھتی ہے جس کے ختم ہو جانے کے بعد اس میں فساد رونما ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کائنات کی بھی ایک عمر ہے۔

ما خلقنا السموات والارض و ما بینهما الا بالحق واجل مسمی (الاحقاف)

ترجمہ : ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان جو چیزیں ہیں ان سب کو مقتضائے حکمت کے مطابق اور ایک مدت مقررہ تک کے لئے پیدا کیا ہے۔

اس معینہ مدت کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں جب یہ مدت پوری ہو جائے گی تو سارا کارخانہ حیات درہم برہم ہو جائے گا۔ اس کو "قیامت" کہا گیا ہے۔ قرآن پاک میں قیامت کو متعدد ناموں سے یاد کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک نام اس کے کسی خاص پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا ہولناک دن ہو گا جب کوئی کسی کا مددگار نہیں

ہو گا۔

اذا السماء انفطرت واذا الکواکب انتثرت واذا البحار فجرت واذا لقبور بعثرت (الانفطار)

ترجمہ : جب آسمان پھٹ جائے گا اور کواکب منتشر ہو جائیں گے اور سمندر پھوٹ نکلیں گے اور قبریں اکھاڑ دی جائیں گی۔

اذا زلزلت الارض زلزالھا واخرجت الارض اثقالھا وقال الانسان مالھا یومئذ تحدث اخبارھا (زلزال)

ترجمہ : جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور وہ اپنا بوجھ نکالے گی اور انسان کہے گا زمین کو کیا ہو گیا؟ اس دن وہ اپنی حالت بیان کرے گی۔ (زلزال)

۴ ۔ اس نظام کے درہم برہم ہونے پر ایک نیا نظام بپا ہو گا۔ تمام انسان دوبارہ زندہ کئے جائیں گے یہ بات بت پرست عربوں کے لئے نہایت ناقابل فہم تھی اور وہ حیرت و استعجاب سے پوچھتے تھے ——"کیا جب ہم مر کر مٹی بن جائیں گے تو پھر جی اٹھیں گے؟ یہ واپسی تو بعید از عقل و قیاس ہے"۔ (ق ۔ ۱)

قرآن مجید اس کا جواب نہایت مدلل طریقے سے دیتا ہے۔

"ان سے کہو کہ پتھر بن جاؤ یا لوہا یا کوئی اور ایسی چیز جس کا زندہ ہونا تمہارے نزدیک بہت ہی بعید از عقل ہو' پھر وہ پوچھیں گے کہ کون ہم کو دوبارہ زندہ کرے گا؟ کہو کہ وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا"۔ (سورہ نبی اسرائیل)

یا جیسے سورۃ یاسین میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"اس نے کہا کہ کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ وہ بوسیدہ ہو جائیں گی؟ کہہ دے کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی بار زندگی بخشی تھی۔"

قرآن کا طرز استدلال یہ ہے کہ اشیاء کو عدم سے وجود میں لانا زیادہ مشکل ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کو منتشر اور پراگندہ ہو جانے کے بعد دوبارہ پہلی صورت پر پیدا کیا جائے۔ پس جو طاقت اس دشوار تر کام کو انجام دینے سے عاجز نہ ہوئی وہ آسان کام کو انجام دینے سے کیوں کر عاجز ہو سکتی ہے؟

۳ ۔ دوبارہ زندگی نصیب ہونے کے بعد تمام انسانوں کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہوگا۔ خدا کی عدالت بپا ہوگی۔ اس دن انسان کے تمام اعمال جو اس نے اپنی پچھلی زندگی میں انجام دیئے تھے۔ ٹھیک ٹھیک جانچے اور تولے جائیں گے اور ان کے مطابق جزا و سزا ملے گی۔ انسان کی دینوی زندگی دراصل اس کی اخروی زندگی کا مقدمہ ہے یہ زندگی عارضی ہے اور وہ پائیدار۔ یہ ناقص ہے اور وہ کامل۔ تمام اعمال کے پورے پورے نتائج اس عارضی زندگی میں مترتب نہیں ہوپاتے اس نقص کی تکمیل اس دوسری زندگی میں ہوگی اور جو کچھ یہاں بے نتیجہ اور بے ثمرہ گیا ہے وہ اپنے حقیقی نتائج اور ثمرات کے ساتھ وہاں ظاہر ہوگا۔

ولکل درجت مما عملوا (الانعام)

ترجمہ : آج تم کو ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے تم عمل کرتے تھے۔

گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں "عقاب" اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام "ثواب" رکھا گیا ہے۔ عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں گویا عقاب اس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آجاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے جس کے معنی لوٹنے کے ہیں اس لئے یہ لفظ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے۔ گویا جزا و سزا ہمارے ہی اعمال کے رد عمل کا نام ہے لہٰذا روز جزا ہمارے تمام اعضاء سرزد ہونے والے تمام اعمال و افعال کی گواہی دیں گے پھر انہی شہادتوں کی روشنی میں ان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

یوم تشھد علیھم السنتھم وایدیھم وارجلھم بما کانوا یعملون (النور ۔ ۳)

ترجمہ : وہ دن جب کہ ان پر خود ان کی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان اعمال کی گواہی دیں گے جو انہوں نے کئے تھے۔

۴ ۔ ہر نیکو کار کو اس کے اعمال صالحہ کے عوض جنت عطا کی جائے گی اور ہر مفسد کافر و بدکار کو اس کے اعمال کے عوض دوزخ نصیب ہوگی۔

وازلفت الجنۃ للمتقین و برزت الجحیم للغوین (الشعراء)

ترجمہ : جنت پرہیزگاروں کے قریب لائی جائے گی اور دوزخ گمراہوں کے سامنے

کردی جائے گی۔

جنت اس مقام کا نام ہے جو نیکو کار انسانوں کا دائمی گھر ہو گا۔ جہاں ہر طرح کا سکھ ہو گا ہزار ہا نعمتیں' جن میں سے بعض تو انسان کے وہم و گمان سے ماوراء ہیں' اس کو میسر ہوں گی حتی کہ جنتیوں کو دیدار خداوندی نصیب ہو گا۔

دراصل جنت انسان کی وراثت ہے[9] اور جنت ہی انسان کا اصلی گھر ہے اللہ تعالی کا منشا یہ ہے کہ ارواح انسانی کو ابدی سعادتیں اور غیر متناہی ترقیاں عطا کی جائیں۔ مگر اس سعادت و ترقی کا انحصار نیک اعمال کے حصول اور اعمال بد سے پرہیز پر رکھی گئی ہے چنانچہ انسان کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ احکام الہی کی تعمیل کرے تاکہ اپنی موعودہ سعادت و ترقی کو حاصل کر سکے اور اسی کا نام جنت ہے۔

اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں زیادہ ہیں تو اس کی کچھ سزا تو اسے اسی دنیا میں ناکامیوں کی صورت میں مل جاتی ہے۔ کچھ سزائیں اور عذاب وہ قبر میں یعنی عالم برزخ میں برداشت کرتا ہے۔ امت محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ کے محدود زمانہ عذاب میں نکھر کر اور پاک و صاف ہو کر جنت کے قابل ہو جائیں گے۔ اور جن کے گناہوں کی ناپاکیاں اس کے باوجود موجود رہیں گی وہ دوزخ کے سپرد کئے جائیں گے۔ جو نہایت برا ٹھکانہ ہے[10] جہاں جسمانی اور روحانی شدید عذابوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور جب تک خدا چاہے گا انہیں اسی بدترین ٹھکانہ میں رہنا ہو گا اس کے بعد انہیں نجات عطا کی جائے گی۔ اللہ تعالی کو بندوں کے عذاب سے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے دردناک عذاب کا شکار رہوں۔ اس کی نمایاں ترین صفت اس کا غفور الرحیم ہونا ہے لیکن یہ خود انسان ہے جو اپنے آپ کو اپنے اعمال بد کی وجہ سے رحمت الہی سے دور کر لیتا ہے۔

ما کان اللہ لیظلمھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون (توبہ ۔ ۹)

ترجمہ : اللہ نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا۔ لیکن وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے ہیں۔

اس لئے بہشت جو کہ اللہ کی رحمت ہے اور دوزخ جو کہ اللہ کا عذاب ہے[11]' انسان کے اپنے ہی اعمال کا لازمی نتیجہ ہے۔

المختصر یہ آخرت اور دوسری زندگی کا وہ خاکہ ہے جو محمدؐ اور انبیاء علیہم السلام کا مذہب بیان کرتا ہے۔ اور یقیناً یہ بعید از عقل نہیں' عقل سلیم اور علم حقیقی ہم کو اخروی زندگی کے اس تصور پر ایمان لانے سے روکتے نہیں بلکہ آمادہ کرتے ہیں۔

عقیدہ آخرت کے فوائد و اثرات

اخروی زندگی کا اسلامی نظریہ محض ایک مابعد الطبعی نظریہ' یا کوئی فلسفیانہ فکر یا کوئی علمی مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کا انسان کی اخلاقی اور عملی زندگی سے نہایت گہرا تعلق ہے اس کے ماننے سے دنیوی زندگی اور اس کے معاملات سے متعلق انسان کا نقطہ نظر بنیادی طور پر بدل جاتا ہے۔ اس اعتقاد کو تسلیم کرنے کا سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ انسان خود کو جوابدہ اور ذمہ دار محسوس کرنے لگتا ہے وہ اپنی زندگی کے تمامتر معاملات یہ سمجھتے ہوئے انجام دیتا ہے کہ وہ اپنی ہر ہر حرکت اور ہر ہر فعل کے لئے خدا کے آگے جوابدہ ہے اور انہی اعمال پر اس کی دوسری زندگی کی سعادت و راحت کا دارومدار ہے۔ بخلاف اس کے اس اعتقاد پر ایمان نہ رکھنے کے معنی یہ ہوئے کہ انسان اپنے آپ کو مطلق العنان' غیرذمہ دار اور مجموعی طور پر اپنی زندگی کو بے نتیجہ خیال کرنے والا ہوگا۔ وہ یہ سمجھ کر زندگی گذارے گا کہ وہ کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہے نہ ہی اس کا کوئی حساب لینے والا ہے۔ لہٰذا حق سے تجاوز کرنا اور گناہوں میں مبتلا ہو جانا' انکار آخرت کا لازمی نتیجہ ہے۔

افحسبتم انما خلقنکم عبثا و انکم الینا لا ترجعون (المومنون)

ترجمہ : کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور تم ہمارے پاس واپس نہ لائے جاؤ گے؟

تصور آخرت سے جو دوسرا زبردست اثر انسان پر مرتب ہوتا ہے وہ یہ کہ ایسا انسان دنیوی معاملات کے صرف ظاہری پہلو ہی کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظر دور رس و دوربین ہوتی ہے۔ جب کہ وہ انسان جو یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا انتہائی سطحی نگاہ کا حامل ہوتا ہے اور اعمال کے ظاہری نتائج سے دھوکا کھا جاتا ہے اور اسی کو اپنے حق

میں بہتر جان کر پسند کرتا ہے۔

کلا بل تحبون العاجلۃو تذرون الاخرۃ (القیمۃ)

ترجمہ : ہرگز نہیں، تم تو فوری حاصل ہونے والے نتائج کو پسند کرتے ہو اور آخرت کے نتائج کو چھوڑ دیتے ہو۔

اس ظاہر بینی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی نگاہوں میں اشیاء کی اخلاقی قدروں کا معیار بالکل الٹا ہو جاتا ہے۔ ایک مومن دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والا ہوتا ہے کیونکہ اسے اس بات کا پورا پورا علم ہے کہ وہ تکلیف جو اس نے کسی نیکی کے کام کی وجہ سے اٹھائی وہ تکلیف تو بہر حال ختم ہو جائے گی البتہ اس نیکی کا اجر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم ہو جائے گا۔ اسی طرح وہ لذت جو اس نے کسی گناہ کے کام سے حاصل کی وہ لذت تو بالآخر ختم ہو جائے گی البتہ اس کا عذاب اسے اس وقت تک بھگتنا پڑے گا جب تک کہ خدا چاہے۔ لہٰذا وہ یہ گھاٹے کا سودا کسی قیمت پر نہیں کرے گا اور اس عارضی دنیا میں اپنے آپ کو گناہوں سے محفوظ رکھے گا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی جان سے گذر جانا وہ اس جنت کے عوض قبول کر لے گا جس کا اس کے رب نے اس سے وعدہ کیا ہوا ہے۔

غزوہ احد[12] کا ایک واقعہ ہے کہ میدان میں دارو گیر کا شور برپا تھا۔ لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں کہ ایک صحابیؓ نے آگے بڑھ کر پوچھا یا رسول اللہ اگر خدا کی راہ میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا؟ فرمایا جنت میں۔ وہ کھجور کھا رہے تھے، ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور لڑ کر جان دے دی۔

اعتقاد یوم آخر کا تیسرا زبردست فائدہ یہ ہے کہ اسلام اس عقیدہ کو اپنے اخلاقی نظام کی قوت نافذہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ کیونکہ اسلام یہ جتا دیتا ہے کہ ہر شخص کی برائی یا بھلائی کا تمامتر ریکارڈ روز جزا اس کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ اس دن اس کے اعضاء اور اعمال اس کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دیں گے اس دن نہ کسی کی اولاد و مال کام آئیں گے نہ کسی کی سفارش و رشوت قبول کی جائے گی بلکہ ہر ایک کو اس کے اعمال کا ٹھیک بدلہ دیا جائے گا ـــــ یہ خیال قوت نافذہ کا کام کرتا ہے۔ یہ وہ پولیس اور عدالت ہے جس کا خوف انسان کے دل میں بٹھا دیا گیا ہے یہ دنیا

یہ دنیا کی پولیس یا عدالت نہیں جس کی نگاہ یا گرفت سے انسان بچ سکتا ہے بلکہ یہ ایسی پولیس ہے جو ہر حال میں اس کی نگرانی کر رہی ہے اور یہ ایسی عدالت ہے جس سے کوئی چھٹ نہیں سکتا۔

واتقوا اللہ واعلموا انکم ملقوہ (البقرہ)

ترجمہ : اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ تم کو اس کے پاس حاضر ہونا ہے۔

اس طرح اسلام نے یوم آخر کے عقیدہ کو اپنے ضابطہ اخلاق اور نظام شرعی کے لئے زبردست پشت پناہ بنا دیا ہے جس میں ایک طرف خیر و صلاح پر عمل کرنے اور شر و فساد سے بچنے کے لئے عقلی ترغیب بھی موجود ہے اور دوسری طرف نیکی پر یقینی جزا اور بدی پر یقینی سزا کا خوف بھی۔ اس کا ضابطہ اور نظام اپنے بقا واستحکام کے لئے مادی طاقت اور حاکمانہ اقتدار کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ ایمان بالیوم الاخر کے ذریعہ سے انسان کے نفس میں ایک ایسے طاقت ور ضمیر کی تشکیل کرتا ہے جو کسی بیرونی لالچ اور خوف کے بغیر انسان کو آپ سے آپ ان نیکیوں کی طرف راغب کرتا ہے جن کو اسلام نے آخری نتائج کے اعتبار سے نیکی قرار دیا ہے اور ان گناہوں سے بچنے کی تاکید کرتا ہے جن کو اس نے آخری نتائج کا لحاظ کرتے ہوئے گناہ ٹھرایا ہے۔

تشکیل تہذیب میں عقیدہ آخرت کا حصہ

کائنات اور اس کائنات میں انسان جو زندگی گذارتا ہے نیز اس کائنات اور انسان کی تخلیق جس مقصد کے لئے کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی غیر مشروط و خالص اطاعت کی جائے۔ اس ضمن میں انسان کی صحیح راہنمائی کرنے کے لئے اللہ نے اپنی پہچان کرانے اور صحیح معرفت حاصل کرنے کے لئے انسان کو رسولوں کے ذریعہ توحید کا علم دیا جو انسان کو تمام تر فکری اساسیں مہیا کرتا ہے۔ پھر خدا کی منشا و مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا اسوہ عقیدہ رسالت سے حاصل ہوتا ہے جو انسان کو تمام تر عملی بنیادیں فراہم کرتا ہے' اور یوں ایک تہذیب جنم لیتی ہے جسے ہم اسلامی تہذیب کہتے ہیں۔ لیکن اس تہذیب کو نافذ کیسے کیا جائے؟ اس کی تنفیذ میں تصور توحید سے

کسی حد تک اور تصور آخرت سے بڑی حد تک کام لیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہ تصور انسان میں ایک زبردست محتسب کو جنم دیتا ہے جسے ہم اس کا ضمیر بھی کہہ سکتے ہیں جو اسے ان جگہوں پر بھی برائی کرنے سے روکتا ہے جہاں دنیاوی پولیس یا عدالت کی پہنچ نہیں ہوتی۔ بعض بظاہر معمولی اخلاقی معاملات میں بھی وہ ڈرتا رہتا ہے مثلاً ایک روزہ دار چاہے تو دنیا والوں سے چھپ کر کھا پی سکتا ہے لیکن وہ تنہائی میں بھی ایسا نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا سے اور آخرت میں اس کی پکڑ سے ڈرتا ہے اور آخرت میں حاصل ہونے والی سعادت اسے دنیاوی تکلیف برداشت کرنے کا اہل بنا دیتی ہے۔ اس طرح اسلامی تہذیب بجا طور پر اس بات کی دعویدار ہے کہ اس کا اپنا نظام فکر و عمل اور اپنی قوت نافذہ ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱ - المنجی ص ۵۰

۲ - سیرۃ النبی جلد ۵، ص ۶۳۵

۳ - اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ص ۲۴۲

۴ - امیر علی، ص ۱۸۹

۵ - سیرۃ النبی، جلد ۴، ص ۷۱۵

۶ - اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ص ۹ - ۲۴۸

۷ - سائنس دانوں کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ یہ کائناتی نظام آہستہ آہستہ فنا اور انتشار کی طرف بڑھ رہا ہے گویا سائنس بھی کم از کم اس کے ابدی نہ ہونے کی قائل ہے۔

۸ - سیرۃ النبی، جلد ۴، ص ۷۲۵

۹ - مومنین اپنے نیک اعمال اور تقویٰ کی وجہ سے جنت کے وارث بنائے گئے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ مضمون سورہ مومنون، سورہ زخرف، سورہ شعراء، سورہ مریم اور سورہ اعراف وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے۔

۱۰ - سیرۃ النبی، جلد ۴، ص ۶۲۷ (بحوالہ ابن القیم، شفاء العلیل، مصر)

۱ - اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "جنت میری رحمت اور دوزخ میرا عذاب ہے" (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

۲ - سیرۃ النبی، جلد ۴ ص ۸۵۹

باب چہاردہم

عبادات

عبادت کا مادہ ع ب د ہے اور اس کے لغوی معنی "غایت تذلل" کے ہیں یعنی انتہائی عاجزی و درماندگی کا اظہار۔ عبادت کے عام معنی پرستش کے ہیں جو کسی کی بھی ہو سکتی ہے تاہم اصطلاح شریعت میں اللہ تعالیٰ کی بندگی و اطاعت، اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکامات کو بجالانا عبادت ہے۔

عبادت اللہ تعالیٰ کا اس کے بے پایاں انعام کی وجہ سے بندے پر حق ہے[1] خداوند تعالیٰ منعم ہے اور منعم کا شکریہ واجب ہوا کرتا ہے عبادات انہی انعامات کے شکریہ کا نام ہے نیز یہ امر فطری طور سے بندے (مخلوق) کے وجدان میں موجود ہے[2]۔

عبادت کے سلسلہ میں مادہ پرست اذہان بہت کچھ شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اللہ کو بندے کی اس عبادت و دعا کی کیا ضرورت ہے؟ یہ درست ہے کہ اللہ کی ذات ہماری عبادتوں سے بے نیاز ہے البتہ مخلوق خدا خود عبادت کی ضرورت مند ہے۔ کیونکہ انسان فطرتاً اور خلقاً کمزور اور ناقص پیدا کیا گیا ہے اسے زندگی میں ہزارہا موقعوں پر بے کسی اور بے بسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بے بسی کے ان لمحات میں وہ اپنی ہستی اور اپنی صلاحیتوں پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے رب کو پکارتا ہے اور اس سے مدد کا طالب ہوتا ہے۔ انبیاء تک نے نازک لمحات میں خدا سے دعا مانگی ہے[3]۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو عبادت انسان کی ضرورت ہے جو اسے یک گونہ تسلی اور اطمینان قلب عطا کرتی ہے۔ جو لوگ عبادت کے قائل نہیں وہ نازک لمحات میں مایوس ہو کر بے آبرو اور بے توازن ہو جاتے ہیں۔

عبادت انسان کی صرف فطرت اور ضرورت ہی نہیں بلکہ تکمیل شخصیت اور

توسیع صلاحیت کا باعث بھی ہے۔ عبادات کے ذریعہ ہی انسان معرفت کے درجہ کو پہنچ سکتا ہے۔[4]

جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو خدائے واحد کی عبادت کے طریقے بتائے اس وقت دنیا کی تقریبا تمام ہی اقوام اپنے اپنے خداؤں کی عبادت اپنے اپنے طریقوں سے کر رہی تھیں۔ اور اس ضمن میں شدید افراط و تفریط کا شکار تھیں۔ ایک طرف عیسائی تھے جنھوں نے راہبانیت کی دشوار ترین اور جسم کش راہ اختیار کر کے جو کہ ان کے یہاں عبادت کا صحیح طریقہ تھا' عملی زندگی سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ تو دوسری طرف یہود تھے جو اپنی اخلاقی اور مذہبی بد عملیوں کی وجہ سے سخت بدنام تھے ان میں روحانیت نام کو نہ تھی ان کی عبادت محض یہ تھی کہ سبت کے دن عبادت کر کے اور دنیاوی کوئی کام نہ کر کے خدا کو خوش کریں۔ ایک طرف آتش پرست تھے جو آتش کدوں میں آگ کے آگے سربسجود تھے تو دوسری طرف بت پرست جو سینکڑوں بتوں کی پوجا و پرستش میں مصروف تھے جو کہ ان کے حاجت روا تھے۔ غرضکہ دنیا کے تمام معلوم خطوں میں عبادت اور پرستش تو ہو رہی تھی لیکن یہ وہ حقیقی عبادت نہ تھی جس کا مطالبہ اپنا حق سمجھتے ہوئے خدا بندے سے کرتا ہے۔

اس کے مقابلے میں اسلام اپنے ماننے والوں کو عبادت کا ایک سیدھا سادھا اور قابل قبول تصور دیتا ہے۔ وہ چند عبادات مثلا نماز' روزہ' حج' زکواۃ وغیرہ کو ایک طرف تو فرض قرار دیتا ہے۔ لیکن ان فرائض کی ادائیگی کے بعد انسان کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ نہیں دیتا بلکہ دوسری طرف انسان کو ان فرائض کی کسوٹی سے گزار کر اس کی پوری زندگی کو عبادت بنا دیتا ہے یہاں تک کہ اس مسلمان کا سونا جاگنا' کھانا پینا اور دیگر تمام دنیاوی معاملات عین عبادت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں یوں اسلام انسان سے ترک دنیا کا مطالبہ کئے بغیر اس کی پوری زندگی کو عبادت بنا دیتا ہے۔

صحابہ میں بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی راہبوں کے اثر یا ذاتی میلان طبع کے سبب سے تجرد' ترک لذائذ اور ریاضات شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے لیکن آنحضرتؐ نے ان کو اس سے باز رکھا۔ قدامہ بن مظعون اور ان کے ایک رفیق نے

دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم میں سے ایک نے عمر بھر مجرد رہنے اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "میں تو دونوں باتیں کرتا ہوں" یہ سن کر دونوں اصحاب اپنے اپنے ارادوں سے باز رہے۔[5]

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے جو کہ نہایت عابد و زاہد صحابی تھے یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے آنحضرتؐ کو خبر ہوئی تو انہیں بلا کر فرمایا "اے عبداللہ تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے' تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے۔ تمہاری بیوی کا بھی حق ہے۔ مہینے میں تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے"۔[6]

اسی قسم کی نصیحت آپ نے ایک دوسرے تقشف پسند صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون کو فرمائی آپؐ کو ان کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ شب و روز عبادت میں مصروف رہتے ہیں' بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ دن کو روزے رکھتے ہیں۔ رات کو سوتے نہیں آپ نے ان کو بلا کر پوچھا "کیوں عثمان تم میرے طریقے سے ہٹ گئے ہو" عرض کی "خدا کی قسم میں نہیں ہٹا ہوں میں آپ ہی کے طریقہ کا طلب گار ہوں" فرمایا "میں سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں۔ روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ اے عثمان خدا سے ڈرو کہ تمہارے اہل و عیال کا بھی تم پر حق ہے تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے تو روزے بھی رکھو' افطار بھی کرو' نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔"[7]

گویا کہ صرف نمازیں پڑھنا اور روزے رکھنا ہی عبادت نہیں ہے بلکہ دوسروں کے حقوق ادا کرنا اور اپنے جسم کا حق ادا کرنا بھی عبادت ہے۔ یہ معتدل راستہ بتا کر رسول اللہ نے مسلمانوں کو عبادت کے معاملہ میں افراط و تفریط کا شکار ہونے سے بچایا ہے۔

عبادت کی غرض و غایت حصول تقویٰ ہے۔ تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور برے کاموں سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام میں عبادت کی اصل غرض ہے۔ نماز' روزہ اور دیگر تمام عبادتیں سب اسی غرض کے حصول کی خاطر ہیں۔ اس بناء پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال و اعمال جن سے شریعت کی نظر میں یہ غرض حاصل ہو سب عبادت

ہیں۔[8]

اس اعتبار سے ہم عبادت کو صرف دعا نماز اور قربانی کے دائرے میں محدود نہیں کر سکتے بلکہ ہر وہ کام جو خدا کی رضا کے لئے اور حصول تقویٰ کی غرض سے کیا جائے عبادت ہے چنانچہ بہت سے بظاہر خالص دنیاوی امور بھی عبادت بن جاتے ہیں مثلاً

——"تمہارا اپنے بھائی کو دیکھ کر مسکرا دینا بھی صدقہ ہے۔"

——"راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔"

سنن ابی داود میں یہ حدیث موجود ہے کہ ایک دن آپؐ نے صحابہ سے فرمایا "کیا میں تم کو نماز، روزہ، اور زکواۃ سے بھی بڑھ کر درجہ کی چیز نہ بتاؤں؟ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ارشاد فرمایئے۔ آپ نے فرمایا "وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہے"۔

یہاں تک کہ اگر کسی شخص میں نیکی کے کام کی استطاعت نہ ہو تو اسے چاہئے کہ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہ کرے یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو ہر شخص اپنے حق میں کر سکتا ہے۔[9] اس طرح معمولی سے معمولی اور بظاہر دنیاوی امور کو بھی عبادت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے بشرطیکہ ان امور سے مقصد خدا کی رضا حاصل کرنا ہو۔ جب کہ دوسری طرف بڑے سے بڑا کام اور عظیم سے عظیم نیکی بھی کوئی وزن نہیں رکھتی اگر اس میں تقویٰ کہ جگہ ریا کا شائبہ پایا جاتا ہو۔ چنانچہ وہ شخص جو لاکھوں روپے امدادی و خیراتی کاموں میں خرچ کرتا ہے تاکہ اس کی شہرت ہو تو یہ عبادت نہیں ریا کاری ہے۔ لیکن محض خدا کی رضا کے لئے۔ حصول تقویٰ کے لئے یا امید اجر و ثواب سے کسی ضرورت مند کو چند کوڑیاں بھی دی جائیں تو یہ عظیم نیکی میں شمار ہوتی ہے۔

ایک دن غریب و نادار صحابہ نے دربار رسالت میں شکایت کی "یا رسول اللہ دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے۔ ہماری طرح وہ بھی نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں اس کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی بجالاتے ہیں جو ہم نہیں کر سکتے" رسول اللہ نے فرمایا "کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہیں دی جس کو صدقہ کر سکو تمہارا سبحان اللہ اور الحمدللہ کہنا بھی صدقہ ہے۔ یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقے سے

پوری کرتا ہے وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا "یا رسول اللہ وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لئے یہ کرتا ہے"۔ فرمایا "اگر وہ ناجائز طریقے سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اس کو جائز طریقے سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہیں ملے گا""؟[10]

رسول اللہ کی ان تعلیمات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام نے عبادت کے مفہوم کو زبردست وسعت دے کر پوری انسانی زندگی پر محیط کردیا ہے اور خدا کے اس ارشاد سے کہ **وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون**۔ (میں نے انسانوں اور جنوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ ذریت۔۵۱) مراد یہی عبادت ہے جس کو وسیع تر مفہوم میں لیا جاتا ہے۔ رہ گئے وہ شرعی فرائض یعنی نماز' روزہ' حج اور زکواۃ وغیرہ تو یہ وہ عبادات ہیں جو انسان کو ذہنی طور پر امادہ اور تیار کرتی ہیں کہ وہ اپنی پوری زندگی عبادت میں ڈھال لے۔ اسی وجہ سے ان کو ارکان اسلام کہا گیا ہے۔ جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے۔

حوالہ جات

(۱) حجتہ اللہ البالغہ جلد ۱ ص ۱۸۰۔ ۱۷۹

(۲) ایضا

(۳) دعا کو بہترین عبادت کہا گیا ہے۔ ترمذی میں دعا کو عبادت کا مغز (الدعا مخ العبادۃ) کہا گیا ہے۔ نیز یہ کہ دعا سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک کوئی چیز زیادہ معزز نہیں۔

(۴) محمد غزالی کیمیائے سعادت ۴۳ مترجم محمد سعید احمد نقشبندی کراچی ۱۹۸۶

(۵) صحیح بخاری' کتاب الصوم' جلد ۲

(۶) ایضا ص ۲۰۷ جلد ۲

۷(۷) ندوی' سید سلیمان' سیرۃ النبی' جلد پنجم ص ۲۳' اسلام آباد (بحوالہ ابوداؤ)

(۸) ایضا ص ۳۱

(۹) صحیح بخاری، کتاب الادب، جلد ۳ ص ۳٦۷

(۱۰) سیرۃ النبی، جلد ۵ ص ۳۵ (بحوالہ ادب المفرد۔ امام بخاری)

باب پانزدہم

نماز

نماز کے لئے قرآن مجید میں "صلوۃ" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ نماز فارسی زبان کا لفظ ہے جو اردو میں "صلوۃ" کے معنوں میں مستعمل ہے۔ "صلوۃ" کا مادہ ص' ل' و اور بعض کے نزدیک ص' ل' ی' ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں دعا و تسبیح' استغفار رحمت' ثنا' ترحم وغیرہ لفظ صلوۃ جب اللہ تعالیٰ سے منسوب ہو تو اس کے معنی رحمت ہیں اور جب مخلوق یعنی ملائکہ اور جن وانس سے منسوب ہو تو اس کے معنی قیام اور رکوع و سجود کے ہیں اور جب پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں سے نسبت ہو تو اس کے معنی تسبیح کے ہوں گے۔[1]

اسلامی اصطلاح میں صلوۃ اس مخصوص عبادت کا نام ہے جو ارکان اسلام میں سے ہے اس کے حقیقی معنی تعظیم کے ہیں اور یہ مخصوص عبادت اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے لئے فرض کی گئی ہے۔

نماز کی حقیقت

توحید کے بارے میں یعنی اللہ کی ذات و صفات اور کمالات و احسانات کا جو علم انبیاء علیہم السلام کے توسط سے بندوں کو حاصل ہوتا ہے اس کو مان لینے اور اس پر ایمان لانے کا پہلا فطری اور قدرتی تقاضا یہ ہے کہ انسان اس اللہ کے حضور میں اپنی فدویت و بندگی اور محبت و شیفتگی کا اظہار کر کے اس کا قرب اور اس کے بے پایاں

احسانات کا شکریہ ادا کرکے اس کی رحمت و رضا حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ نماز کا اصل موضوع اور اس کی اصل غرض و غایت یہی ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ نماز ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کوئی پیغمبر نہیں آیا جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم نہ دی ہو۔[۲] قرآن مجید میں یہ لفظ تقریباً سو[۳] مرتبہ آیا ہے اور مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ نماز اپنی عظمت شان اور مقتضائے عقل و فطرت ہونے کے لحاظ سے تمام عبادات میں خاص امتیاز رکھتی ہے اور خدا شناس اور خدا پرست انسانوں میں سب سے زیادہ معروف مشہور اور تزکیہ نفس و تربیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ نفع بخش ہے۔ اسی لئے شریعت نے اس کی فضیلت' اس کے اوقات کی تعین و تحدید اور اس کے شرائط و ارکان اور آداب و نوافل اور اس کی رخصتوں کے بیان کا جو اہتمام کیا ہے وہ کسی دوسری عبادت کے لئے نہیں کیا۔ اپنی خصوصیات و امتیازات کی وجہ سے نماز کو دین کا عظیم ترین شعار اور امتیازی نشان قرار دیا گیا ہے۔[۴]

شاہ ولی اللہ نماز کو بندے کا ایک تعظیمی فعل قرار دیتے ہیں یعنی انسان اپنی خاکساری و عاجزی اور پروردگار کی برتری و عزت کا خیال کرکے اس کے آگے سرنگوں ہو جائے۔ اور چونکہ تمام لوگوں اور بہائم میں گردن اکڑانا اور سربلند کرنا غرور تکبر کی علامت ہے اور سرنگوں ہونا نیازمندی و فروتنی کی علامت ہے اس اعتبار سے نماز تمام عبادات میں سب سے نمایاں ہے جس میں بندہ اپنے جسم کے سب سے بزرگ حصے (یعنی سر) کو زمین پر رگڑتا ہے۔[۵] یہ اپنے رب کی انتہائی تعظیم اور بندہ کا اپنی انتہائی درماندگی کا اظہار ہے اور یہ ادا خدا کو نہایت محبوب ہے۔

نماز کی فضیلت و اہمیت :-

توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کو ملا وہ نماز سے متعلق تھا۔ یہ وہ فرض عبادت ہے جو آغاز اسلام سے عائد کی گئی اور شب معراج میں اس کی باقاعدہ فرضیت کا حکم ملا۔[۶] جبکہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو منصب نبوت

پر سرفراز فرمانے کے بعد ہی انہیں نماز کا طریقہ سکھادیا تھا قرآن مجید میں اکثر موقعوں پر "اقامت الصلوٰۃ" کی تاکید آئی ہے اور اسے اہل ایمان کی لازمی صفت بتایا گیا ہے۔ قرآن ان مسلمانوں کے لئے حقیقی کامیابی کی بشارت دیتا ہے جنہوں نے پاکیزگی کے اصول اپنائے اور نماز پڑھی۔

قد افلح من تزکیٰ و ذکر اسم ربہٖ فصلیٰ (اعلیٰ)

ترجمہ کامیاب وہ ہوا جس نے پاکی حاصل کی اور خدا کا نام یاد کیا' پس نماز پڑھی۔

نیز "جو لوگ کتاب کی پابندی کرتے ہیں اور جنہوں نے نماز قائم رکھی ہے۔ یقیناً ایسے نیک کردار لوگوں کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے"۔ (سورۃ الاعراف۔ ۱۷۰)

حضرت نبی کریم (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) سے پوچھا گیا "کون سا عمل بہترین اور افضل ہے؟" تو آپ نے فرمایا "نماز وقت مقررہ پر"۔

نماز کی فضیلت و عظمت و جلالت قدر کے بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو مخاطب کرکے فرمایا کہ بتاؤ اگر کسی کے دروازے پر نہر ہو اور وہ ہر روز پانچ مرتبہ اس نہر میں نہاتا ہو۔ پھر بھی اس کے بدن پر کچھ میل باقی رہ جائے گا؟" صحابہ نے جواب دیا کہ اس کے بدن پر کچھ بھی میل باقی نہ رہے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی کیفیت نماز کی ہے جس طرح نہانے سے بدن کی کثافت دور ہو جاتی ہے اسی طرح نماز پڑھنے سے روح کی کثافت و گندگی دور ہو جاتی ہے۔[۸]"

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بارے میں گفتگو فرماتے ہوئے ارشاد کیا کہ جو بندہ نماز اہتمام سے ادا کرے گا تو وہ قیامت میں اس کے واسطے نور ہوگی' دلیل ہوگی اور نجات کا ذریعہ بنے گی اور جس شخص نے نماز کی ادائیگی کا اہتمام نہیں کیا وہ نہ اس کے واسطے نور بنے گی نہ برہان اور نہ ذریعہ نجات اور وہ بدبخت قیامت میں قارون' فرعون' ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا"۔[۹]

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن سردی

کے ایام میں باہر تشریف لے گئے۔ درختوں کے پتے (خزاں کے سبب) جھڑ رہے تھے آپ نے ایک درخت کی دو ٹہنیوں کو پکڑا تو ایک دم اس کے پتے جھڑنے لگے۔ پھر حضور نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا اے ابوذرؓ میں نے عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے ارشاد فرمایا "جب مومن بندہ خالص اللہ کے لئے نماز پڑھتا ہے تو اس کے گناہ ان پتوں کی طرح جھڑ جاتے ہیں۔" (مسند احمد)

نماز اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان، جب تک اس میں کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے، کسی حالت میں بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی اہمیت پر خاص طور سے زور دیتے ہوئے اسے دین کا ستون قرار دیا۔ جس طرح ستون کے گرنے سے عمارت گر جاتی ہے اسی طرح ترک نماز سے دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفر اور ایمان کے مابین نماز ہی کو فرق قرار دیتے تھے۔

بین العبد و بین الکفر ترک الصلوٰۃ

ترجمہ یعنی بندہ اور کفر کے درمیان نماز چھوڑ دینے ہی کا فاصلہ ہے (صحیح مسلم)

قرآن نماز ادا کرنے میں سستی اور کاہلی کو نفاق کو علامت قرار دیتا ہے سورۃ توبہ میں فاسقین کے بارے میں کہا ہے

"یہ لوگ نماز کے لئے آتے ہیں تو کسمساتے ہوئے آتے ہیں"۔(سورۃ توبہ ۵۴)۔

یا جیسے سورۃ نساء میں ارشاد ہوتا ہے۔

"جب یہ (منافق) نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں"۔(سورۃ النساء۔ ۱۴۲)

نماز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اقامت الصلوٰۃ اسلامی حکومت کے بنیادی مقاصد اور فرائض میں سے ایک ہے۔ قرآن کہتا ہے۔

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔" **(سورۃ الحج**

(۴۱۔۔

اولی الامر کی اطاعت اسی وقت تک مسلمانوں پر فرض ہے جب تک وہ نماز قائم کرتے رہیں۔ اور ترک صلوۃ وہ سبب ہے کہ ان کے خلاف جدوجہد درست ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضی کیا وہ بری الذمہ ہوا۔ اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا۔ مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا پھر جب ایسے حکام کا دور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں"۔ (صحیح مسلم)

یعنی ترک نماز وہ علامت ہوگی جس سے صریح طور پر یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ اطاعت خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باہر ہو گئے ہیں اور پھر ان کے خلاف جدوجہد کرنا درست ہوگا۔ اسی سلسلہ کی ایک اور حدیث ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے بدترین سردار وہ ہیں جو تمہارے لئے مبغوض ہوں اور تم ان کے لئے مبغوض ہو۔ تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ صورت ہو تو کیا ہم ان کے مقابلہ پر نہ اٹھیں؟ فرمایا نہیں جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔ نہیں جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں"۔ (صحیح مسلم)

گویا کہ حکام اور اولی الامر کی اطاعت اسی وقت تک ہے جب تک کہ وہ نماز کا نظام قائم رکھیں۔ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ ان کی حکومت اپنی اصولی نوعیت کے اعتبار سے ایک اسلامی حکومت ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو ایسی حکومت اور حکمرانوں سے نجات حاصل کرنے کی سعی کرنا مسلمانوں کے لئے جائز ہو جائے گا۔

نماز کے فوائد و اثرات :۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق و تمدن اور معاشرت کی جتنی اصلاحات کیں ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا۔ اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی' وحشی اور غیر متمدن ملک کو جسے پہنے اوڑھنے کا سلیقہ نہیں تھا چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی عبادت ہے مگر اس کے اثرات و برکات' فیوض و فوائد کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ اسلام نے نماز کے ذریعہ انسان سازی کا کام لیا ہے وہ اس طرح کہ تنہا یہ ہی عبادت انسان کے جسم اور اس کے نفس کی تعمیر کے لئے کافی ہے۔

تعمیر جسم : -

اولا ــــــــــ نماز سے مسلمانوں میں ستر پوشی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ انسان کے تصور حیا کی نگہداشت کے لئے ستر پوشی ایک ضروری چیز ہے۔ عرب کے بدو اس بات سے اسی طرح ناواقف تھے جس طرح آج کے مغربی ممالک کے بیشتر باشندے قرآن کہتا ہے۔

خذوا زینتکم عند کل مسجد - (الاعراف)

ترجمہ ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو

اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو اور جہاں جہاں اسلام گیا وہاں کے برہنہ باشندوں کو ستر عورت پر مجبور کیا اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ مرتبہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لئے ان کو ستر پوش بنا دیا۔ اس چیز نے انسان کو ظاہری وقار اور حیا عطا کی۔

ثانیا ــــــــ نماز انسان میں طہارت و پاکیزگی کی عادت پیدا کرتی ہے نماز کی درستی کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان کا جسم اس کا لباس اور اس کی جائے نماز نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہو۔ نماز سے پہلے وضو کرنا ضروری ہے۔ اس وضو کے ذریعہ انسان اپنے جسم کے اعضاء کو دھو کر صاف کرتا ہے' ناک' کان میں پانی ڈال

کر اس کی گندگی کو دور کرتا ہے۔ دانتوں کی صفائی کے لئے مسواک کی اتنی تاکید فرمائی کہ گویا وجوب کے قریب پہنچ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا "اگر میری امت پر یہ شاق نہ گذرتا تو میں اس کو (مسواک کو) ضروری قرار دیتا۔" اسی طرح ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمعہ کو نماز سے قبل غسل کو واجب کیا گیا۔ استنجاء، بیت الخلاء اور طہارت کے وہ آداب نماز کے حوالے سے اسلام نے اپنے پیروکاروں کو چودہ سو سال قبل سکھائے جن سے آج کی بڑی بڑی متمدن قومیں بھی نا آشنا ہیں۔

جسم و لباس کی پاکیزگی و طہارت سے ایک فائدہ تو یہ حاصل ہوتا ہے کہ اس سے انسان کو روحانیت حاصل ہوتی ہے جب وہ اپنے جسم کو ظاہری کثافتوں سے پاک کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کے نتیجے میں وہ اپنی روح کو بھی گناہوں کی کثافتوں سے صاف رکھنے کی فکر کرے گا ــــــ دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ یہ پاکیزگی و صفائی صحت کی برقراری کے لئے ضروری ہے۔ طب اور حفظان صحت کے اصولوں میں سے ایک زریں ترین اصول جسم و لباس کی طہارت و پاکیزگی ہے۔

تعمیر سیرت :-

جسمانی طہارت و نظافت کے ساتھ ساتھ نماز سے مطلوبہ سیرت سازی کا کام لیا جا سکتا ہے جیسا کہ پہلے لکھا گیا نماز دراصل اللہ کی بے پایاں نعمتوں کا اعتراف اور اس کا اظہار تشکر ہے جو ایک مسلمان بندہ اپنے دل و زبان سے ادا کرتا ہے۔ تاکہ نفس و روح اور دل و دماغ پر اس کی عظمت و بزرگی اور اپنی عاجزی و بے چارگی کا نقش بیٹھ جائے اگر نماز کو اس طرح ادا کیا جائے جیسا کہ اس کی ادائیگی کا حق ہے تو یہ انسانوں کو برائیوں سے روکنے والی اور انہیں انسانیت کی معراج تک لے جانے والی عبادت ہے۔ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ تشریف رکھتے تھے ایک شخص نے سائل کی صورت میں آکر نماز کی حقیقت دریافت کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمائی۔ سائل نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احسان

کیا ہے؟ فرمایا کہ تم اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو دیکھ ہی رہا ہے۔[۱۲]"

اس احسان کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز ایک مخلص نمازی کے دل و دماغ پر زبردست نفسیاتی اثرات مرتب کرتی ہے اور اس کے اخلاق و کردار کی موثر تعمیر کرتی ہے۔

ان الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر (العنکبوت)

ترجمہ یقیناً نماز بے حیائی اور برائیوں سے روکتی ہے۔

تقریباً تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیل اخلاق رہا ہے اسلام یہ مقصد بہت حد تک نماز سے حاصل کرتا ہے کیونکہ تمام عبادات میں صرف نماز ہی ایسی عبادت ہے جو نفس کو زیادہ سے زیادہ بیدار رکھ سکتی ہے وہ انسان کو اس کے مقصد حیات کی بار بار یاددہانی کراتی ہے جبکہ دوسری عبادات مثلاً روزہ' حج' زکوٰۃ' اولاً تو ہر مسلمان پر فرض نہیں اس کے علاوہ روزے سال میں ایک ماہ کے فرض کئے گئے ہیں۔ زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے اور حج کی فرضیت تمام عمر میں ایک بار کی ہے۔ اس کے برعکس نماز دن میں پانچ بار ایک مسلمان کو خدا کے حضور لے جاتی ہے۔ دن میں کم از کم پانچ بار انسان کو اس کی حقیقت یاد دلاتی ہے' اسے خدا کی بے پایاں نعمتوں کا احساس کراتی ہے۔ اس میں عاجزی و فروتنی پیدا کرتی ہے نماز کی اسی خصوصیت کی بناء پر قرآن اسے "ذکر" سے تعبیر کرتا ہے' جس کے معنی یاددہانی کے ہیں۔

نماز انسان میں فرض شناسی کی اعلیٰ قدر پیدا کرتی ہے۔ نماز کا وقت ایک مسلمان پر مختلف حالتوں میں آتا ہے۔ فجر کی نماز کے وقت شدید سردیوں میں لحاف یا کمبل سے نکلنا۔ ظہر کے وقت کاروباری مصروفیتوں کو درمیان میں چھوڑنا۔ عصر و مغرب کے وقت اپنی دلچسپ تفریحات کے درمیان وقت نکالنا اور عشاء کے وقت اپنے آرام کو موخر کرنا دراصل ایک طرف مسلمانوں کی فرض شناسی کی دلیل ہے تو دوسری طرف ان میں زبردست ضبط نفس کی خصوصیت کو اجاگر کرتی ہے۔ جبکہ نماز چھوڑ کر آدمی خواہشات نفس کا پیرو بن کر گمراہ ہو جاتا ہے۔

"پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کردیا اور خواہشات نفس کی پیروی اختیار کرلی۔ لہٰذا عنقریب وہ گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔" (مریم۔۵۹)

نماز مسلمانوں کے لئے مصائب میں سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ "ہاں خدا کی یاد ہی سے دل تسکین پاتے ہیں۔" (سورۃ رعد) مصیبتوں کے ہجوم اور تکلیفوں کی شدت میں نماز انتہائی تسکین قلب کا باعث بنتی ہے اور قرآن مسلمانوں میں نماز کے ذریعہ یہ صفت پیدا کرتا ہے کہ وہ مصائب میں نماز سے استقلال حاصل کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو اشاعت اسلام کے سلسلہ میں جس قدر تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ان سب کا "علاج" قرآن نماز اور بندگی رب پر استقامت سے قائم رہنے ہی کو قرار دیتا ہے۔

نماز کے یہ وہ فوائد تھے جو انفرادی طور سے انسانوں پر مرتب ہوتے ہیں "نظام صلوٰۃ" کے دور رس اجتماعی فوائد بھی ہیں۔ جس سے اسلامی معاشرہ برکات و فیوض سے مالا مال ہو سکتا ہے۔

اولاً ــــــــــ مسلمان مردوں کے لئے پانچ وقت نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے۔ شریعت کی رو سے ہر شخص نماز پڑھ کر اپنے فرض سے سبکدوش تو ہو سکتا ہے مگر وہ گنہ گار ہوگا اگر قصداً بلا عذر مسجد میں حاضر ہو کر جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھے مسجد میں مسلمانوں کا پانچ وقت اجتماع مسلمانوں کے نظام اجتماعی کی بنیاد ہے۔ اذان کی آواز سنتے ہی تمام کام چھوڑ کر مسجد کی طرف دوڑ جانا اجتماعی طور پر مسلمانوں کو اطاعت و فرمانبرداری کی تربیت دیتا ہے۔

ثانیاً ــــــــ پھر مسجد میں جمع ہونے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اہل محلّہ کو ایک دوسرے سے ملنے اور ایک دوسرے کی خبر گیری کا موقع مل جاتا ہے۔ آپس کی بے گانگی ختم ہوتی ہے' میل و محبت بڑھتا ہے۔ ایک دوسرے کے مسائل سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ یہ ملاقات مسلمانوں میں کمال درجہ کی محبت و انسیت پیدا کرکے انہیں جتھ بندیوں' فرقہ آرائیوں سے روکنے کا سبب بنتی ہے۔

"خدا سے ڈرتے رہو اور نماز قائم کرو۔ اور مشرکوں میں سے نہ بنو۔ ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی اور بہت سے جتھے ہو گئے۔" (سورۃ روم)

ثالثاً ـــــــــ اسی طرح نماز باجماعت مسلمانوں میں باہمی ہمدردی اور غم خواری کا بھی ذریعہ بنتی ہے۔ جب امیر و غریب سب ایک جگہ جمع ہوں گے اور امراء اپنی آنکھوں سے غرباء کی کسمپرسی دیکھیں گے تو ان کی فیاضی کو تحریک ہوگی ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہوگی اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہوگی۔

عہد رسالت میں اصحاب صفہ کا گروہ جو کہ مسجد نبوی میں رہتا تھا سب سے زیادہ مستحق اعانت تھا چنانچہ اکثر صحابہ کھجور کے خوشے لے جا کر مسجد نبوی میں لٹکا دیتے تھے جس پر یہ گروہ گذر اوقات کرتا تھا۔ اکثر صحابہ اور خود رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہو کر ان لوگوں کو اپنے ساتھ لاتے اور گھروں میں کھانا کھلاتے۔ مساجد اب بھی خیرات و صدقات کا ذریعہ ہیں۔

رابعاً ـــــــــ مسجد میں صف بندی ایک طرف مسلمانوں میں مساوات اور ایک طرح کی معاشرتی جمہوریت (Social Democracy) قائم کرتی ہے تو دوسری طرف بین الاقوامیت کی جڑیں مضبوط کرتی ہے۔ مسجد میں ہر انسان مساوی الحیثیت ہوتا ہے۔ خواہ وہ گورنر ہو یا بازار کا جاروب کش۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ بلکہ ہو سکتا ہے جاروب کش اگلی صف میں کھڑا ہو۔ یوں دن میں پانچ بار معاشرہ کے افراد کی اونچ نیچ برابر کی جاتی ہے اور بڑوں کے دماغوں سے کبریائی کا زعم نکالا جاتا ہے اور کمزوروں اور غریبوں کے ذہنوں سے پستی کا احساس دور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مسجد میں یہ صف بندی طبقاتی امتیازات کو مٹاتی اور مساوات کو جنم دیتی ہے۔

خامساً ـــــــــ نماز میں پڑھی جانے والی دعائیں بھی اجتماعی نوعیت کی ہیں۔ نماز کی دعاؤں میں کہیں صیغہ واحد استعمال نہیں کیا گیا۔ ہر جگہ جمع کا صیغہ استعمال کر کے مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ اسے صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کے لئے فکر مند ہو کر مانگنا چاہئے یہ چیز دماغوں سے انفرادیت کی خو نکال کر اجتماعی ذہنیت پیدا کرتی ہے اور معاشرے کے تمام افراد میں ایک دوسرے کے لئے خیر خواہی کے جذبات اور مخلصانہ محبت کے روابط کو فروغ دیتی ہے۔

سادساً ــــــــــ نماز باجماعت امام کے بغیر نہیں ہو سکتی اگر دو افراد بھی فرض نماز ایک ساتھ پڑھیں تو ان کے لئے بھی لازمی ہے کہ ان میں سے ایک امام بنے اور دوسرا مقتدی۔ جب جماعت کھڑی ہو جائے تو اس سے الگ نماز پڑھنے والے کی نماز نہیں ہوتی۔ جماعت میں امام اور مقتدیوں کے تعلق میں ایک ایک بات انتہائی معنی خیز ہے اس سے دراصل ہر مسلمان کو قیادت (Leadership) اور اتباع قیادت (Followership) کی مکمل تربیت دی جاتی ہے۔ نماز باجماعت کے ذریعہ ایک طرف مسلمانوں کو اطاعت امیر کی تربیت دی جاتی ہے تو دوسری طرف انہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ کیسے شخص کو امیر یا امام بنانا چاہئے۔ کس حد تک اس کی اطاعت کرنی چاہئے؟ اگر وہ غلطی کرے تو کس حد تک اس کی پیروی کرنی چاہئے؟ کہاں پہنچ کر ٹوکنا ضروری ہو جاتا ہے اور کس موقع پر اطاعت امام سے انحراف کیا جاسکتا ہے؟ پھر یہ معاملہ صرف مسجد تک ہی نہیں ہے۔ مسجد کو مملکت اور امام کو سربراہ مملکت پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

امام کے انتخاب کے سلسلہ میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ ایسے شخص کو امام مقرر کریں جو پرہیزگار ہو' نیک سیرت ہو' دین کا علم رکھتا ہو سن رسیدہ ہو اور ایسے شخص کو امام نہیں بنانا چاہئے جس سے جماعت کی اکثریت ناراض ہو۔ تاہم ان صفات میں "علم" کو تقدم حاصل ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "جماعت میں جو سب سے زیادہ صاحب علم ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے"۔[۱۳]

امام کی اطاعت کا سختی سے حکم دیا گیا ہے اس کی حرکت سے پہلے حرکت کرنا سخت ممنوع ہے۔ معمولی غلطی کی صورت میں امام کو ٹوکا جاسکتا ہے۔ اور صریح غلطی' صریح معصیت یا کفر و شرک کی صورت میں اسے درجہ امامت سے ہٹایا جاسکتا ہے بعینہ یہی صورت حال بڑے پیمانے پر قوم اور اس کے سربراہ کے تعلق کا بھی ہے۔ جب تک سربراہ مملکت اسلامی قوانین و نظریات کے تحت کام کرے گا اس کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے۔ فروعی معاملات میں غلطیوں کی صورت میں بھی مسلمانوں کو حکم ہے کہ اس کی اطاعت پر قائم رہیں۔ البتہ اس کی غلطیوں کی نشاندہی ضرور کریں۔

مگر جب امیر اسلامی حدود کو پامال کرے تو پھر مسلمانوں کی جماعت کا امیر نہیں رہ سکتا۔

الغرض مسجد مسلمانوں کے ہر قومی اجتماع کا مرکز اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم ہے۔ نماز باجماعت مسلمانوں کو نظم و ضبط، اطاعت و فرمانبرداری، مساوات و اخوت اور وحدت قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے۔ نماز کے انہی انفرادی و اجتماعی فوائد کو دیکھتے ہوئے بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ نماز مسلمانوں کا قومی شعار اور اسلام کا رکن اعظم ہے۔ جس کے سہارے اسلام کی عمارت قائم ہے۔ جس نے اسے گرادیا اس نے دین اسلام کو ڈھادیا۔

حواشی و حوالہ جات

(۱) دائرۃ المعارف الاسلامیہ جلد ص ۱۷۹ دانشگاہ پنجاب۔ لاہور۔ (بحوالہ لسان العرب)

(۲) حوالہ کے لئے دیکھئے سورۃ مریم آیات ۳۱ اور ۵۵۔ سورۃ ابراہیم۔ ۳۷۔ سورۃ ہود۔ ۸۷۔۔۔ سورۃ انبیاء۔ ۷۳۔۔۔ طہٰ۔ ۱۴۔ یونس۔ ۸۷۔۔۔ آل عمران ۳۹، ۴۳۔۔۔ حج۔ ۴۔۔۔ بقرہ ۴۳ اور ۸۳ کے علاوہ سورۃ لقمان اور سورۃ مائدہ۔

(۳) محمد فواد عبدالباقی، المعجم المفہرس، ۴۲۔ ۴۳۴

(۴) شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ

(۵) ایضاً جلد ۱ ص ۱۴۳

(۶) تفصیل کے لئے دیکھئے سورۃ بنی اسرائیل، خصوصاً آیت ۷۸

(۷) "اقامت صلوٰۃ" کے ایک معنی تو وہ ہیں جو علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی جلد پنجم میں بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اقامت صلوٰۃ کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہیں بلکہ نماز کو اس کے آداب و ارکان و سنن کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں چنانچہ نماز میں اطمینان، ارکان کا اعتدال اور باطنی خضوع و خشوع ضروری ہے۔ جبکہ دوسری طرف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی "اقامت صلوٰۃ" سے مراد نماز باجماعت کو قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک یہ ایک جامع اصطلاح ہے اس کے صرف یہی معنی نہیں ہیں کہ آدمی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی طور پر باقاعدہ نماز کا نظام قائم کیا جائے۔ اگر

کسی بستی میں ایک شخص انفرادی طور پر نماز کا پابند ہو لیکن جماعت کے ساتھ اس فرض کو ادا کرنے کا انتظام نہ ہو تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں نماز قائم کی جارہی ہے۔ (دیکھئے تفہیم القرآن جلد اول صہ ۵۱۔ ۵۰)

(۸) امام بخاری "صحیح بخاری" جلد اول صہ ۳۶۳

(۹) نعمانی، مولانا محمد منظور، "معارف الحدیث" جلد سوئم صہ ۳۳ پر یہ حدیث مسند احمد، مسند دارمی اور شعب الایمان بیہقی کے حوالہ سے درج ہے۔

(۱۰) قرآن مجید میں سورۃ روم کے چوتھے رکوع میں ارشاد ہوتا ہے "واقیموا الصلواۃ ولا تکونو من المشرکین" یعنی نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہوجاؤ۔ گویا قرآن و سنت کے حوالے سے ترک نماز شرک اور کفر ہے۔ اس ضمن میں آئمہ کے دو مکاتب فکر ہیں امام احمد ابن حنبل کا خیال ہے کہ نماز چھوڑ دینے سے آدمی قطعاً کافر اور مرتد ہوجاتا ہے۔ چنانچہ نہ تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے کی اجازت دی جائے گی۔ جبکہ دوسرے اکثر ائمہ کی رائے یہ ہے کہ ترک نماز اگرچہ ایک کافرانہ عمل ہے جس کے عوض وہ دنیا اور آخرت میں سخت ترین سزاؤں کا مستحق ہے لیکن اس سے اس پر مرتد کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔ ان حضرات کے نزدیک ترک نماز کو شرک یا کفر کہنے کا مطلب کافرانہ عمل ہے اور گناہ کی انتہائی شدت ظاہر کرنے کے لئے یہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے جس طرح کسی مضر غذا یا دوا کے لئے کہہ دیا جاتا ہے کہ بالکل زہر ہے۔

(۱۱) بخاری جلد اول ص ۱۷۔ ۳۷۰ کتاب الجمعہ

(۱۲) ایضاً ص ۱۰۵ کتاب الایمان

(۱۳) سورۃ الحجر ۹۹۔ ۹۸

(۱۴) ندوی۔ سلیمان۔ سیرۃ النبی جلد پنجم ص ۳۹

باب شانز دہم

زکوۃ

زکوۃ اسلام کے اراکین خمسہ میں سے ایک اہم رکن ہے۔ اس کا مادہ ز ک و ہے۔ اس کے لغوی معنی بڑھنے' پھلنے پھولنے اور نمو پانے کے ہیں۔ زکوۃ کے دوسرے لغوی معنی طہارت و برکات کے بھی ہیں۔ شریعت میں اس سے مراد شرائط مخصوصہ کے ساتھ مال کے اس حصے کو جو حق الٰہی کے طور پر (لازما) نکال کر مستحقین کو دیا جاتا ہے' زکوۃ کہتے ہیں۔ اور زکوۃ اس لئے کہتے ہیں کہ کیونکہ اس سے مال میں نمو اور برکت کی امید ہوتی ہے۔

زکوۃ کو ٹیکس نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ اپنی روح کے اعتبار سے عبادت ہے ایک ایسی افضل عبادت جس کا درجہ ایک اعتبار سے نماز کے برابر ہی ہے۔ قرآن پاک میں زکوۃ کے بارے میں بتیس آیات میں تاکید آئی ہے جن میں سے چھبیس مقامات پر نماز اور زکوۃ کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے علماء اسے نماز کی ہم پلہ عبادت قرار دیتے ہیں۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ احکام دین کی اصولی تقسیم دو ہی طرح سے کی جا سکتی ہے ایک وہ احکام جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور دوسرے وہ احکام جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ نماز حقوق اللہ اور زکواۃ حقوق العباد کے تقاضوں کو پورا کرنے والی عبادات ہیں اس اعتبار سے دونوں ہم پلہ ہیں۔

زکوۃ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ نماز کے ساتھ ساتھ زکوۃ بھی تمام الہامی شریعتوں کا خاص رکن رہی ہے جیسا کہ قرآن مجید کا دعویٰ ہے یہ

اور بات ہے کہ مختلف شریعتوں کے لئے اس کے تفصیلی احکامات میں فرق رہا ہے۔

نماز اور دیگر فرائض کی طرح زکوۃ کے احکامات بھی تدریجی طور پر نافذ کئے گئے مکی زندگی میں پہلے صدقات (انفاق فی سبیل اللہ) کی طرف رغبت دلائی گئی تاہم فرضیت کا حکم نہیں تھا پھر مدینہ منورہ میں آکر جب مسلمانوں کے معاشی مسائل کسی حد تک حل ہوئے تو ۲ھ میں صدقۃ الفطر واجب ہوا۔ یعنی یہ کہ سال میں ایک دن عید کی نماز سے قبل ہر مسلمان سیر' سوا سیر غلہ راہ خدا میں خیرات کرے تاکہ غریب کے لئے بھی عید کی خوشیوں کا سامان ہو سکے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی۔

"وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ اے پیغمبر کہدو! جو کچھ تمہاری ضرورت سے بچ رہے" (بقرہ۔ ۲۷)

یہ سب زکوۃ کی فرضیت کی راہ میں اسلام کی تدریجی مراحل تھے۔ اور اس طرح سے اسلام اپنے ماننے والوں کے دلوں سے مال کی محبت کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے بعد سن ۸ ھ میں (فتح مکہ کے بعد) "زکوۃ" مسلمانوں پر فرض قرار دی گئی۔ اس کے اگلے سال ۹ ھ میں زکوۃ کے بیشتر احکام و قوانین مرتب ہوئے۔ اس کی وصولی کے لئے تمام عرب میں عمال کا تقرر ہوا۔

زکوۃ نقدی' سونے چاندی' پیداوار اور جانوروں پر سال میں ایک بار وصول کی جاتی ہے۔ وہ کم سے کم معیار دولت جس پر زکوۃ نہیں' حسب ذیل ہے۔

نام	اس تعداد سے کم پر زکوۃ نہیں
غلہ اور پھل	پانچ وسق سے کم پر زکوۃ نہیں
	(ایک وسق وہ بوجھ ہے جس کو عادۃ ایک اونٹ اٹھا سکتا ہے)
اونٹ	پانچ عدد سے کم پر زکوۃ نہیں
گائے' بیل' بھینس	تیس عدد سے کم پر زکوۃ نہیں
بھیڑ بکری	چالیس عدد سے کم پر زکوۃ نہیں
سونا	بیس مثقال

(موجودہ حساب سے سات تولہ سونا اور ۵۶ تولہ چاندی)

چاندی ۵۲ تولہ سے کم پر زکوۃ نہیں

اس خاکہ میں بیان کئے گئے اعداد و شمار سے زیادہ کی دولت کو اسلام سرمایہ سمجھتا ہے اور ایک سال اس حالت پر گذر جانے کی صورت میں اس سرمایہ کے مالک سے اس کی دولت کا مخصوص حصہ زکوۃ کے نام سے وصول کرکے بیت المال میں جمع کراتا ہے جو اسی معاشرے کے ضرورت مند افراد میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

اسلامی حکومت میں زکوۃ انفرادی طور پر صرف نہیں کی جاسکتی بلکہ اس کا بیت المال میں داخل کرانا ضروری ہے دراصل زکوۃ مسلمانوں کے اجتماعی نظام کا ایک خاص اور اہم مالی جزو ہے اسی لئے اس کے وصول کرنے اور خرچ کرنے کا حقیقی اور اصولی طریقہ حکومت کے نظم و انتظام کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے عمال کے ذریعہ سے زکوۃ وصول کرے' بیت المال میں داخل کرے اور صحیح مصارف میں خرچ کرے۔

حضرت عبداللہ بن عمر کا فرمان ہے کہ زکوۃ امراء کو دو ایک شخص نے کہا کہ امراء و خلفاء تو اس کو صحیح مصرف میں صرف نہیں کرتے۔ آپ نے جواب دیا۔ اس کے بعد پھر بھی انہی کو ادا کرو۔ حضرت عبداللہ ابن عمر نے فرمایا جب تک خلفاء نماز ادا کرتے رہیں تم انہی کو زکوۃ ادا کرتے رہو۔ ابو صالح کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سعد بن ابی وقاص' ابوہریرہ' ابو سعید خدری' عبداللہ بن عمر سے پوچھا کہ یہ حاکم جو بدعنوانیاں کررہے ہیں آپ کے پیش نظر ہیں' کیا اس حالت میں بھی ہم انہی کو زکوۃ ادا کریں؟ سب نے متفقہ آواز سے کہا کہ ضرور ان ہی کو ادا کرو (اس لئے کہ اجتماعی زندگی کے لئے یہی ضروری ہے۔

قرآن مجید میں سورہ توبہ میں زکوۃ کے مصارف واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں۔

یہ صدقات تو اصل فقیروں' مسکینوں کے لئے ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لئے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو نیز یہ گردنوں کو چھڑانے اور قرضہ داروں کی مدد کرنے میں اور راہ خدا میں اور مسافر

نوازی میں استعمال کرنے کے لئے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔" (سورہ توبہ۔۶۰)

اس کی تفصیل یہ ہے

۱ ۔ فقراء کے زمرہ میں ہر وہ شخص آجاتا ہے جو اپنی معیشت کے لئے دوسرے کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ لفظ تمام حاجت مندوں کے لئے عام ہے خواہ وہ جسمانی نقص یا بڑھاپے کی وجہ سے مستقل طور پر محتاج اعانت ہو گئے ہوں یا کسی عارضی سبب سے سردست مدد کے محتاج ہوں۔

۲ ۔ مسکنت کے لفظ[۶] میں عاجزی، درماندگی، بے چارگی اور ذلت کے مفہومات شامل ہیں۔ اس اعتبار سے مساکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہوں۔ حدیث میں اس کی تشریح یوں آئی ہے۔ مسکین وہ ہے جو اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا اور نہ پہچانا جاتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے مانگتا ہے[۷]"۔ گویا وہ ایک ایسا شریف آدمی ہے جو غریب ہو۔

۳ ۔ چونکہ زکوۃ کی تحصیل و تقسیم اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے لہٰذا وہ لوگ جو زکوۃ و صدقات وصول کرنے انہیں تقسیم کرنے اور ان کا حساب کتاب رکھنے کے لئے حکومت کی طرف سے مقرر کئے جائیں۔ ایسے لوگ خواہ فقراء مساکین کے زمرے میں نہ آتے ہوں ان کی تنخواہیں اس مد سے دی جا سکتی ہیں[۸]۔

۴ ۔ تالیف قلب کے معنی ہیں دل موہنا۔ اس حکم سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سرگرم ہوں اور مال دے کر ان کے جوش عداوت کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہو، جو لوگ کفار کے کیمپ میں ایسے ہوں کہ اگر مال سے انہیں توڑا جائے تو مسلمانوں کے لئے مددگار بن سکتے ہوں۔ یا جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہوں اور ان کی سابقہ عداوت یا ان کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے اندیشہ ہو کہ اگر مال سے ان کی استمالت نہ کی گئی تو پھر کفر کی طرف پلٹ جائیں گے ایسے لوگوں کو مستقل وظائف یا وقتی عطیے دے کر اسلام کا حامی و مددگار یا مطیع و فرماں بردار یا کم از کم بے ضرر دشمن بنا لیا جائے[۹]۔

اس امر میں فقہا کے مابین اختلاف ہے کہ رسول اللہ کے بعد بھی یہ مد باقی ہے یا ساقط ہو گئی۔ اس ضمن میں حضرت امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا خیال یہ ہے کہ اسلام کے طاقت والے زمانے سے یعنی حضرات ابوبکرو عمر کے زمانے سے یہ مد ساقط ہو گئی۔ کیونکہ اسلام کی کمزوری کا زمانہ گذر گیا۔ جب کہ بعض دوسرے فقہا کے نزدیک مولفتہ القلوب کا حصہ اب بھی باقی ہے اگر اس کی ضرورت ہو۔ یہی دوسری رائے زیادہ حقیقت پسندانہ اور قابل قبول ہے۔

۵ - غلاموں کو ان کے طوق غلامی سے نجات دلانے کے لئے زکوۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے بالفاظ دیگر "مکاتبت" کی رقم مہیا کرنے میں غلام کی مدد زکوۃ کی رقم سے کی جاسکتی ہے۔

۶ - زکوۃ کی رقم ایسے قرضداروں پر بھی خرچ کی جاسکتی ہے جو اگر اپنے مال سے اپنا پورا قرض چکادیں تو ان کے پاس قدر نصاب سے کم مال بچتا ہو البتہ جو شخص بد اعمالیوں' فضول خرچیوں اور عیاشیوں میں اپنا مال اڑا کر اپنے آپ کو قرضدار بنا لے اس کی زکوۃ کی مد سے اس وقت تک مدد نہیں کی جانی چاہئے جب تک کہ وہ تائب ہو جائے۔

۷ - "فی سبیل اللہ" ایک وسیع اصطلاح ہے۔ محدود معنوں میں اس سے مراد قتال اور وسیع معنوں میں جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ دراصل قتال سے وسیع تر چیز کا نام ہے اور اس کا اطلاق ان تمام کوششوں پر ہوتا ہے جس سے مقصود نظام کفر کو مٹانا اور اس کی جگہ نظام اسلامی کو قائم کرنا ہو اس ضمن کی تمام کوششوں پر زکوۃ کی مد سے خرچ کیا جاسکتا ہے خواہ وہ دعوت و تبلیغ کے ابتدائی مرحلہ میں ہو خواہ قتال کے آخری مرحلے میں۔

۸ - وہ مسافر جنہیں دوران سفر مدد کی ضرورت ہو تو اس کی مالی اعانت زکوۃ سے کی جاسکتی ہے خواہ وہ مسافر اپنے گھر میں غنی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر حالت سفر میں وہ مدد کا محتاج ہو جائے تو اسلامی حکومت کو اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے مسافرت میں اس کی مدد کرنی چاہئے۔

زکوۃ کا یہ ہمہ گیر نظام نافذ کرنے سے دراصل اسلام کچھ مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے وہ مقاصد شاہ ولی اللہ کے نزدیک دو ہیں۔

۱ - تزکیہ نفس (انفرادی تہذیب نفس)

۲ - مدنی و اجتماعی حاجات کا انسداد (اجتماعی اقتصادی فلاح و بہبود)

جہاں تک انفرادی تہذیب نفس کا تعلق ہے تو زکوۃ کے معنی بھی یہی ہیں جیسا کہ ابتداء میں بتایا گیا زکوۃ کے لفظی معنی "پاکی" اور "صفائی" کے ہیں جس کے ایک معنی یہ ہیں کہ زکوۃ نکالنے سے باقی مال پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ انسانی نفس کو پاکی نصیب ہوتی ہے اور اس کا تزکیہ ہوتا ہے۔ دل کی یہی پاکی روح کی یہی صفائی نفس کی یہی طہارت مذہبوں کی اصل غایت اور نبوتوں کا اصل مقصد ہے۔

انسانوں کی بہت سی روحانی اور نفسانی بیماریوں کی وجہ حب مال ہے۔ مال کی محبت' بخل' خود غرضی' عداوتوں' نفرتوں اور بداخلاقیوں کو جنم دیتی ہے۔ اکثر لڑائی جھگڑے بخل اور حرص پر ہی مبنی ہوتے ہیں ان بداخلاقیوں کے انسداد کا بہترین علاج "انفاق" و "سخاوت" میں ہے جس سے بخل کا خاتمہ ہوتا ہے۔ خود غرضی کی جگہ الفت و محبت جنم لیتی ہے اور انسان حسن معاملات کی طرف مائل ہوتا ہے اور اسی کا نام تہذیب نفس ہے۔ قرآن کہتا ہے۔

وسیجنبھا الاتقی الذی یوتی مالہ یتزکی

ترجمہ : اس شخص کو جہنم سے دور رکھا جائے گا جو خدا سے ڈرنے والا ہو اور جو اپنے تزکیہ کی خاطر دولت دوسروں کو دیتا ہو۔ (اللیل۔ ۱۸۔۱۷)

گویا صدقہ اور زکوۃ کی اصل غایت دل کی پاکیزگی اور نفس کا تزکیہ ہے لیکن یہ بنیادی مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک زکوۃ نکالتے ہوئے ان بنیادی باتوں کا بھی خیال نہ رکھا جائے جو مختلف مقامات پر قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور جن کا ضروری خلاصہ [11] یہ ہے۔

۱ - سب سے اہم اور بنیادی تو یہ ہے کہ زکوۃ دیتے وقت صرف رضائے الٰہی کی طلب ہی اس کا محرک ہو۔

ماتنفقون الا ابتغاء وجه اللہ (بقرہ ۔ ۲۷۲)

ترجمہ : تم اپنی دولت صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خرچ کرتے ہو۔

۲ ۔ دوسری بات یہ کہ جو زکوٰۃ دی جائے وہ خود پاک کمائی سے ہو اور اس میں حرام کا شائبہ تک نہ ہو۔

یا ایھا الذین امنوا انفقوا من طیبت ما کسبتم (البقرہ ۔ ۲۶۷)

ترجمہ : اے ایمان والو! اپنی پاک کمائی میں سے خرچ کرو۔

اسی بات کو رسول اللہ نے یوں فرمایا "لوگو! اللہ پاک ہے اور وہ صرف پاک مال ہی کا صدقہ قبول فرماتا ہے"۔ (مسلم کتاب الزکواۃ)

۳ ۔ تیسری بات یہ ہے کہ زکوٰۃ میں جو چیز دی جائے وہ عمدہ قسم کی ہو۔ ردی اور خراب چیزوں کو اس مقصد کے لئے نہ نکالا جائے۔

ولا تیمموا الخبیث منہ تنفقون (البقرہ ۲۶۷)

ترجمہ : اور خراب مال کو نہ ڈھونڈو اسی میں سے خرچ کرنے کے لئے۔

۴ ۔ چوتھی بات یہ کہ زکوٰۃ لینے والے پر کوئی احسان نہ رکھا جائے۔ نہ اس کی دل آزاری کی جائے اور نہ اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی جائے۔

یا ایھا الذین امنوا لا تبطلوا صدقتکم بالمن والاذی کالذی ینفق مالہ رئا الناس (البقرہ ۲۶۴)

ترجمہ : اے ایمان والو! اپنے صدقے احسان جتلا کر اور دل آزاریاں کر کے ضائع نہ کر دیا کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے۔

مسلم کی حدیث ہے کہ قیامت کے دن تین آدمی جہنم میں سب سے پہلے جائیں گے۔ ان میں سے ایک وہ ہوگا جس نے دنیا میں اس لئے بہت خیر خیرات کی ہوگی کہ لوگ اسے بڑا داتا اور غریب نواز کہیں۔

یہ ہیں وہ خاص خاص ہدائتیں جن پر عمل کرنے کے بعد ہی زکوٰۃ دل کی پاکیزگی اور تزکئے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ان ہدایات کو دیکھ کر ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ زکوٰۃ دیتے وقت نفس کے شدید احتساب کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی عبادت

ہے جو نفس کی بے شمار آفتوں سے گھری ہوئی ہے۔ مال کی محبت انسان کو خدا اور آخرت سے بے گانہ بنا کر رکھ دیتی ہے جیسا کہ رسول اللہ کے فرمان سے ظاہر ہے "دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے"۔ (مشکوٰۃ) دنیا کی محبت کئی شکلوں میں آسکتی ہے لیکن اس کی سب سے معروف اور خطرناک شکل دولت کی محبت ہے رسول اللہ کا ایک اور فرمان ہے "میری امت کا سب سے بڑا فتنہ مال ہے"۔ (ترمذی)۔

دوسری طرف زکوٰۃ مدنی واجتماعی حاجات کے انسداد کا بہترین علاج ہے۔ زکوٰۃ کا یہ ایک خالص اجتماعی و معاشی پہلو ہے کہ معاشرے کے نادار افراد کی ضروریات پوری کی جاتی رہے تاکہ کم از کم ان کی انتہائی اہم اور بنیادی ضروریارت پوری ہوتی رہیں اور وہ امراء کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ذلت و خواری سے بچ سکیں اور حکومت برے حالات میں ان کی پوری کفالت کر سکے۔ اسلامی حکومت اپنی یہ ذمہ داری بہ طریق احسن اسی وقت پوری کر سکتی ہے جب منجملہ دیگر ذرائع آمدنی کے حکومت کی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ اہل ثروت سے زکوٰۃ کی شکل میں وصول ہو۔

معاشرے کے متمول افراد پر زکوٰۃ فرض ہی اس لئے کی گئی ہے کہ یہ معاشرے کے نادار اور ضرورت مندوں کا اصل "حق" ہے۔

والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم (المعارج۔ ۲۴، ۲۵)

جن کے مالوں میں سائلوں اور تہی دستوں کا مقررہ حق ہوتا ہے۔

اور انہیں ان کا یہ حق دلانے کے لئے اسلامی حکومت قتال بھی کر سکتی ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیا تھا۔ ایسا اس لئے ضروری ہے کیونکہ زکواۃ دراصل معاشی فلاح کی ایک ہمہ گیر اسکیم ہے جس کے ذریعہ ملک و ملت کے غریب اور نادار افراد کی مدد کی جاتی ہے۔ انہیں زندگی کی جدوجہد میں برابر کا شریک بنایا جاتا ہے اور مذموم سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ سورۃ توبہ میں ارشاد ربانی ہے۔

"اے ایمان والو۔ اہل کتاب کے بہت سے عالم اور درویش لوگوں کے مال ناحق کھاتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونے چاندی کو خزانہ بناتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو ان کو خوش خبری سنا دو دردناک عذاب کی"۔

(توبہ)

ایسے سرمایہ دار جو دولت کو سمیٹ سمیٹ کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں قرآن میں کئی جگہ دردناک آخری عذاب کی بشارت دی گئی ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ دولت سمٹنے کے بجائے گردش میں رہے جو کہ صحت مند معاشی نظام کے لئے اشد ضروری ہے اور زکواۃ سے اس مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کے خط کے جواب میں اپنے نامۂ مبارک میں لکھا تھا۔

تو خذ اغنیاء ھم فترد الی فقرائھم زکوۃ ان کے مالداروں سے وصول کرو اور ان کے محتاجوں میں تقسیم کردو۔

اس طرح زکوۃ کے ذریعہ اسلام سرمایہ داری کو ختم اور سرمایہ کاری کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ آج جو ممالک معاشی پسماندگی کا شکار ہیں اس کی اصل وجہ دولت کی غلط تقسیم' سرمایہ داری اور صحیح سرمایہ کاری کا فقدان ہے۔ زکوۃ کے ذریعہ دولت خود بخود سرمایہ کاری کی طرف منتقل ہوتی ہے جو معاشی ترقی کے حصول کا اہم ذریعہ ہے۔

ان پہلوؤں سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام زکوۃ کا ایک باقاعدہ نظام قائم کرنا چاہتا ہے یہ ایک ایسی انفرادی عبادت ہے جس کے ہمہ جہت اجتماعی فوائد و اثرات ہیں اس عبادت کو بجا نہ لانے والا خود کو قطعی طور پر مسلمان نہیں کہہ سکتا بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے خلاف قتال کے سلسلہ میں صحابہ کا اجماع موجود ہے۔ اسلام نے اس عبادت کو اتنی اہمیت دی ہی اس لئے ہے کیونکہ یہ بندوں کا حق ہے جو ہر قیمت پر انہیں ملنا چاہئے۔

قرآن مجید نے جب مسلمانوں کو کفار مکہ سے جنگ کرنے کا آخری[صـ۱۲] حکم دیا تو فرمایا کہ اب تمہاری تلواریں اس وقت تک نیام میں نہ جائیں جب تک کہ ان دشمنان حق کا قصہ پاک نہ ہو جائے یا پھر یہ کہ وہ اس دین کو قبول نہ کرلیں جسے انہیں سمجھانے میں بیس بائیس سال کی مدت صرف ہو چکی ہے اور اب حجت پوری ہو جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بتانے کے لئے کہ ان کا اسلام لے آنا کب معتبر مانا

جائے گا اور اس بناء پر ان کے خلاف جنگی کاروائیاں کب ختم کر دی جائیں گی اس نے فرمایا :

فان تابوا واقاموا الصلواۃ واتوا الزکوۃ فخلوا سبیلھم (توبہ۔۵)

ترجمہ : پس اگر یہ لوگ کفر سے توبہ کرلیں اور نماز قائم کرنے لگیں اور زکوۃ دینے لگیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔

آگے چل کر فرمایا :

فان تابوا واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فاخوانکم فی الدین (توبہ۔۱۱)

ترجمہ : سو اگر یہ لوگ توبہ کرلیں، نماز قائم کرنے لگیں اور زکوۃ دینے لگیں تو اب وہ تمہاری دینی بھائی ہوں گے۔

گویا کسی مسلم قرار پانا کلمہ شہادت کے بعد بھی دو باتوں پر موقوف ہے ایک یہ کہ وہ نماز قائم کرے دوسرے یہ کہ زکوۃ ادا کرے یہ ایمان کی ایسی ضروری اور لازمی شرط ہے کہ اس سے کوئی مفر نہیں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں (اہل عرب) سے جنگ کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ اللہی کے معبود ہونے اور محمد کے رسول خدا ہونے کی گواہی دے دیں نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں۔ جب وہ ایسا کرلیں گے تو اسی وقت مجھ سے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو محفوظ پا سکیں گے اور اس کے بعد ان کا حساب لینا اللہ کا کام ہے۔ (مسلم۔ کتاب الایمان)

کتاب و سنت کے یہ دونوں بیانات دین اسلام میں زکوۃ کا ٹھیک ٹھیک مقام متعین کر دینے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ ان کی روشنی میں صاف نظر آجاتا ہے کہ زکوۃ کے بغیر دین کی عمارت کسی طرح قائم نہیں رہ سکتی اسی وجہ سے اسے اسلام کا ایک ستون قرار دیا گیا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱ ۔ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب اپنی کتاب "معارف الحدیث" جلد ۴ ص ۱۹ پر لکھتے ہیں کہ "قرآن

مجید میں ستر سے زائد مقامات پر اقامت صلوٰۃ اور اداء زکوٰۃ کا ذکر اس طرح ساتھ ساتھ کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں ان دونوں کا مقام اور درجہ قریب قریب ایک ہی ہے"۔

اس بیان میں تعداد کی بات درست نہیں جیسا کہ لکھا گیا قرآن مجید میں بتیس آیات میں زکوٰۃ کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں سے چھبیس آیات میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔

تفصیل کے لئے دیکھئے معجم المفہرس ص ۳۳۱-۲

اسی طرح سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی جلد ۵ ص۲۰۶ میں ۲۰ مقامات کا تذکرہ کیا ہے جب نماز زکوٰۃ کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔وہ بھی درست نہیں۔

۲ - تفصیل کے لئے دیکھئے سورہ بقرہ۔ آیت ۴۳ ۔ سورہ مائدہ۔ آیت ۱۲ ---- سورہ مریم آیات ۵۵ ، ۳۱

۳ - ندوی، سید سلیمان، سیرۃ النبی، جلد ۵ ص۱۵۷

۴ - سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، اسلام کا اقتصادی نظام، ص۳۰۹ ادارہ اسلامیات، لاہور ۱۹۸۴ء (بحوالہ ابوداؤد)

۵ - ایضاً

۶ - مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم قرآن، جلد ۲ ص۲۰۵ ادارہ ترجمان القرآن۔ لاہور ۱۹۸۴ء

۷ - مودودی صاحب نے اس حدیث کا ماخذ بیان نہیں کیا ہے البتہ سیرۃ النبی، جلد ۵ ص۱۶۴ پر سید سلیمان ندوی نے صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ کے حوالے سے اس سے ملتی جلتی ایک حدیث نقل کی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مسکین وہ نہیں ہے جس کو ایک دو لقمے دربدر پھرایا کرتے ہیں"۔ صحابہ نے دریافت کیا پھر کون مسکین ہے؟ ارشاد ہوا "وہ جس کو حاجت ہے لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا اور وہ کسی سے مانگتا نہیں"۔

۸ - تاہم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کی تقسیم کا کام بلامعاوضہ کیا اور دوسرے بنی ہاشم کے لئے بھی یہی قاعدہ مقرر کردیا کہ وہ اس خدمت کو بلامعاوضہ انجام دیں۔

۹ - تفہیم القرآن جلد ۲ ص۲۰۶

۱۰ - شاہ ولی اللہ "حجۃ اللہ البالغہ" جلد ۲ ص۹۳

۱۱ - اصلاحی، صدرالدین "اسلام ایک نظر میں" ص۱۰۴ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹیڈ۔ لاہور۔ ۱۹۷۵ء

۱۲ - ایضاً ص۹۸

باب ہفدہم

روزہ

عربی زبان میں "صوم" کے لغوی معنی کسی چیز سے رک جانے یا اسے چھوڑ دینے کے ہیں۔ اس کی مترادف لفظ اردو میں "روزہ" مستعمل ہے۔ اصطلاح شرعیت میں "صوم" کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جو احکام شرعیت کا مکلف ہو طلوع فجر سے غروب آفتاب تک روزے کی نیت کرے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ارادتاً کھانے پینے اور صنفی تعلقات کے علاوہ ہر قسم کی لغویات اور غیر اخلاقی حرکات سے مجتنب رہے۔

روزہ ایک اہم اسلامی عبادت ہے جو صرف امت محمدیہ پر ہی فرض نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے کی امتوں پر بھی روزہ فرض رہا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں کہا گیا۔

یاایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون
(البقرہ)

ترجمہ : اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جس طرح تم سے پہلی امتوں پر بھی فرض کئے گئے تھے' تاکہ تمہارے اندر تقویٰ اور پرہیزگاری پیدا ہو۔

دیگر اقوام کی مذہبی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مذاہب میں بھی روزہ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ ہندومت میں برہمنوں کو ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ تاریخوں کو اکادشی کا روزہ (برت) رکھنا ہوتا ہے۔ ہندوستان کے تمام معلوم مذاہب میں روزے کی سب سے زیادہ سخت شرائط جین مت میں ہیں۔ ان کے یہاں

چالیس، چالیس دن تک کا ایک روزہ ہوتا ہے۔ گجرات و دکن میں ہر سال جینی کئی کئی ہفتے کا روزہ رکھتے ہیں۔ قدیم مصریوں کے یہاں بھی روزہ مذہبی دستور تھا۔ پارسیوں میں گو عام پیرووں کے لئے روزہ فرض نہیں تھا لیکن ان کے مذہبی پیشواؤں کے لئے پنجسالہ روزہ ضروری تھا۔ یہودیت اور عیسائیت ہر دو مذاہب میں روزوں کی تاکید تھی اور ان کے صحیفوں میں روزوں کے احکام بتصریح مذکور ہیں۔ اہل عرب بھی جاہلیت کے دنوں میں عاشورہ، یعنی دسویں محرم کا روزہ رکھتے تھے۔ اس دن خانہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا۔ لہٰذا روزہ امت محمدیہ کے لئے کوئی نئی اور اجنبی عبادت نہیں تھی بلکہ ہر مذہب نے بلند تر اخلاقی مقاصد حاصل کرنے کے لئے اور نفوس کو مطیع بنانے کے لئے یہ مشقیں اپنے پیروکاروں سے کرائی ہیں۔

اسلام میں روزے ماہ شعبان ۲ھ میں مدینہ منورہ میں فرض ہوئے اور اس کے لئے رمضان کا مہینہ مختص کیا گیا اس وقت تک اسلام کو اپنا پیغام پھیلاتے ہوئے کامل پندرہ سال ہو چکے تھے اس تاخیر کی وجہ علامہ ابن قیم کے نزدیک یہ ہے کہ مرغوبات شہوانیہ کا ترک کرنا بہت دشوار کام تھا اس لئے روزہ وسط اسلام میں فرض کیا گیا جب کہ لوگ توحید، نماز اور احکام قرآنی کے خوگر ہو چکے تھے۔

اسلام کے دیگر احکامات کی طرح روزے کی فرضیت بھی بتدریج عائد کی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ابتداء میں مسلمانوں کو ہر مہینے صرف تین روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ مگر روزے فرض نہیں تھے، پھر ۲ھ میں جب روزے پورے ماہ رمضان کے فرض ہوئے تو اس میں رعائت کا یہ پہلو رکھا گیا کہ جو لوگ روزہ برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں وہ ہر روزے کے بدلے مسکین کو کھانا کھلائیں بعد میں یہ عام رعائت منسوخ کر دی گئی اور تمام مردوں اور عورتوں کو روزوں کا پابند کیا گیا ماسوائے مریض، مسافر حاملہ یا دودھ پلانے والی عورتیں اور ایسے کمزور بوڑھے جن میں روزے کی طاقت نہ ہو تاہم ان کے لئے بھی یہ حکم ہے کہ جب عذر باقی نہ رہے تو قضا کے اتنے روزے رکھ لیں جتنے رمضان میں ان سے چھٹ گئے ہوں۔

روزے کی حقیقت :-

قرآن مجید میں سورہ بقرہ میں روزوں سے متعلق تفصیلی احکامات آئے ہیں جن سے ایک طرف تو روزے کا قانون اخذ کیا جاسکتا ہے تو دوسری طرف اس کے اہم مقاصد سامنے آتے ہیں۔

روزے کا قانون یہ ہے کہ آخر شب' طلوع سحر کی ابتدائی علامات ظاہر ہوتے ہی مکلف پر یکایک کھانا پینا اور جنسی تعلقات قائم کرنا حرام ہوجاتا ہے یہ حرمت غروب آفتاب تک قائم رہتی ہے اس کے بعد جو اعمال لحہ بھر پہلے تک حرام تھے وہ حلال ہوجاتے ہیں تا آنکہ دوسرے روزے کی مقررہ ساعت آجاتی ہے۔ ماہ رمضان کی پہلی تاریخ سے انتیس یا تیس تاریخ تک اس عمل کی مسلسل تکرار ہوتی ہے۔

قانونی اعتبار سے اگرچہ روزے میں انسانوں پر صرف دو فطری خواہشات (غذا اور صنفی خواہش) پر پابندی لگائی گئی ہے لیکن اس کی اصل روح یہ ہے کہ انسان پر بندگی کا احساس اس شدت سے طاری رہے کہ وہ تمام لغویات اور غیر اخلاقی اعمال سے پرہیز کرے۔ رسول اللہ کا فرمان ہے کہ : "جس نے جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا ترک نہ کیا تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔" (صحیح بخاری۔ کتاب الصوم) ۔۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ : "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کے ہر عمل کا بدلہ ہے مگر روزہ خاص میرے لئے ہے لہٰذا میں ہی اس کا اجر دوں گا۔ اور روزہ ڈھال ہے۔ جب تم میں سے کوئی روزہ سے ہو تو شور نہ مچائے اور نہ فحش باتیں کرے۔ اگر کوئی اس سے جھگڑا کرے یا گالی گلوچ کرے تو کہہ دے کہ میں روزہ دار آدمی ہوں" (بخاری۔ کتاب الصوم)

بعض حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا : "روزہ اس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس میں سوراخ نہ کردو" صحابہ نے عرض کیا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سوراخ کس چیز سے ہوجاتا ہے؟ فرمایا جھوٹ اور غیبت سے۔" چنانچہ بعض علماء کی رائے میں جس طرح کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔[۵]

روزے کی درستگی کے لئے ضروری ہے کہ روزہ ایمان و احتساب کے مکمل جذبے کے ساتھ رکھا جائے ورنہ سوائے فاقہ کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ باالفاظ دیگر صرف جسم کا روزہ ہوگا روح کا نہیں۔ امام غزالیؒ[۶] روزے کے تین درجے بیان کرتے ہیں۔

(۱) ایک عوام کا روزہ ہے وہ یہ کہ پیٹ اور شرمگاہ کو ان کی خواہش ادا کرنے سے روکا جائے یہ روزے کا ادنیٰ درجہ ہے۔

(۲) دوسرے درجہ میں خواص کا روزہ ہے وہ یہ کہ پیٹ اور شرمگاہ کے ساتھ ساتھ تمام اعضائے جسمانی کو مثلاً آنکھ، کان، زبان، ہاتھ پاؤں وغیرہ کو بھی گناہ سے روکا جائے۔

(۳) اخص الخواص کا روزہ یہ ہے اول الذکر دونوں مطالبات کے ساتھ ساتھ دل کو بری خواہشات اور دنیاوی فکروں تک سے دور رکھا جائے اور سوائے خدا تعالیٰ کے دیگر چیزوں کے بارے میں فکر کرنے سے اس کو مطلقاً روک دیا جائے۔ اس قسم کا روزہ خالصتاً دنیاوی چیزوں کے بارے میں فکر کرنے بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض علماء کے نزدیک دن میں افطاری کی فکر کرنے سے بھی یہ روزہ ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ رزق کے بارے میں جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اس شخص کو اس کا یقین نہیں۔ روزے کا یہ تیسرا اور اعلیٰ درجہ انبیاء اور صدیقوں کا ہے۔

سورہ بقرہ کی آیات ۱۸۳ تا ۱۸۵ سے روزے کے تین مقاصد سامنے آتے ہیں۔

پہلا مقصد یہ کہ بندوں میں تقویٰ پیدا ہو۔ **(لعلکم تتقون)** دوسرا یہ کہ بندوں میں خدا کی کبریائی اور تعظیم کا جذبہ پیدا ہو۔ **(ولتکبروا اللہ علی ما ھدٰنکم)** تیسرا یہ کہ بندے خدا کے شکر گذار بنیں۔ **(ولعلکم تشکرون)**

جہاں تک حصول تقویٰ کا تعلق ہے یہ روزے کا سب سے اعلیٰ و اہم ترین مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو روحانیت اور حیوانیت یا باالفاظ دیگر ملکوتی اور بہیمی صفات کا جامع بنایا ہے اس کی طبعیت اور جبلت میں وہ سارے مادی اور سفلی تقاضے بھی ہیں جو دوسرے جانداروں میں پائے جاتے ہیں یعنی بھوک پیاس، نیند، صنفی تقاضے وغیرہ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی فطرت میں روحانیت اور ملکوسیت کا وہ

نورانی جوہر بھی ہے جو اسے ملاء اعلیٰ کی مخلوقات یعنی فرشتوں سے مماثل کرتا ہے۔ انسان کی سعادت کا دارومدار اس پر ہے کہ اس کا یہ روحانی اور ملکوتی عنصر (عقل) بہیمی و حیوانی عنصر (طبیعت) پر غالب اور حاوی رہے۔ روزہ سے یہ مقصد بہ درجہ احسن حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے انسان اپنی بہیمیت کو دبانے پر قادر ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں شاہ ولی اللہ کہتے ہیں ـــــ"روزہ اعلیٰ درجہ کی نیکی ہے۔ اس سے ملکی قوت بڑھتی ہے اور بہیمی طاقت کمزور ہوتی ہے۔ روح کا چہرہ روشن کرنے کے لئے کوئی قلعی اس سے زیادہ نہیں ہے اور طبیعت کو مغلوب کرنے کی کوئی دوا اس سے زیادہ مفید نہیں ہے[۶]"

گویا روزہ کا سب سے اعلیٰ مقصد تقویٰ ہے اور حصول تقویٰ کی واحد سبیل "ضبط نفس" ہے۔ نفسانی خواہشات یوں تو ہزاروں ہیں لیکن ان میں سے دو قوی ترین ہیں ایک کھانے پینے کی خواہش اور دوسرے صنفی ملاپ کی خواہش۔ ان دونوں پر زور خواہشات میں اتنی طاقت ہے کہ وہ انسان کو باسانی زیر کرلیتی ہیں' نیز یہ صرف انسانی یا نفسانی خواہشات ہی نہیں بلکہ عین فطری ضروریات بھی ہیں انہی پر اس کی بقائے ذات بھی موقوف ہے اور بقائے جنس بھی۔ روزہ انہی طاقتور خواہشات کو ایک قابل لحاظ وقت تک دبائے رکھنے کی مشق بہم پہنچاتا ہے اس کے بعد روزہ داروں سے بجا طور پر یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی دوسری خواہشوں کو (جو ان خواہشات سے یقیناً کمزور و کمتر ہوں گی) زیادہ آسانی اور کامیابی سے دبالے یا قابو پالے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ روزہ کا مقصد "ضبط نفس" ضرور ہے "نفس کشی" نہیں جیسا کہ بیشتر مذاہب کے پیروکار سمجھتے ہیں ان کے خیال میں وہ جتنا زیادہ اپنے جسم کو تکلیفیں دیتے ہیں خدا ان سے اتنا ہی راضی ہوتا ہے یہ خیال رہبانیت اور ترک دنیا کی طرف لے جاتا ہے جب کہ اسلام اپنے پیروکاروں سے نفس کشی کا تقاضا نہیں کرتا وہ یہ تعلیم بھی نہیں دیتا کہ بندے اپنے نفوس کو اذیتیں دے دے کر بے دم بنا دیں اور اس کے جبلی مطالبات اور تقاضوں کو ختم کرکے رکھ دیں۔

ایک سفر کے موقع پر ایک شخص بدحال ہوکر گر گیا اور لوگ اس کے گرد جمع ہوگئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ دریافت کیا تو انہیں بتایا گیا کہ وہ شخص روزے سے ہے، فرمایا "یہ نیکی نہیں ہے کہ سفر میں روزہ رکھا جائے۔" (بخاری۔ کتاب الصوم) جنگ کے موقع پر تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو روزے سے روک دیا کرتے تھے تاکہ دشمنوں سے لڑنے میں کمزوری لاحق نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو مرتبہ رمضان میں جنگ پر گئے، پہلی مرتبہ جنگ بدر میں اور آخری مرتبہ فتح مکہ کے موقع پر اور دونوں مرتبہ ہم نے روزے چھوڑ دیئے۔ امتیوں کو غیر معمولی مشقت سے بچانے کے لئے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "صوم وصال" سے منع فرمایا اور وہ اصحاب جو بہت زیادہ عبادات پر اصرار کیا کرتے تھے انہیں زیادہ سے زیادہ "صیام داود" کی اجازت دی اس سے زیادہ کی یہ کہہ کر مخالفت کر دی کہ ——— "جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس نے گویا روزہ ہی نہیں رکھا"

مدینے سے باہر کے رہنے والے ایک صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ملاقات کی اور واپس چلے گئے۔ سال بھر بعد دوبارا آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پہچانا نہیں۔ صحابی نے انہیں یاد کراتے ہوئے کہا "میں وہی تو ہوں جو گذشتہ سال حاضر خدمت ہوا تھا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا "تم تو بہت اچھی شکل وصورت کے تھے کس چیز نے تمہاری ہیئت بدل کر رکھ دی ہے؟" انہوں نے کہا کہ " یہاں سے واپس جانے کے بعد آج تک میں نے رات کے سوا کبھی کھانا نہیں کھایا" (یعنی مسلسل روزے رکھتا رہا) یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "تم نے خود کو کیوں عذاب دیا؟" (ابو داؤد۔ جلد اول۔ کتاب الصیام)

گویا روزہ کا مقصد ضبط نفس ضرور ہے نفس کشی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ سورہ بقرہ میں جہاں روزے کی فرضیت کا حکم ہے وہیں اللہ تعالی فرماتا ہے۔

یریداللہبکم الیسر ولا یریدبکم العسر (البقرہ۔۱۸۵)

ترجمہ : اللہ تعالی تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لئے سختی نہیں چاہتا۔

روزے کے ذریعہ اسلام جو دوسرا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے شعور میں اللہ کی حاکمیت و کبریائی کے اقرار و اعتراف کو مستحکم کیا جائے یہاں تک کہ انسان اپنے جائز مطالبات میں بھی اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جائے۔ خدا کا وجود محض ایک مابعد الطبیعی عقیدہ نہ رہے بلکہ عملی زندگی میں محسوس و کار فرما ہو جائے۔ کفر اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان خدا کے مقابلے میں خود کو خود مختار محسوس کرے۔ اس کے برعکس اسلام یہ ہے کہ انسان ہر آن خود کو بندہ و محکوم سمجھے۔ روزہ انسانوں میں یہی احساس بندگی شدید کرتا ہے' اور احساس بندگی جس قدر شدید ہو گا اطاعت امر بھی اتنی ہی شدت سے ہوگی اور یہی وہ دوسرا اہم مقصد ہے جو روزہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

روزہ کے ذریعہ اسلام جو تیسرا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے وہ یہ کہ مسلمانوں میں شکر گذاری کے جذبات پیدا ہوں اور وہ حقیقی معنوں میں خدا کے شکر گذار بندے بنیں۔ بندوں پر اللہ تعالٰی کے ان گنت احسانات اور بیحد و حساب نعمتیں ہیں ان میں سب سے عظیم الشان نعمت "قرآن حکیم" ہے۔ جس کے ذریعہ انسان نے ہدایت کا راستہ پایا اور جس کی وجہ سے وہ حیوانوں کے درجہ سے بلند ہو کر فرشتوں سے بھی اعلیٰ مخلوق قرار پایا اور اس کے ذریعہ سے انسان نے جہالت و نادانی کی طرف سے حکمت و معرفت کی جانب اپنا سفر شروع کیا۔ ان احسانات پر اللہ کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے اور ادائیگی شکر کا احسن طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس مقصد کی تکمیل کے لئے وقف کردیا جائے جس کے لئے وہ نعمت عطا کی گئی ہے قرآن کی نعمت ہم کو اس لئے عطا کی گئی ہے کہ ہم اللہ کی رضا و خوشنودی کا راستہ جان کر خود بھی اس ہدایت پر چلیں اور دنیا کو بھی اس پر چلائیں۔ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ روزہ ہے لہٰذا روزہ صرف عبادت ہی نہیں بلکہ یہ وہ زبردست اخلاقی تربیت ہے جس کا ایک پہلو نعمت قرآن کی صحیح اور موزوں شکر گذاری ہے اور اسی لئے رمضان کی راتوں میں (تراویح میں) اسے کثرت سے پڑھا اور سنا جاتا ہے۔

فضیلت و اہمیت :

حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ ماہ شعبان کے آخری دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ـــــــ "اے لوگو! ایک عظمت و برکت والا مہینہ تم پر سایہ فگن ہونے والا ہے۔ اس مہینے میں ایک رات ہے جو ہزار ماہ سے بہتر ہے۔ اللہ نے اس ماہ کے روزے فرض کیئے ہیں اور اس مہینے میں قیام اللیل نفل ہے ...... یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے' یہ ہمدردی و غمگساری کا مہینہ ہے اس مہینے میں مومن کا رزق زیادہ ہو جاتا ہے۔ جس نے روزہ دار کا روزہ افطار کرایا اس کے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں اور اسے جہنم سے نجات مل جاتی ہے۔ اس مہینے کا پہلا عشرہ رحمت کا ہے' دوسرا عشرہ مغفرت کا اور تیسرا دوزخ کی آگ سے نجات کا۔ جس نے اپنے خادم اور نوکر سے اس ماہ میں کم کام لیا اللہ اس کے گناہ معاف کردے گا اور اسے دوزخ کی آگ سے بچالے گا۔" (مشکوٰۃ المصابیح۔ کتاب الصوم)

مندرجہ بالا حدیث کے علاوہ چند اور احادیث بیان کی جاتی ہین جن سے روہ کی فضیلت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ روزہ دار کے منھ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے۔ وہ کھانا پینا اور اپنی مرغوب چیزوں کو روزوں میں میری خاطر (اللہ کی خاطر' چھوڑ دیتا ہے اور میں اس کا بدلہ دیتا ہوں اور نیکی دس گنا ملتی ہے۔" (صحیح بخاری' کتاب الصوم' جلد اول' ص ٦٧٦)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "جنت میں ایک دروازہ ہے جس کو "ریان" کہا جاتا ہے' قیامت کے دن اس دروازے سے روزہ دار ہی داخل ہو سکیں گے کوئی دوسرا داخل نہ ہو سکے گا۔ اس دن پکارا جائے گا کہ روزہ دار کہاں ہیں؟ روزہ دار لوگ کھڑے ہوں گے اس دروازے سے ان کے سوا کوئی داخل نہ ہو سکے گا' جب وہ داخل ہو جائیں گے تو دروازہ بند کردیا جائے گا اور اس میں کوئی داخل نہ ہو سکے گا۔" (صحیح بخاری۔ کتاب الصوم' جلد اول' ص ٦٧٦)

المختصر یہ کہ جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں[10] اور جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں' شیاطین زنجیروں میں جکڑ دیئے جاتے ہیں[11]۔ رمضان کا مہینہ ہی وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا' شب قدر کی برکات بھی اسی ماہ میں حاصل ہوسکتی ہیں۔ مسلمانوں کے لئے یہ ضبط نفس' اور تعمیر سیرت کا مہینہ ہے جس میں بے اندازہ انفرادی و اجتماعی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ انفرادی فوائد تو یہ حاصل ہوتے ہیں کہ مسلمانوں میں تقویٰ اور پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے۔ صبر و شکر کے جذبات عروج پر ہوتے ہیں' وہ خدا کے لئے اپنے جائز اور فطری مطالبات سے بھی دست بردار ہونے کی مشق کرتے ہیں جس کے عوض اپنے آپ کو خدا کا مقرب بناتے ہیں۔

اجتماعی طور پر دیکھا جائے تو رمضان خیر و فلاح اور تقویٰ و طہارت کا موسم ہے اس موسم میں اجتماعی طور پر برائیاں دبتی ہیں اور نیکیوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ معاشرہ میں امداد باہمی کی روح جاری ہوجاتی ہے۔ روزے سے معاشرے کے دیگر افراد کی معاشی کفالت ہوتی ہے وہ اس طرح کہ روزے کے ساتھ ساتھ جو فدیے اور کفارے کے احکام دیئے گئے ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب مواقع پر روزے کا بدل غریبوں کو کھانا کھلانا قرار دیا گیا ہے۔ پھر روزہ داروں کو روزہ افطار کرانے کا بڑا اجر بتایا گیا ہے ـــــ روزے میں ایک خاص وقت تک بھوکا پیاسا رہنے سے امراء میں بھی غریبوں کی بھوک پیاس کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے رمضان کو "شہر الصبر" اور "شہر المواساۃ" کہا گیا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال اس ماہ میں یہ ہوتا تھا کہ

"نہ کسی قیدی کو قید میں باقی رکھتے اور نہ کسی سائل کو محروم واپس کرتے۔"
(مشکوۃ' کتاب الصوم)

اور بقول حضرت ابن عباس : "اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے فیاض انسان تھے مگر رمضان کے مہینے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی غیر معمولی حد تک بڑھ جاتی تھی۔" (بخاری' جلد اول' کتاب الصوم)

جس طرح حد سے زیادہ فاقہ کشی انسانی جسم کو نحیف و نزار کردیتی ہے اسی طرح ضرورت سے زیادہ کھانا انسانی جسم کو مختلف امراض اور بیماریوں میں مبتلا کردیتا ہے۔ طبی تجربے اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لئے ضروری ہے۔ بعض اطبا یہ ہدایت دیتے ہیں کہ کم از کم ہفتہ میں ایک وقت کھانا ناغہ کیا جائے۔ اسلام میں ہفتہ وار مسنون و مستحب روزے بھی ہیں مگر اسی کے ساتھ سال میں ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کے لئے فرضاً روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہے اگر افطار و سحور میں بے اعتدالی سے نہ کھایا جائے تو روزہ کئی بیماریوں کو دور کرسکتا ہے اس طرح روزہ ایک طرح کا لازمی سالانہ جسمانی علاج بھی ہے[۱]۔ پھر یہی نہیں بلکہ انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لئے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے جب انسانی معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل و دماغ تبخوہ معدی کی معیبت سے پاک ہو چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس حقیقت پر گواہ صادق ہے۔

پھر یہی نہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو انسان اپنے دن کا بڑا حصہ کھانا پکانے کھانے کھلانے اور اس کا اہتمام کرنے میں صرف کرتا ہے۔ اگر انسان ایک وقت کا کھانا کم کردے تو اس کی دولت اور وقت کا بڑا حصہ بچ سکتا ہے۔ جسے وہ عبادت خداوندی اور خلق خدا کی خدمت و اعانت میں صرف کرکے اجر عظیم کا مستحق بن سکتا ہے۔

الغرض نماز اور زکوۃ کی طرح روزہ بھی ایک ایسی عبادت ہے جو بہت سے انفرادی و اجتماعی ائد و ثمرات کی حامل ہے اور اس عبادت کو کماحقہ ' بجالانے والے خوش نصیبوں سے خدا کا وعدہ ہے "صبر کرنے والوں کو مزدوری بے حساب پوری کی جائے گی۔" (القرآن۔ سورہ رمز) ظاہر ہے کہ مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے۔ اس لئے روزہ دار بھی "صابرین" کی جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہوں گے۔

حواشی و حوالہ جات

۱ : ندوی، سید سلمان، سیرۃ النبی جلد ۵ ص ۲۱۳

۲ : سورہ البقرہ۔ ۱۸۵

۳ : ابن قیم۔ زاد المعاد

۴ : مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، جلد اول ص ۱۴۱

۵ : ندوی ص ۲۳۹ (بحوالہ فتح الباری)

۶ : امام محمد غزالی، کیمیائے سعادت، ص ۱۸۴ نیز احیاء العلوم، جلد اول ص ۳۶۵، مترجم محمد احسن صدیقی، دارالاشاعت، کراچی ۱۹۷۹ء

۷ : حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول، ص ۱۹۸

۸ : حوالے کے لئے دیکھئے بخاری، جلد اول، کتاب الصوم ص ۲۹۸

۹ : الصوم داؤد سے مراد یہ ہے کہ حضرت داؤد کے طریقے پر روزہ رکھا جائے۔ وہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن نہیں۔ اور دشمن سے لڑائی میں پیٹھ نہیں دکھاتے تھے (بخاری۔ کتاب الصوم) گویا جسمانی کمزوری روزہ کا مقصد ہرگز نہیں ہے۔

۱۰ : صحیح بخاری، جلد اول، کتاب الصوم ص ۲۷۷

۱۱ : ایضاً

۱۲ : ندوی ص ۲۳۶

باب نہم

حج

حَج یا حِج کے لفظی معنی ہیں قصد کرنا، کسی جگہ ارادتاً جانا۔ اسلامی شریعت کی اصطلاح میں مقررہ دنوں میں مکہ مکرمہ جاکر بیت اللہ، عرفات، مزدلفہ اور منیٰ وغیرہ کا قصد کرنے اور طواف اور دیگر مناسک ادا کرنے اور مقررہ آداب و اعمال بجالانے کا نام حج بیت اللہ ہے۔

حج اسلامی عبادات کا چوتھا رکن ہے۔ عبادت کا یہ طریقہ غالباً خدا پرستی کا سب سے پہلا اور قدیم طریقہ ہے۔ دنیا کی قدیم ترین معلوم قوموں (بابل، کلدان و یونان وغیرہ) میں یہ دستور تھا کہ ہر آبادی میں دو (۲) خاص باعظمت مکان بنائے جاتے تھے ایک بادشاہ کا محل یا قلعہ اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا تھا۔ عموماً ہر آبادی کسی نہ کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہو کر اس کی پناہ میں ہوتی تھی اور اسی دیوتا یا ستارہ کی وہاں پوجا ہوتی تھی۔ نذرانہ کی تمام رقمیں اور پیداواریں اسی معبد میں جمع ہوتی تھیں۔

مسلمانوں کے لئے اس نوعیت کا پہلا گھر مکہ مکرمہ میں "خانہ کعبہ" ہے۔ اس کی اولین تعمیر کے سلسلہ میں مختلف روایات مذکور ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک روایت یہ ہے کہ کعبہ کو سب سے پہلے فرشتوں نے تعمیر کیا۔ اس وقت حضرت آدمؑ کو پیدا ابھی نہیں کیا گیا تھا یہ کعبہ کی اولین تعمیر تھی۔ اس سلسلہ کی دوسری روایت یہ ہے کہ کعبہ کو سب سے پہلے حضرت آدمؑ نے تعمیر کیا اور جب تعمیر مکمل ہو گئی تو ان کو اس کے طواف کا حکم

دیا گیا۔ پھر مرور زمانہ کے بعد حضرت نوحؑ نے کعبہ کا حج کیا۔ مشہور محدث عبدالرزاق اپنی کتاب المصنف میں لکھتے ہیں کہ آدمؑ نے کعبہ کی تعمیر میں پانچ پہاڑوں یعنی لبنان' طور زیتا' طور سیناء' الجودی اور حرا کے پتھر استعمال کئے تھے۔ اور حجراسود کو نصب کیا جو ان کے ساتھ ہی اتارا گیا تھا۔ حضرت آدمؑ کی تعمیر کے بعد ان کے بیٹے حضرت شیثؑ نے بھی کعبہ کی تعمیر ثانی میں حصہ لیا تھا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر کا ذکر تو خود قرآن مجید میں موجود ہے۔

مکہ مکرمہ میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کے ساتھ مل کر بیت اللہ کی دیواریں اٹھائیں اور دعا کی ——— "اے میرے پروردگار! اس شہر کو پرامن بنا اور اس شہر کے جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں انہیں پھلوں سے رزق عطا کر"۔ (البقرہ۔۱۲۶)

نیز یہ التجا کی "اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کو تیرے حرمت والے گھر کے پاس ایسی وادی میں آباد کیا ہے جہاں کوئی زرعی پیداوار نہیں ہوتی یہاں انہیں بسانے کا مقصد اقامت الصلوٰۃ ہے۔ لہٰذا تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کردے اور انہیں کھانے کو پھل عطا کر تاکہ وہ تیرا شکر ادا کرتے رہیں۔ (ابراہیم۔ ۳)

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی ان دعاؤں کو شرف قبولیت عطا کیا اور ابراہیم و اسماعیل کو حکم دیا کہ وہ اس گھر کو طواف کرنے' اعتکاف کرنے اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک و صاف رکھیں اور حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو حج کی دعوت دیں۔

حج کی حقیقت :-

شاہ ولی اللہ حج کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہر قوم و ملت کے پاس ایک معبد یا قربانگاہ ہوتی ہے جہاں کی وہ زیارت کرتے ہیں۔ جمع ہوتے ہیں اور آیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس سے وہ اپنے مقرب لوگوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان بیت اللہ کا قصد کرتے ہیں اور یہ مقام سب سے زیادہ حج کے قابل ہے اس میں

حضرت ابراہیم کے دین خاص کی کرامات اور دیگر برملا نشانیاں موجود ہیں لہٰذا صالح مسلمانوں کی ایک انتہائی کثیر جماعت ہر سال' خاص دنوں میں' خاص لباس میں اور ایک خاص کیفیت میں یہاں جمع ہوتی ہے۔ اپنے گناہوں پر زاری کرتی اور مغفرت کی طالب ہوتی ہے جس سے رحمت خداوندی کو جوش آتا ہے اور بے پایاں رحمت و مغفرت کا نزول ہوتا ہے[8]۔ یہ امت مسلمہ کے جمع ہونے' ان کی شوکت کے ظاہر ہونے اور دین کی عزت و عظمت کا دن ہے[9]۔ اس دن امت مسلمہ حضرت ابراہیم سے موافقت کا اظہار کرتی ہے اور خدا تعالیٰ کے بے پایاں انعامات و احسانات کو یاد کرتی ہے۔

دراصل حج کے دو نمایاں پہلو ہیں۔ حج کا ایک پہلو خدا کے سامنے اپنی اطاعت و فرما داری کا اعتراف ہے اور اس کا دوسرا پہلو توبہ اور انابت ہے۔ اسی لئے احرام باندھنے کے ساتھ لبیک اللھم لبیک (میں حاضر ہوں خداوند میں حاضر ہوں) کا ورد اس کی زبان سے جاری ہوجاتا ہے۔ طواف میں' سعی میں' کوہ صفا پر' کوہ مروہ پر' عرفات' مزدلفہ و منیٰ میں ہر جگہ جو دعائیں مانگی جاتی ہیں ان کا بڑا حصہ توبہ و استغفار کا ہوتا ہے۔ بندوں کی یہی دونوں ادائیں خدا کو سب سے بڑھ کر محبوب ہیں لہٰذا وہ فرشتوں کے سامنے اپنے ان بندوں پر فخر کرتا ہے۔

حج ایک ایسی عبادت ہے جس سے منافقین کی بھی قلعی کھل جاتی ہے۔ اس کی ادائیگی میں زر کثیر کے ساتھ ساتھ دشوار و طویل سفر درپیش ہوتا ہے۔ لہٰذا اس پر نفس کا آمادہ کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ ایسا وہی کرسکتے ہیں جو ایمان کی عاشقانہ تڑپ رکھتے ہیں۔

حج ہر اس مسلمان پر فرض ہے[10] جو

۱ ۔ عاقل ہو' مجنوں مکلف نہیں۔

۲ ۔ بالغ ہو' بچوں کے لئے ضروری نہیں

۳ ۔ اس کے پاس اتنا مال ہو جو نہ صرف اس کے مصارف حج کے لئے کافی ہو بلکہ ان تمام افراد کے لئے بھی کافی ہو جن کے معاش کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر ہے۔

۴ ۔ تندرست اور صحت مند ہو' اس کے بدن میں اتنی طاقت ہو کہ سفر حج کر سکے اور احکام بجالا سکے۔

۵ ۔ اس کے لئے راستہ پر امن ہو

۶ ۔ ذریعہ سفر میسر ہو

۷ ۔ کوئی عملی روک ٹوک اور بندش موجود نہ ہو

اگر کوئی مسلمان یہ تمام شرائط پوری کرتا ہو تو پھر اسے حج موخر نہیں کرنا چاہئے۔ چونکہ حج کے لئے کافی روپیہ' مشقت اور وقت درکار ہے اور اگر تمام احکام ملحوظ رکھ کر صحیح طور پر حج ادا کیا جائے تو ساری عمر کے لئے کافی تربیت ہو جاتی ہے اس لئے شریعت نے عمر بھر میں ایک ہی دفعہ حج فرض قرار دیا ہے۔

شریعت محمدیؐ میں حج کی فرضیت کا حکم ۹ ھ میں آیا[11]۔ فتح مکہ کے بعد دور اسلامی کا پہلا[12] حج ۸ ھ میں قدیم طریقے پر ہوا۔ پھر ۹ ھ میں دوسرا حج مسلمانوں نے اپنے طریقے پر کیا اور مشرکین نے اپنے طریقے پر۔ اس دوسرے حج کے امیر حج حضرت ابوبکر صدیق ؓ تھے۔ اس کے بعد تیسرا حج ۱۰ ھ میں خالص اسلامی طریقے پر ہوا اور یہی وہ مشہور حج ہے جسے "**حجتہ الوداع**" کہتے ہیں۔ نبی اکرمؐ پہلے دو سال حج کے لئے تشریف نہ لے گئے۔ تیسرے سال جب شرک کا بالکل استیصال ہو گیا تب آپ نے حج ادا فرمایا۔

دراصل حج کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو سکھایا اور جس پر ان کی اولاد قائم رہی رفتہ رفتہ اس میں نئی نئی بدعتیں شامل ہوتی چلی گئیں یہاں تک کہ رسول اللہ کی بعثت کے وقت جو حج ہوتا تھا وہ سنت ابراہیمی کے قطعی خلاف تھا۔ اس میں شک نہیں کہ حج عربوں کا ایک عام شعار تھا اور اس کے اصول و ارکان بھی پہلے سے موجود تھے لیکن ان میں بہت سے مشرکانہ رسوم داخل ہو گئے تھے مثلاً

(ا) اہل عرب نے حج کو ذاتی و خاندانی نام و نمود کا ذریعہ بنالیا تھا حالانکہ ہر عبادت کی اصل غرض ذکر الٰہی' طلب مغفرت اور اعلائے کلمتہ اللہ ہے۔ چنانچہ جب تمام مناسک حج سے اہل عرب فارغ ہو لیتے تو منیٰ میں قیام کرتے اور اس موقع پر ہر قبیلہ ذکر

الہٰی کی جگہ اپنے اپنے آباء و اجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا۔

(۲) قریش قربانی کرتے تھے تو اس کے خون کو خانہ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے کہ خدا سے تقرب حاصل ہو جائے۔

(۳) خصوصاً اہل یمن کا دستور تھا کہ سفر حج میں زاد راہ لے کر نہیں چلتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہیں جس کے نتیجے میں مکہ تک پہنچتے پہنچتے بھیک مانگنے کی نوبت آجاتی تھی[ص ۱۱]

(۴) قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابلے میں جو امتیازات قائم کر لئے تھے ان کی بنا پر قریش کے سوا تمام قبیلے برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ اس غرض سے خانہ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا جس پر تمام لوگ کپڑے اتار اتار کر رکھ دیتے تھے[۱۲]۔ ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کر سکتی تھی یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے عاریتاً کپڑے تقسیم کئے جاتے تھے۔ لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے انہیں برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا۔

(۵) قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اور تمام قبائل عرفات میں قیام کرتے تھے لیکن وہ خود حدود حرم کے اندر سے باہر نکلنا اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے مزدلفہ میں ٹھہر کر واپس پلٹ آتے تھے اور تمام لوگوں کو عرفات تک جانے کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔

(۶) عہد جاہلیت میں حج نے ایک بڑے میلے کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس میں ہر طرف سے ہر قماش کے لوگ جمع ہو جاتے تھے اور اس میں وہ سب کچھ ہوتا تھا جو عموماً میلوں میں ہوتا یعنی شور و غل، دنگا فساد، کھیل تماشے، عورتوں سے چھیڑ خانی اور فسق و فجور وغیرہ۔

(۷) اہل عرب ایام حج میں عمرہ ادا نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا کہنا تھا کہ جب سواریاں حج سے واپس آجائیں اور ان کی پیٹھ کے زخم اچھے ہو جائیں تب عمرہ جائز ہو سکتا ۔ اسی طرح مناسک حج کی ادائیگی کے بعد واپسی کے سلسلہ میں بھی ان کے دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک کا کہنا تھا کہ جو لوگ ایام تشریق ہی میں واپس آتے ہیں وہ گنہگار ہیں جب کہ

دوسرے گروہ کا کہنا یہ تھا کہ جو لوگ دیر میں واپس آتے ہیں وہ گنہگار ہیں۔

(۸) پھر ان میں ایک اور عجیب بدعت یہ آگئی تھی کہ خصوصاً انصار جب حج کر کے واپس آتے تو دروازے کی راہ سے داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ پچھواڑے سے کود کر آتے تھے اور اسی کو کار ثواب سمجھتے تھے۔

قرآن نے ان تمام باتوں کی اصلاح کی۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے

--- "تم میں سے جو شخص حج کا زمانہ آنے تک عمرے کا فائدہ اٹھائے وہ حسب مقدور قربانی دے اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر' اس طرح پورے دس روزے رکھ لے۔ یہ رعایت ان لوگوں کے لئے ہے جن کے گھربار مسجد حرام کے قریب نہ ہوں۔ اللہ کے ان احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص ان مقررہ مہینوں میں حج کی نیت کرلے اسے خبردار رہنا چاہئے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل' کوئی بد عملی' کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو۔ اور جو نیک کام تم کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہوگا۔ سفر حج کے لئے زاد راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زاد راہ پرہیزگاری ہے۔ پس اے ہوش مندو میری نافرمانی سے پرہیز کرو اور اگر حج کے ساتھ ساتھ تم اپنے رب کا فضل بھی تلاش کرتے جاؤ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر جب عرفات سے چلو تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس ٹھر کر اللہ کو یاد کرو اور اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں دی ہے ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔ پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو۔ یقیناً وہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ پھر جب اپنے حج کے ارکان ادا کر چکو تو جس طرح پہلے اپنے آباؤاجداد کا ذکر کرتے تھے اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر .... یہ گنتی کے چند روز ہیں جو تمہیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہئیں۔ پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہوگیا تو کوئی حرج نہیں' اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کئے ہوں۔" (بقرہ آیات ۱۹۶ تا ۲۰۳)

تمام اصلاحات کے بعد حج کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ۔

—— حج کے معین ایام چھ ہیں یعنی اسلامی قمری تقویم کے مطابق آٹھ سے تیرہ ذی الحج تک۔

—— رسول اللہ نے میقات کی شکل میں بیت اللہ کے حدود مقرر کیے کہ جو شخص حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ جانا چاہے وہ ان مقامات سے بغیر احرام باندھے نہ گزرے۔ گویا یہ مقامات اس شاہی دربار کے حدود ہیں۔ یہیں سے ظاہری طور پر بھی تذلل' انکسار اور تواضع کی حالت ضروری ہے۔ یہ مواقیت تعداد میں پانچ ہیں۔

۱ - **یلملم** : یہ تہامہ کے علاقے کی ایک پہاڑی کا نام ہے۔ یہ پاکستان ' ہندوستان' یمن وغیرہ کی طرف سے آنے والے حاجیوں کا میقات ہے۔

۲ - **جحفہ** : یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک بستی تھی جو اب موجود نہیں۔ اس وقت اس کے قریب ایک اور آباد بستی ہے جسے رابغ کہتے ہیں یہ جگہ مکہ سے شمال کی جانب تقریبا ایک سو چالیس میل کے فاصلے پر ہے اور مصر' شام' طرابلس اور یورپ وغیرہ سے آنے والے حاجیوں کا میقات ہے۔

۳ - **ذات عرق** : یہ اہل عراق کا میقات ہے۔

۴ - **قرن المنازل** : یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو عرفات کی طرف واقع ہے۔ یہ نجد والوں کا میقات ہے۔

۵ - **ذوالحلیفہ** : اس جگہ کو آج کل بئر علی یا ابیار علی کہتے ہیں یہ مدینے سے تقریبا پانچ میل کے فاصلے پر ہے یہ مدینہ والوں کا میقات ہے۔ مکے سے بعید ترین میقات یہی ہے۔

—— میقات سے آگے گذرنے کے لئے احرام ضروری ہے۔ یہ بن سلے سفید رنگ کے معمولی دو کپڑے دراصل عہد ابراہیمی کے لباس کی تمثیل ہیں۔ احرام باندھتے ہی بہت سی حلال چیزیں حرام ہو جاتی ہیں اسی لئے اس کو "احرام" کہتے ہیں اور یہیں سے اصل عبادت شروع ہو جاتی ہے۔

—— ایام حج چھ ہیں " ۸ تا ۱۳ ذی الحج " ذوالحج کی ساتویں تاریخ کو "یوم

الزینۃ کہتے ہیں کیونکہ اس دن حاجی غسل کر کے، صاف کپڑے پہن کے اور خوشبو وغیرہ لگا کے اگلے دن کے حج کی تیاری کرتا ہے۔

ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ کو "یوم الترویۃ" کہتے ہیں۔ اس کا یہ نام اس لئے پڑا کہ اس دن تقریباً بے آب و گیاہ میدان میں ایک ہفتے کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں اس لئے اس دن اونٹوں کو جو عرب کی خاص سواری ہے پانی وغیرہ پلا کر سیر کر لیا جاتا ہے۔ اس دن حاجی منیٰ کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ جو مکہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے۔ پانچ نمازیں یعنی ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر منیٰ ہی میں ادا کرتے ہیں۔

ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو "یوم الحج" کہتے ہیں۔ اسی کا نام "یوم العرفہ" بھی ہے۔ یہی حج کا اصل دن ہے یہ پورا دن عرفات میں گذارا جاتا ہے جو کہ منیٰ سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ ایک وسیع بیابان ہے جہاں نہ کوئی درخت ہے نہ سایہ۔ اس جگہ مسجد نمرہ میں یا جبل رحمت پر خطبہ ہوتا ہے اس کے بعد ظہر و عصر کی دونوں نمازیں قصر کر کے سورج ڈھلتے ہی پڑھ لی جاتی ہیں اس کے بعد شام تک کے چار پانچ گھنٹے حج کا لب لباب ہیں۔ رسول اللہ کا فرمان ہے۔

الحج الوقوف بعرفۃ حج عرفات میں ٹھہرنے کا نام ہے۔

یہ وقت حتی الوسع کھڑے ہو کر دعا، استغفار، تسبیح، تہلیل، تکبیر، تحمید اور ہر طرح کے ذکر الٰہی و تلاوت قرآن میں گذارا جاتا ہے۔ سورج غروب ہونے کے بعد یہاں سے مزدلفہ روانہ ہو جاتے ہیں جہاں رات بسر کرتے ہیں۔

ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو "یوم النحر" کہتے ہیں۔ وہی دن جس میں حج کی یادگار کے طور پر دنیا کے سب مسلمان عیدالاضحیٰ مناتے ہیں۔ حاجی اس دن منیٰ میں قربانی کرتے ہیں جو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یادگار ہے۔ اس سے قبل رمی جمار "کنکریاں مارنا" کرتے ہیں۔ رمی جمار اس واقعہ کی یادگار ہے جو حضرت ابراہیمؑ کو پیش آیا تھا جب وحی الٰہی کے مطابق آپ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے لئے چلے تو شیطان نے آپ کے دل میں وسوسہ ڈالنے کی کوشش کی تو آپ نے اسے جمرہ اولیٰ کے پاس کنکریاں ماری تھیں۔ اس کے بعد شیطان حضرت حاجرہؑ کو ورغلانے گیا تو حضرت حاجرہؑ نے اسے جمرہ ثانیہ یا

جمرہ وسطیٰ کے پاس کنکریاں ماریں۔ پھر وہ حضرت اسماعیلؑ کے پاس گیا اور انہیں باپ کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی اس وقت حضرت اسمٰعیلؑ نے اسے جمرہ ثالثہ یا جمرہ عقبیٰ کے پاس کنکریاں ماری تھیں۔

قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈواتے یا ترشواتے ہیں اس کے بعد مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کا طواف کرتے اور صفا و مروہ کی سعی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی احرام کی پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ صفا و مروہ کے درمیاں سعی حضرت حاجرہؑ کی یادگار میں ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی حاجرہؑ اور بیٹے اسمٰعیلؑ کو چھوڑ کر واپس چلے گئے اور جب ان کا ذخیرہ پانی ختم ہو گیا تو وہ پانی کی تلاش میں صفا کی پہاڑی پر چڑھیں جب وہاں سے پانی نظر نہ آیا تو مروہ کی پہاڑی پر چڑھیں درمیان میں جہاں نشیب تھا اور بچہ ان کی نظر سے اوجھل ہو جاتا تھا وہاں وہ بھاگ کر مسافت طے کرتی تھیں اس طرح انہوں نے اضطراب و بے تابی کی حالت میں صفا و مروہ کے درمیان سات چکر لگائے تھے۔

فضیلت واہمیت : -

اگر کوئی مسلمان مکلف ہونے کے باوجود حج نہیں کرتا تو وہ اپنے مسلمان ہونے کو جھٹلاتا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے :

وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا و من کفر فان اللہ غنی عن العلمین

(آل عمران : ۹۷)

ترجمہ : لوگوں پر یہ اللہ کا حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچ سکتا ہو وہ اس کا حج کرے۔ اور جس نے کفر کی روش اختیار کی تو وہ جان لے کہ اللہ سارے اہل جہان سے بے نیاز ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ سے دریافت کیا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا گیا اس کے بعد کون سا؟ آپؐ نے فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد کرنا پوچھا گیا پھر کون سا؟ آپؐ نے فرمایا حج مقبول"۔ در خواتین کو جہاد سے مستثنیٰ کرتے ہوئے حج کو اس کا نعم البدل ...

دیگر عبادات کی طرح حج بھی فوائد و مصالح سے خالی نہیں۔ حج رضائے الٰہی اور روحانی ترقی کے علاوہ سیاسی، اقتصادی اور تمدنی فوائد کا جامع ہے۔

(۱) حج تمام امت مسلمہ کو ایک مرکزیت عطا کرتا ہے۔ مکہ معظمہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے پہلے اور ان کے زمانے سے عموماً اور رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے خصوصاً ہزاروں مسلمانوں کا مرجع و مرکز ہے۔ صدیوں سے ان گنت انسان اس مرکز پر جمع ہوتے ہیں۔ سال میں ایک دفعہ مختلف خطوں کے مختلف نسلوں کے مختلف تہذیب و تمدن سے تعلق رکھنے والے مسلمان ایک مرکز پر جمع ہوتے ہیں اس موقع پر وطنیت، قومیت اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آل ابراہیمؑ) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں۔ مرکزیت اور وحدت کا یہ عظیم الشان نظارہ اسلام ہر سال پیش کرتا ہے مسلمان ممالک کو کسی ورلڈ کانفرنس یا عالمگیر مجالس کے علیحدہ سے انعقاد کی ضرورت نہیں۔ وہ حج سے بھی یہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ بلکہ ابتدائی خلافتوں کے زمانے میں یعنی عہد خلافت راشدہ اور عہد بنو امیہ میں تو خصوصاً حج کا موسم ان کے سیاسی و تنظیمی معاملات کے لئے بڑا اہم کردار ادا کرتا تھا۔ اس زمانے میں امور خلافت کے بیشتر اہم معاملات طے پاتے تھے۔ اسپین سے لے کر سندھ تک مختلف صوبوں کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے اور خلیفہ سے ملاقات کر کے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتے تھے۔ اسی موقع پر مختلف علاقوں کی رعایا، خلیفہ سے بالمشافہ انصاف پاتی تھی۔

المختصر حج مرکز اسلام کی تقویت کا ذریعہ ہے یہ صرف ایک عالمگیر اسلامی کانفرس کے مواقع ہی مہیا نہیں کرتا بلکہ مسلمانوں کے لئے ایک بین الاقوامی ایوان تجارت کا کام بھی دیتا ہے۔ یہی حال دینی، معاشی، معاشرتی اور قومی ضروریات و فوائد کا ہے۔ سورہ الحج میں ارشاد ہوتا ہے۔

لیشهدوا منافع لهم تاکہ اپنے فائدوں کے لئے آموجود ہوں۔ (الحج۔ ۲۲)

اب تو ذرائع ابلاغ کی ترقی کی وجہ سے ایک ملک کے حالات کو دوسرے ملک تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا لیکن جب تہذیب کی یہ ترقی نہیں ہوئی تھی تو اشاعت علم

(۳) حج قیام امن کا بے مثال ذریعہ بھی ہے ضروری ہے کہ سال کے چار مہینے جو حج اور عمرے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ دنیا میں عموماً اور بیت اللہ کی طرف آنے والے راستوں میں خصوصاً امن رہے۔ اس طرح یہ دنیا میں قیام امن کی سب سے بڑی اور مستقل تحریک ہے۔ اشہر حرام چار ہیں۔ تین ماہ مسلسل آتے ہیں۔ ذوالقعدہ' ذوالحجہ اور محرم اور ایک علیحدہ یعنی رجب۔ اسلام کم از کم ان چار مہینوں میں قیام امن کو یقینی بنانا چاہتا ہے۔ اسی حج کی وجہ سے مکہ مکرمہ کو حرم قرار دیا گیا ہے جو رہتی دنیا تک امن کا شہر ہے[24] جس میں انسان تو کیا حیوانات اور نباتات تک کی زندگیاں محفوظ ہیں۔

(۴) حج مسلمانوں میں حقیقی روحانیت پیدا کرتا ہے۔ حج کے مناسک' احکام اور ہدایت طبیعتوں میں حوصلہ' صبر' تواضع' تعاون' شفقت اور سادگی پیدا کرنے کے لئے ایک روحانی و جسمانی تربیت اور اصلاحی مشق ہے۔

حج کی تیار ں کا آغاز عموماً ماہ رمضان سے شروع ہو جاتا ہے پھر حج کے بعد واپسی میں بھی خاصا وقت صرف ہو جاتا ہے اس طرح رمضان سے لے کر تقریباً ربیع الاخر تک حج کے لئے آنے جانے والوں کی گہما گہمی رہتی ہے اور اس طرح چھ سات ماہ تک تمام عالم اسلام میں عملاً ایک طرح کی دینی حرکت جاری رہتی ہے۔ حجاج کرام براہ راست روحانی کیفیات سے سرشار ہوتے ہیں وہ قرآن کی سرزمین کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مقامات مقدسہ کی زیارت کرتے ہیں ان مقامات پر توبہ استغفار کے ساتھ ساتھ دعائیں کرتے ہیں جہاں حضرت[25] آدمؑ و حواؑ نے اپنے گناہوں کی معافی کی دعا کی' جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اور اپنی اولاد کے لئے دعا مانگی' جہاں حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد پناہ ڈھونڈی جہاں حضرت محمدؐ نے اپنی بچپن' جوانی گذاری' اسلام کے ابتدائی سالوں کے مصائب جھیلے۔ ان مقامات کی زیارت کا زبردست نفسیاتی اثر دل و دماغ پر پڑتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ یہاں سے ایک نئی زندگی اور ایک نئی ‹ ات لے کر پلٹتے ہیں۔ اور اپنے ان تجربات و کیفیات میں حجاج کرام ان لوگوں کو شامل کرتے ہیں جو اس فریضہ کی ادائیگی سے ہنوز نہیں گذرے لہٰذا حاجیوں کو رخصت کرنے اور ان کا استقبال کرنے اور ان سے حج کے حالات سننے کی

وجہ سے پیچھے رہ جانے والوں کی سوئی ہوئی روحیں بھی بیدار ہوتی ہیں۔ آنحضرت کا جو یہ حکم ہے[۲۶] کہ حجاج کی مشایعت اور استقبال کیا جائے تو اس میں بھی یہی حکمت ہے۔ اس طرح حج کی وجہ سے تمام روئے زمین پر مسلمانوں کی بیداری کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ اسرار حج پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "یہ بھی تطہیر نفس کا ایک ذریعہ ہے کہ آدمی کسی ایسے مقام کی زیارت کے لئے جائے اور کچھ دنوں کے لئے وہاں قیام کرے جسے صالحین قابل تعظیم و تکریم سمجھتے ہوں وہاں اکثر قیام رکھتے ہوں اور خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی عبادت میں مشغول رہتے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو اعمال خیر وہ بجالاتے ہیں ان کا رنگ اس پر بھی چڑھنے لگتا ہے اور ان کے انوار اس پر بھی نور افگن ہوتے ہیں۔"[۲۷]

الغرض حج اسلامی عبادات کا اہم رکن ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی و سیاسی یعنی قومی و ملی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی اور مسلمانوں کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے اہم مظہر ہے۔

نوٹس و حوالہ جات

۱ : سیرۃ النبی جلد ۵ ص ۲۴۳

۲ : دائرہ معارف الاسلامیہ جلد ۱۷ ص ۳۲۴ مادہ کعبہ (بحوالہ اخبار مکہ از الازرقی اس بیان کے اثبات میں وہ زین العابدین اور ابن عباس سے منقول روایات بیان کرتے ہیں) النووی نے بھی اپنی کتاب "تہذیب الاسماء واللغات" میں فرشتوں کی تعمیر کعبہ کو اولین تعمیر کعبہ قرار دیا ہے۔

۳ : ایضاً

۴ : ایضاً ص ۳۲۳ (بحوالہ تاریخ مکہ از الازرقی)

۵ : سورۃ آل عمران۔ آیت ۹۶ (ترجمہ : ۔ "بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لئے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لئے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم کا مقام عبادت ہے اور اس کا حال یہ ہے

کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے' اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہئے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔")

۶ : سورہ البقرہ۔ ۳۵

۷ : سورہ الحج۔ ۲۷

۸ : شاہ ولی اللہ' حجتہ اللہ البالغہ' جلد اول' ص ۲۰۰

۹ : ایضا جلد دوئم ص ۳۷' ص ۳۱

۱۰ : دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۷ ص ۹۰۹ (مادہ حج)

۱۱ : معارف الحدیث' مولانا محمد منظور نعمانی' جلد ۴ ص ۱۸۸ (بقول راجح)

۱۲ : مودودی' سید ابوالاعلیٰ "تفہیم القرآن" جلد ۲ ص ۱۷۴

۱۳ : صحیح بخاری' جلد اول' ص ۵۶۶

۱۴ : سیرۃ النبی جلد ۵ ص ۲۶۴ (بحوالہ طبقات ابن سعد)

۱۵ : صحیح بخاری' جلد اول' ص ۵۶۶ : حج مقبول یا حج مبرور سے مراد وہ حج ہے جو سراپا نیکی ہو۔

۱۶ : اصلاحی' صدرالدین "اسلام ایک نظر میں" ص ۱۵۰ (بحوالہ سنن کبریٰ جلد ۴' باب امکان الحج)

۱۷ : ایضا

۱۸ : صحیح مسلم' کتاب الحج نیز صحیح بخاری جلد اول کتاب المناسک

۱۹ : بخاری ص ۵۲۶

۲۰ : معارف الحدیث جلد ۴ ص ۲۵۵ (بحوالہ مسلم)

۲۱ : ایضا (بحوالہ موطاء امام مالک)

۲۲ : سیرۃ النبی جلد ۵ ص ۲۸۶

۲۳ : سورہ مائدہ۔ ۲ (ترجمہ : "اور ان لوگوں کو نہ ستاؤ جو اپنے رب کے فضل اور خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم کی طرف جا رہے ہوں۔")

۲۴ : سورۃ القصص

۲۵ : سیرۃ النبی جلد ۵ ص ۲۹۵

۲۶ : دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۷ ص ۹۲۳ (مادہ حج)

۲۷ : حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ص ۲۰۱

نظام ہائے حیات

اسلام کا پیش کردہ نظام فکر،(یعنی عقائد وایمانیات) تمام شعبہ ہائے حیات کے لیے نظام وضع کرنے کی تشکیلی صلاحیت رکھتا ہے۔گزشتہ ابواب میں نظام فکر کے حوالے سے جو عقائد وایمانیات سامنے آئے ہیں وہ دراصل زندگی کے لیے اعتقادی تصورات کی حیثیت رکھتے ہیں۔یہ اعتقادی تصورات جو انسان اور کائنات کے حوالے سے اٹھنے والے ہر سوال کا شافی جواب مہیا کرتے ہیں اور ہر شعبہ ہائے حیات کے لیے باقاعدہ ایک مکمل نظام بھی وضع کرتے ہیں جو اپنی فکر،اصول،طریقہ کار اور مقاصد اور اثرات کے اعتبار سے دیگر مذاہب یا مفکرین کے پیش کردہ نظام ہائے حیات سے مختلف ہیں اور انسانیت کے طویل تجربے نے انہیں نتائج کے اعتبار سے انسانیت کے لیے زیادہ بہتر اور موثر پایا ہے۔

ان میں پانچ نظام اہم ہیں جو اپنی وسعت کے اعتبار سے پوری حیات انسانی کا احاطہ کرسکتے ہیں۔

۱۔ اخلاقی نظام

۲۔ معاشرتی نظام

۳۔ سیاسی نظام

۴۔ معاشی یا اقتصادی نظام

۵۔ عدالتی نظام

آئندہ صفحات میں ان پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی۔

باب نوزدہم

اسلامی کا اخلاقی نظام

عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ انسان کے اندر اخلاقی حس فطری طور پر موجود ہوتی ہے۔ مختلف انسانوں میں اس حس کی شدت میں کمی بیشی ہوسکتی ہے لیکن مجموعی طور پر انسانی معاشروں نے بعض اوصاف پر نیکی، حسن اور خوبی کا اور بعض پر بدی، بدصورتی اور برائی کا ہمیشہ حکم لگایا ہے مثلاً سچائی، عدل وانصاف، دیانت، امانت، پاس عہد، ہمدردی، رحم، سخاوت، صبر و تحمل، استقامت، استقلال، بہادری، شجاعت، فرض شناسی، ذمہ داری وغیرہ کو ہر معاشرے میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے، اور ان اوصاف کی قدر کی گئی ہے۔ دوسری طرف جھوٹ، ظلم، بدعہدی، خیانت، خودغرضی، سنگدلی، بخل، بزدلی، کم ظرفی، کج خلقی اور غیر ذمہ داری وغیرہ کو ہمیشہ ہی ناپسند کیا گیا ہے۔ ان اوصاف نے بھی کبھی اخلاقی محاسن کی فہرست میں جگہ نہیں پائی گویا انسانی اخلاقیات عالمگیر سچائیاں ہیں جن کو تمام انسان جانتے چلے آئے ہیں، وہ ایسی جانی پہچانی چیزوں ہیں جن کا شعور انسان کو ودیعت کر دیا گیا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

فَاَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَ تَقْوٰهَا (الشمس:۸)

(پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی)

گویا اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدائشی طور پر بُرے اور بھلے کی تمیز عطا کر دی ہے، یہی بات سورۃ بلد میں فرمائی گئی ہے:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (البلد:۱۰)

(اور ہم نے اس کو خیر و شر کے دونوں نمایاں راستے دکھا دیئے)

ایک اور جگہ فرمایا گیا:

اِنَّا ھَدَینٰہُ السَّبِیلَ اِمَّا شاکِرًا وَّ اِمّا کَفُورًا (الدھر:۳)

(ہم نے اس کو راستہ دکھا دیا خواہ شاکر بن کر رہے یا کافر بن کر)

اس بات کو سورۃ قیامہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے اندر ایک نفس لوامہ (جسے ضمیر کہا جا سکتا ہے) موجود ہے جو بُرائی کرنے پر اسے ملامت کرتا ہے۔[۱] اور ہرانسان خواہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے مگر وہ اپنے آپ کو خوب جانتا ہے کہ وہ کیا ہے۔[۲]

اللہ تعالیٰ نے حیوانات کی ہر نوع کو بھی ان کی ضرورت کے مطابق الہامی علم دیا ہے۔[۳] جس کی بناء پر مچھلی کو خود بخود تیرنا، پرندے کو اڑنا، شہد کی مکھی کو چھتہ بنانا اور بئے کو پیچیدہ اور مضبوط گھونسلا بنانا آ جاتا ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے خیال کے مطابق انسانی وجود کے تین پہلو ہیں اور ہر پہلو کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو بعض باتیں فطرتاً ودیعت کر دی ہیں مثلاً انسان کا ایک حیوانی وجود ہے اور اس حیثیت سے جو الہامی علم اس کو دیا گیا ہے اس کی نمایاں ترین مثال بچے کا پیدا ہوتے ہی ماں کا دودھ چوسنا ہے، جس کی تعلیم اگر خدا نے فطری طور پر اسے نہ دی ہوتی تو کوئی اسے یہ فن نہ سکھا سکتا تھا۔ انسان کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک عقلی وجود ہے اس حیثیت سے خدا نے ابتدائے آفرینش سے مسلسل اس کو الہامی رہنمائی دی ہے جس کی بدولت وہ پے در پے اکتشافات و ایجادات کر کے تمدن میں ترقی کرتا رہا ہے۔ انسان کی تیسری حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک اخلاقی وجود ہے اور اس حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ نے اسے خیر وشر کا احساس فطری طور پر عطا کیا ہے۔[۴]

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نیکی کے لیے ''معروف'' اور بدی کے لیے ''منکر'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یعنی نیکی اور خیر وہ چیزیں ہیں جنھیں سب بھلا جانتے ہیں اور منکر وہ کہ جسے کوئی خوبی اور بھلائی کی حیثیت سے نہیں جانتا۔

تاہم نیک و بد اور خیر وشر کا یہ علم جو انسان کو ودیعت کیا گیا ہے، حیوانات کی حد تک

کافی لیکن انسانوں کی حد تک نا کافی ہے۔کیونکہ انسان کے ساتھ بہت سی ذہنی اور خارجی قوتیں ایسی بھی لگی ہوئی ہیں جو اس کو بُرے اعمال کی طرف کھینچتی بھی ہیں اور اس کی مناسب Justification بھی مہیا کرتی ہیں جس کی وجہ سے حق و باطل دھندلا جاتے ہیں مثلاً ایک شخص ظالم بادشاہ کے آگے حق بات کہنے کو بہادری جبکہ دوسرا شخص حماقت سمجھ سکتا ہے۔یہی معاملہ دیگر انسانی صفات کے ساتھ بھی ہے،سخاوت کب اسراف بن جاتی ہے،شجاعت کب حماقت ٹھہرتی ہے اور محبت کب مصیبت بن جاتی ہے،یہ وہ ابہام ہے جو الہام و وجدان کے ذریعہ دور نہیں ہو سکتا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس کمی کو خارجی طور پر انبیاء کو مبعوث کر کے پورا کیا۔وہ انسانی معاشرے جو خدائی نظام (نبوت وغیرہ) کے قائل نہیں ہیں وہ اس کمی کو اپنے دانشوروں، مقننین یا مصلحین سے پورا کرتے ہیں۔

انسانی معاشروں کو بنیادی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ملحد معاشرے: جس سے تعلق رکھنے والے خدا کے وجود کے منکر ہیں۔

۲۔ خدا پرست معاشرے: وہ جو خدا کے وجود کے قائل ہیں،ان کی مزید تقسیم کی جا سکتی ہے۔

الف مشرک معاشرے: جو خدا کے وجود کے قائل ہیں مگر موحد نہیں ہیں۔

ب موحد معاشرے: وہ جو صرف ایک خدا کے قائل ہیں

ان میں سے ہر ایک گروہ انسانی کے حیات و کائنات کے بارے میں اپنے مخصوص نظریات ہیں جنھیں ان کا نظام فکر یا تہذیب کہا جا سکتا ہے۔یہی نظریات ان کے اخلاقی تصورات کو جنم دیتے ہیں،جس پر مبنی ان کے اپنے اپنے اخلاقی نظام ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

ایک مکمل اخلاقی نظام کے لیے ضروری ہے کہ وہ فلسفہ اخلاق کے حوالے سے پیش کردہ کم از کم چار بنیادی سوالات کے جواب فراہم کرے۔

پہلا سوال: انسان اور کائنات کے بارے میں اس کے تصورات کیا ہیں؟

دوسرا سوال: فطرت (الہام یا وجدان) کے علاوہ خیر وشر کی شناخت کا اس کے پاس کیا ذریعہ یا مآخذ ہے؟

تیسرا سوال: انسانوں کو خیر کی طرف مائل کرانے اور شر سے اجتناب کرنے کے لیے کیا محرکات ہیں؟

چوتھا سوال: اخلاقی قوانین کے نفاذ کے لیے اس کے پاس کیا قوت یا صلاحیت (قوت نافذہ) ہے

اب یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ اسلام ان بنیادی سوالات کے کیا جواب فراہم کرتا ہے۔ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، قرآن، خدا، انسان اور کائنات کے بارے میں بڑے واضح تصورات اپنے پیروکاروں کو دیتا ہے۔ جہاں تک خدا کے تصور کا تعلق ہے، وہ ''الوہیت'' کا ایسا مکمل اور جامع تصور پیش کرتا ہے جو دنیا کے کسی دوسرے مذہب یا نظریہ میں نہیں ہے۔

لا الہ الا اللہ کا مطب یہ ہے کہ: ''الوہیت'' کو کائنات کی جملہ اشیاء سے سلب کر کے صرف ایک ذات کے لیے ثابت کیا جائے۔ [۵] چنانچہ الوہیت کے بارے مٰں تمام غلط یا ناقص تصورات کی تصیح اور تکمیل کرتے ہوئے قرآن بتاتا ہے کہ الہ صرف وہی ہوسکتا ہے جو یکتا، بے نیاز، صمد اور قیوم ہو، کائنات اور اس میں موجود تمام مخلوقات کا خالق ہو جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے، جو قادر مطلق اور حاکم علی الاطلاق ہو جس کا علم سب پر محیط اور رحمت سب پر وسیع اور طاقت سب پر غالب ہو۔ جس کی حکمت میں کوئی نقص نہ ہو، جس کے عدل میں ظلم کا شائبہ نہ ہو، جو زندگی بخشنے اور وسائل حیات مہیا کرنے والا ہو، جو نفع وضرر کی ساری قوتوں کا مالک ہو، اسی کو جزاوسزا کا اختیار ہو، قرآن ''الوہیت'' کی جو صفات بتاتا ہے وہ نہ تجزیہ وتقسیم کے قابل ہیں کہ ایک وقت میں بہت سے الہ ہوں اور وہ ان صفات یا ان کے ایک ایک حصہ سے متصف ہوں۔ نہ الوہیت کی یہ صفات وقتی اور زمانی ہیں کہ ایک ''الہ'' کبھی تو ان سے متصف ہو اور کبھی نہ ہو۔ نہ

یہ قابل انتقال ہیں کہ آج ایک ''الہٰ'' میں پائی جائیں اور کل دوسرے میں۔[۶]

انسان کے بارے میں قرآن یہ واضح تصور دیتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت خدا کے بندے اور نائب کی ہے۔ یہاں انسان کو جتنی چیزوں سے سابقہ پیش آتا ہے وہ سب خدا کی ملک ہیں حتیٰ کہ انسان کا اپنا جسم تک اس کی نہیں بلکہ خدا کی ملک ہے۔ خدا نے انسان کو اس کائنات کی تمام چیزوں پر تصرف کرنے کے اختیارات دے کر یہاں اپنے نائب کی حیثیت سے مامور کیا ہے اور اسی ماموریت میں اس کا امتحان ہے۔ یہ دنیا امتحان گاہ ہے، جس کا آخری اور مکمل نتیجہ آخرت میں سامنے آئے گا اور ہر انسان کو اس کے اعمال کے مطابق جزا اور سزا ملے گی۔

خدا، انسان اور کائنات کے بارے میں ان واضح تصورات کے بعد فلسفۂ اخلاق کے وہ دیگر سوالات بھی حل ہو جاتے ہیں جنھیں مختلف ادوار میں مختلف فلسفیوں نے چھیڑا۔ مثلاً فلسفۂ اخلاق کا ایک اہم سوال یہ رہا ہے کہ وہ اصل اور انتہائی بھلائی کیا ہے جس تک پہنچنا انسانی سعی و عمل کا مقصود ہونا چاہیے۔ اس سوال کا جواب کسی کے نزدیک خوشی کا حصول، کسی کے نزدیک کمال کا حصول اور کسی کے نزدیک محض فرض برائے فرض ہے۔ یعنی انسان نیکی کیوں کرے؟ اس کا جواب بعض کے نزدیک یہ ہے کہ اس سے خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن یہ مکمل جواب نہیں کیونکہ پھر یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ کونسی خوشی؟ آیا وہ جو جسمانی اور نفسانی خواہشات کے پورا ہونے سے حاصل ہوتی ہے یا وہ جو ذہنی ترقی کے مدارج طے کرنے سے حاصل ہوتی ہے، نیز کس کی خوشی؟ آیا ہر شخص کی ذاتی خوشی، یا اس جماعت کی خوشی جس سے وہ انسان وابستہ ہے، یا تمام انسانوں کی خوشی یا فی الجملہ دوسروں کی خوشی؟

اسی طرح کمال کو مقصود قرار دینے والوں کے لیے بھی بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں یہ کہ کمال کا تصور اور اس کا معیار کیا ہے اور کمال کس کا مقصود ہے۔ فرد کا، جماعت کا یا انسانیت کا؟ اسی طرح جو لوگ فرض برائے فرض کے قائل ہیں اور ایک غیر مشروط واجب

اطاعت قانون فرض (Catagorical Imperative) کی بے چوں و چرا اطاعت ہی کو سب سے بڑی بھلائی قرار دیتے ہیں ان کے لیے بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قانون فی الواقع ہے کیا؟ کس نے اس کو بنایا؟ اور کس کا قانون ہونے کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت ہے۔[۷]

اس کے مقابلہ میں قرآن، خدا، انسان اور کائنات کے بارے میں جو تصور دیتا ہے اس کی بنیاد پر بلند ترین بھلائی جو کسی انسان کا مقصود ہونا چاہیے وہ اطاعت کے ذریعہ خدا کی رضا کا حصول اور آخرت کی کامیابی ہونا چاہیے۔ چنانچہ اسلامی نظام اخلاق میں کسی طرز عمل کے صحیح یا غلط ہونے کا دارو مدار اس امر پر ہے کہ وہ اس بھلائی کے حصول میں کہاں تک مددگار یا مانع ہے۔

اس طرح یہ بات بھی یہیں سے متعین ہو جاتی ہے کہ انسان کے لیے خیر و شر اور نیک و بد کی شناخت کا ذریعہ (فطرت کے علاوہ) ''وحی الٰہی'' ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے ذرائع مثلاً انسانیت کا تجربہ، علم، عقل وغیرہ اصل ماخذ (وحی) کے مددگار تو بن سکتے ہیں مگر خود اصل ماخذ نہیں ہیں۔ یہ فلسفہ اخلاق کا دوسرا بڑا سوال ہے کہ (وجدان کے علاوہ) ہمارے پاس خیر و شر کو جاننے کا ذریعہ یا ماخذ کیا ہونا چاہیے؟ اسلام ہمیں ایک متعین ماخذ دیتا ہے (یعنی قرآن اور سنت) جس سے ہر حال اور ہر زمانے میں اخلاقی ہدایات حاصل کی جا سکتی ہیں جو خانگی زندگی کے معمولی معاملات سے لے کر بین الاقوامی سیاست کے بڑے سے بڑے مسائل تک میں راہنمائی کرتی ہیں۔ ان کے اندر معاملات زندگی پر اخلاق کے اصولوں کا وہ وسیع ترین انطباق (Wider application) پایا جاتا ہے جو کسی مرحلہ پر کسی دوسرے ذریعہ علم کی ضرورت نہیں ہونے دیتا۔[۸]

اسی سوال کے دیگر نظام ہائے حیات میں دوسرے جوابات دیئے گئے ہیں۔ بعض کے نزدیک وہ خیر و شر کو جاننے کا ذریعہ ''انسانیت کا تجربہ'' ہے۔

کسی کے نزدیک قوانین حیات کا علم ہے اور کسی کے نزدیک انسانی عقل۔ دنیا کے مختلف اخلاقی نظام انہی ذراءع پر انحصار کرتے ہیں۔ چنانچہ کسی اخلاقی نظام میں انسانیت کے تجربے کو اہمیت دی جاتی ہے کہیں قوانین حیات کے علم کو اور کہیں فقط عقل کو لیکن یہ تینوں ذرائع ناقص ہیں۔

انسانیت کے تجربے سے صحیح علم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے متعلق مکمل اور مفصل معلومات یکجا ہوں اور کوئی کامل متوازن ذہن کا حامل ان سے نتائج اخذ کرے۔ جبکہ عملی زندگی میں یہ دونوں مثالی چیزیں نہیں۔ اول تو انسانیت کا تجربہ ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ جاری ہے پھر اب تک کا جو تجربہ ہے اس کے بھی مختلف اجزاء مختلف لوگوں کے سامنے ہیں اور وہ مختلف طور پر اپنی ذہانت اور ذہنیت کے مطابق ان سے نتائج نکال رہے ہیں۔ لہذا یہ ذریعہ یا ماخذ مستقل اور مکمل نہیں ہے۔

یہی معاملہ علم اور عقل کا ہے نہ کوئی دانشور اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسے قوانین حیات اور حالات کا مکمل علم حاصل ہے اور نہ ہی کوئی عاقل، اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ عقل کل ہے۔ علم اور عقل دونوں ناکافی ذرائع ہیں۔

جہاں تک تیسرے سوال کا تعلق ہے تو اسلام کا یہ تصور کائنات وانسان وہ محرکات بھی فراہم کرتا ہے جو انسان کو قانون اخلاق کے مطابق عمل کرنے کے لیے ابھارتے ہیں۔ انسان کا اس بات پر راضی ہو جانا کہ وہ اللہ کو مانے اور اس کی بندگی اور رضا کو اپنا مقصد زندگی بنائے، اس بات کے لیے کافی محرک ہے کہ وہ ان احکام کی اطاعت کرے جن کے متعلق اسے یقین ہو کہ وہ خدا کے احکام ہیں۔ آخرت کا عقیدہ دوسرا طاقتور محرک ہے کہ جو شخص احکام الٰہی کی اطاعت کرے گا اس کے لیے ابدی زندگی میں ایک شاندار مستقبل یقینی ہے، خواہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں اسے کتنی ہی مشکلات، نقصانات اور تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑے۔ اس کے برعکس جو اس دنیا میں خدا کی نافرمانیاں کرے گا اور اطاعت کی جگہ سرکشی کا رویہ اختیار کرے گا اسے آخرت میں شدید سزا بھگتنی پڑے گی خواہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں وہ کیسے ہی مزے لوٹ

لے، یہ امید اور خوف ایسی زبردست قوت محرکہ ہے جو انسانوں کو ایسے موقع پر بھی نیکی پر آمادہ کر سکتی ہے جہاں نیکی کا نتیجہ دنیا میں بظاہر سخت نقصان دہ نظر آ رہا ہو۔ اسی طرح یہ قوت محرکہ انسانوں کو ان مواقع پر بھی بدی کے ارتکاب سے روک سکتی ہے جہاں بدی نہایت ہی پُر لطف اور نفع بخش ہو۔[۹]

فلسفۂ اخلاق کا چوتھا بنیادی سوال یہ ہے کہ قانونِ اخلاق کے پیچھے وہ کونسی قوت ہے جس کے زور سے یہ قانون نافذ ہو؟ اس کے جواب میں مسرت اور کمال کو اصل بھلائی جاننے والے کہتے ہیں کہ خوشی یا کمال کی طرف لے جانے والی بھلائیاں اپنے اندر ایسی داخلی قوت رکھتی ہیں کہ انسان ان کی پیروی کرتا ہے نیز رنج اور پستی کی طرف لے جانے والی برائیوں میں اجتناب کی ایسی داخلی قوت ہوتی ہے کہ انسان خود ہی ان سے رک جاتا ہے۔ اس نظریہ کے حامل لوگوں کے نزدیک قانون اخلاق پر عمل درآمد کرانے کے لیے کسی خارجی قوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسرا گروہ جو قانون فرض کا ماننے والا ہے کہتا ہے کہ قانون فرض چونکہ ارادی طور پر انسان نے اپنے اوپر عائد کیا ہے لہٰذا اس کی پیروی کرانے کے لیے کسی خارجی دباؤ کی ضرورت نہیں۔ ان دونوں نظریات نے انفرادی خودسری اور بے راہ روی یہاں تک بڑھا دی کہ ایک صالح اور انسانیت نواز معاشرہ کا قیام مزید دشوار ہو گیا۔

اسی ضمن میں تیسرا گروہ سیاسی اقتدار کو قانون اخلاق کے لیے اصل قوت نافذہ سمجھتا ہے، اور چوتھا گروہ معاشرے کے دباؤ کو۔ ان دونوں خارجی قوتوں کی اپنی اپنی اہمیت ہے لیکن دونوں ہی مکمل نہیں بلکہ ناقص ہیں۔ کسی شخص کی برائی سے اس لیے بچنا کہ معاشرہ اسے برا سمجھتا ہے یا حکومت کی طرف سے گرفت کا خطرہ ہے نظام اخلاق کے لیے ایک بہت ہی ناپائیدار بنیاد ہے جہاں تک معاشرتی دباؤ کا تعلق ہے اس کی اخلاقی حیثیت تو ہوتی ہے۔ قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔ دوسری طرف حکومت کی گرفت سے بچنے کے ہزارہا طریقے ہیں مثلاً امریکی ساحلی ریاست میں کیسینو (جوئے کے اڈے) کی تعمیر قانوناً جرم ہے۔ جوئے کے شائقین نے اس کا

یہ حل نکالا کہ ساحل پر کھڑی بڑی بڑی کشتیوں میں کیسینو کھول لیے ۔(یعنی زمین کے بجائے سمندر میں کیسینو کھول لیے جہاں امریکی ریاست کا قانون نہیں چلتا) حکومتی گرفت سے بچنے کی ایسی متعدد مثالیں یورپ اور امریکہ کے مہذب معاشروں سے پیش کی جا سکتی ہیں ۔

اس کے مقابلہ میں اسلام داخلی طور پر عقیدہ توحید اور آخرت کو اور خارجی طور پر اسلامی ریاست کو قانونِ اخلاق کے لیے قوت نافذہ کے طور پر پیش کرتا ہے ۔اس کے ساتھ ہی اسلام ایک طاقتور رائے عامہ بھی تیار کرنا چاہتا ہے جو اجتماعی زندگی میں اشخاص اور گروہوں کو اصول اخلاق کی پابندی پر مجبور کرنے والی ہو لیکن اس کا اصل اعتماد اس خارجی دباؤ پر نہیں بلکہ اس اندرونی دباؤ پر ہے جو خدا اور آخرت کے عقیدے میں مضمر ہے ۔اخلاقی احکام دینے سے پہلے اسلام اپنے ماننے والوں کے دل میں یہ بات بٹھا دیتا ہے کہ ان کا معاملہ اس قادر مطلق کے ساتھ ہے جو ہر وقت ہر جگہ انہیں دیکھ رہا ہے ۔وہ دنیا بھر سے چھپ سکتے ہیں مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتے ۔وہ صرف یہی نہیں کہ ان کے ظاہری اعمال سے باخبر ہے بلکہ ان کے دلوں کا حال اور نیتوں تک سے واقف ہے ،دنیا بھر کو (بشمول حکومت اور قانونی ادارے) دھوکہ دیا جا سکتا ہے مگر اللہ کی گرفت سے بچنا ممکن نہیں۔جس کے حضور آخرت میں پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہی ہوگا ۔یہ عقیدہ انسان کو اندر سے ان احکام کی تعمیل پر مجبور کرتا ہے جن کا اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے اور اندر سے ان امور کے کرنے پر روکتا ہے جس سے رکنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے خواہ خارجی طور پر ان احکام کی پابندی کرانے والی کوئی پولیس ،عدالت اور جیل موجود ہو یا نہ ہو ۔

المختصر اسلام اپنا تصور کائنات اپنا معیار خیر وشر ،اپنا ماخذ علم الاخلاق ،اپنی قوت نافذہ اور اپنی قوت محرکہ رکھتا ہے اور ان کے ذریعہ سے معروف اخلاقیات کے مواد کو اپنی قدروں کے مطابق ترتیب دے کر زندگی کے تمام شعبوں میں جاری کرتا ہے ۔اس بناء پر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام اپنا ایک مکمل اور مستقل بالذات اخلاقی نظام رکھتا ہے جس کی کم از کم یہ تین

اہم خصوصیات ہیں۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رضائے الٰہی کو مقصود بنا کر اخلاق کے لیے ایک بلند ترین معیار فراہم کرتا ہے۔ایک ماخذ علم مقرر کر کے اخلاق کو وہ پائیداری اور استقلال بخشتا ہے جس میں ترقی کی گنجائش تو ہے مگر تلون اور زوال کی گنجائش نہیں۔خوفِ خدا کے ذریعہ سے اخلاق کو وہ قوت نافذہ دیتا ہے جو خارجی دباؤ کے بغیر انسان سے خیر اور معروف کی پابندی کراتی ہے اور عقیدۂ توحید و آخرت کی صورت میں وہ قوت محرکہ فراہم کرتا ہے جو انسان کے اندر خود بخود قانون اخلاق پر عمل کرنے کی رغبت اور آمادگی پیدا کرتی ہے۔[۱۰]

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسلام کے اخلاقی نظام کا انطباق انسان کی خانگی اور معاشرتی زندگی کے ہر پہلو تک وسیع ہے۔انسان کا انفرادی رویہ، خانگی معاشرت،شہری زندگی، ملکی سیاست،معاشی کاروبار، مدرسہ،عدالت، پولیس، چھاونی،میدان جنگ،صلح کانفرنس غرض زندگی کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں رہ جاتا جو اخلاق کے ہمہ گیر اثر سے بچ جائے۔اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں اخلاق کو حکمران بناتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ معاملات زندگی کی باگیں، خواہشات،اغراض اور مصلحتوں کے بجائے اخلاق کے ہاتھ میں ہوں۔[۱۱]

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانیت سے ایک ایسے نظام زندگی کا مطالبہ کرتا ہے جو معروف پر قائم اور منکر سے پاک ہو اس کی دعوت یہی ہے کہ جن بھلائیوں کو انسانیت نے ہمیشہ بھلا جانا ہے اسے قائم کیا جائے اور جن اوصاف کو انسانیت نے ہمیشہ بُرا جانا ہے اسے دبایا جائے اس دعوت پر جنھوں نے لبیک کہا انہیں کو جمع کر کے اسلام نے ایک امت بنائی جس کا نام ''مسلم'' تھا۔امت مسلمہ کے قیام کی واحد غرض یہی تھی کہ دنیا میں معروف کو قائم رکھنے اور منکر کو دبانے اور مٹانے کے لیے ایک منظم سعی کی جائے۔[۱۲]

حواشی وحوالہ جات

[۱] قرآن مجید، القیامہ:۲

[۲] قرآن مجید القیامہ:۱۴۔۱۵

[۳] جیسا کہ سورۃ طٰہٰ (آیت:۵۰) میں ارشاد ہوا ہے:الذی اعطی کل شئی خلقه ثم هدی یعنی جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت عطا کی پھر راہ دکھائی۔

[۴] مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، جلد ششم، ص ۳۵۳۔۳۵۴

[۵] مودودی، سید ابوالاعلیٰ، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۱۴۹۔۱۵۰، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء

[۶] ایضاً ص ۱۵۰۔۱۵۱

[۷] مودودی، سید ابوالاعلیٰ، اسلامی نظام زندگی، ص ۴۴، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور

[۸] مودودی، سید ابوالاعلیٰ، اسلام کا اخلاقی نظام، ص ۸۱، مقالہ در اسلامی تہذیب وثقافت، پٹنہ ۱۹۹۹ء

[۹] اسلام کا اخلاقی نظام، ص ۸۲

[۱۰] ایضاً، ص ۸۲

[۱۱] ایضاً

[۱۲] ایضاً

باب بیستم

اسلام کا معاشرتی نظام

عرب کی جاہلی معاشرے میں اسلام کی دعوت ایک فکری اور ذہنی انقلاب کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ درحقیقت ایک عالمی نظام (World Order) تھا جس کے لیے ایک جماعت کی تیاری تیرہ سال تک مکہ میں کی گئی۔ یہ سابقون الاولون[1] کی جماعت تھی جنھیں سخت آزمائشوں سے گزارا گیا، انھوں نے جان، مال اور جاہ و منصب کے حوالے سے غیر معمولی قربانیاں پیش کیں۔ ان کی صورت میں رسول اللہؐ کو ایک ایسی جماعت دستیاب ہوگئی جو فکر، عقائد اور ایمانیات کے حوالے سے بہت مضبوط تھی۔ ان کا یقین پختہ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی نے انھیں وہ نظم و ضبط، قوت ایمانی اور مقصد کے ساتھ غیر مشروط وابستگی عطا کر دی تھی، کہ وہ اسلام کے پیش کردہ عالمی نظام کے قیام میں مدد کر سکتے تھے۔

اس عالمی نظام کا آغاز مدینہ میں ہوا جہاں ایک اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاست کا قیام پہلو بہ پہلو کیا گیا۔ ریاست اور معاشرے میں تقدم کے حوالے سے دانشوروں کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اسلامی ریاست (Islamic State) کے قیام سے پہلے، ضروری ہے کہ اسلامی معاشرہ (Islamic Society) قائم کیا جائے تاکہ صالح افراد تیار کر کے سیاسی اداروں میں بھیجے جا سکیں، اسلامی معاشرہ ہی نہیں ہوگا تو اسلامی ریاست کیسے قائم کی جا سکے گی؟ جبکہ دانشوروں کے دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اسلامی ریاست قائم کر کے معاشرہ کو اسلامی اقدار کا پابند کیا جا سکے گا اور مطلوبہ نتائج حاصل کیے جا سکیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں کام پہلو بہ پہلو کیے۔ یہ درست ہے کہ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام سے پہلے مکہ میں تیرہ سال تک افراد کی ایک جماعت کو تیار کیا جاتا

رہا، یہ بھی درست ہے کہ مدینہ ہجرت سے قبل وہاں مسلم داعی بھیجے گئے جنھوں نے مدنی معاشرہ میں کم از کم اسلام کی قبولیت کے لیے ایک سازگار ماحول ضرور پیدا کر دیا تھا، لیکن کمیت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مکہ سے مدینہ، ہجرت کرنے والوں کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ تھی یہ گویا بہت بڑی جماعت نہیں تھی، اسی طرح اسلام سے روشناسی کا عمل مدینہ میں ہجرت سے فقط دو برس قبل ہی شروع کیا گیا تھا، اور یہ کوئی بہت طویل عرصہ نہیں تھا لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ رسول اللہ نے مدینہ میں ایک معاشرتی انقلاب اور ایک اسلامی ریاست کا قیام پہلو بہ پہلو کیا۔

قرآن نے اسلامی تہذیب کے قیام کے لیے جو فکری بنیادیں (یعنی عقائد و ایمانیات) دیں، اس پر مبنی مدینہ میں جو اسلامی معاشرہ قائم کیا گیا، وہ دیگر نسلی، وطنی اور قومی معاشروں کے برعکس، ایک فکری اور نظریاتی معاشرہ تھا۔ اس معاشرے میں ابتدا سے ہی مسلمانوں کو ان لوگوں سے سابقہ پیش آیا جو نظریاتی اعتبار سے مسلمانوں سے بُعد رکھتے تھے، یعنی مشرکین اور یہود و نصاریٰ وغیرہ، مسلمانوں نے ان کو اپنے معاشرتی نظام میں ایک عادلانہ مقام دیا، ایسا کرنا مسلمانوں کے لیے یوں آسان ہوگیا کہ کیونکہ قرآن نسلی وحدت کا تصور دیتا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدہ و خلق منھا زوجھا وبث منھما رجالاً کثیراً ونساءً (النساء۔۱)

(ترجمہ: اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک وجود سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں)

اس آیت سے یہ اصول وضع ہوتا ہے کہ تمام انسان جنس واحدہ سے پیدا ہوئے لہٰذا ان میں ایک نسلی وحدت ہے۔ اللہ نے سب سے پہلے ایک انسانی جوڑا (آدم وحوا) پیدا کیا، پھر اسی جوڑے سے وہ اربوں افراد پیدا ہوئے جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ابتدا میں حضرت آدم اور بی بی

حوا کی اولاد ایک امت کی حیثیت رکھتی تھی جن میں ہر طرح کی نسلی، لسانی اور دینی وحدت تھی، پھر جیسے جیسے ان کی تعداد بڑھتی گئی وہ زمین کے مختلف خطوں میں پھیلتے چلے گئے، ان کی ابتدائی ہجرتوں کا بڑا سبب معاشی رہا ہوگا، اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ان کی بولیوں میں فرق پڑا، ان کے لباس اور رہن سہن کے طریقے مختلف ہو گئے ۔ جغرافیائی عامل نے اپنا کردار ادا کیا اور ان کے رنگ روپ اور خدو خال تک بدل گئے ، اور یوں وہ مختلف نسلوں، گروہوں اور قوموں میں تقسیم ہو گئے ۔ صدیوں میں ہونے والے یہ اختلافات فطری اور واقعاتی ہیں اس لیے اسلام ان کو بطور ایک واقعہ کے تسلیم کرتا ہے اور ان کو مٹانا نہیں چاہتا بلکہ ان اختلافات کو شناخت کا ذریعہ سمجھتا ہے ۔

یاایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ وجعلنکم شعوباً وّ قبائل لتعارفوا ط ان اکرمکم عنداللہ اتقکم . (الحجرات ۔۱۳)

(ترجمہ: لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو ۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے)

یعنی نسلی ،قومی یا شعوب و قبائل کا اختلاف محض تعارف اور شناخت کے لیے ہے ۔ ایک دوسرے پر فخر کرنے یا ایک دوسرے سے لڑنے کے لیے نہیں ہے، انسان کو اپنی اصل نہیں بھولنی چاہئے اور انسان کی اصل یہی ہے کہ وہ اولاد آدم ہے اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے ۔ فتح مکہ کے دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا، اس میں فرمایا:

''اے قریش! جاہلیت کی نخوت اور اپنے آباء واجداد پر فخر وغرور کو اپنے سے دور کر دو ۔ کیونکہ تمام انسانوں کے باپ آدم تھے اور آدم مٹی سے بنے تھے'' ۔ [۲]

خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ نے فرمایا:

''اے لوگو! تمہارا رب ایک ،تمہارا مورث اعلیٰ ایک ،تم سب آدم کی اولاد سے ہو،

اور آدم کا خمیر مٹی سے اٹھا تھا۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے، کسی عربی کو کسی عجمی [۳] پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ فوقیت ہے تو صرف تقویٰ کی بنیاد پر۔'' [۴]

انسانوں میں نسل، رنگ، قومیت، وطنیت اور زبان کے حوالے سے جو تعصبات پیدا ہو گئے ہیں، وہ اسلام کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ اسلام انسانوں کے مابین پیدائش کی بنیاد پر اونچ نیچ یا نسب کی بنیاد پر طبقاتی تفریق کو رد کرتا ہے، اور تمام انسانوں کو نسلی اعتبار سے ایک مانتا ہے۔

اسلام کے پیش کردہ اس عالمگیر تصور انسانیت میں صرف ایک فرق کو مانا جا سکتا ہے اور وہ ہے فکری تفاوت جسے عقائد یا ایمانیات بھی کہا جا سکتا ہے۔ یعنی انسانوں کے مابین اگر کوئی اصلی فرق ہو سکتا ہے تو وہ نسل، رنگ، وطن یا زبان کا نہیں بلکہ فکر و نظریات کا ہو سکتا ہے۔ ایک ماں کے دو بچے اپنے نسب کے اعتبار سے ایک ہو سکتے ہیں لیکن اگر زندگی کے بارے میں ان کے نظریات مختلف ہیں تو ان کے اخلاق اور تہذیبی رویے میں زمین و آسمان کا فرق آ سکتا ہے، اور فی الواقع وہ دو مختلف تہذیبوں کی نمائندگی کرنے والے ہوں گے۔ اس کے برعکس مشرق و مغرب کے انتہائی فاصلوں پر رہنے والے دو انسان اگرچہ نسلی، وطنی اور قومی اعتبار سے ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں اگر ان کے نظریات یکساں ہیں تو وہ ایک فکری وحدت بنائیں گے، جسے اسلام ''امت'' کا نام دیتا ہے۔

اس نظریے کی بنیاد پر اسلام دنیا کے تمام نسلی، وطنی اور قومی معاشروں کے برعکس ایک فکری اور نظریاتی معاشرہ کا تصور دیتا ہے جس میں انسانوں کے باہم ملنے کی بنیاد نسل یا وطن یا قوم نہیں بلکہ اس کے عقائد و نظریات ہیں، ہر وہ شخص جو توحید، رسالت اور آخرت پر یقین رکھتا ہو، اس معاشرہ میں شامل ہو سکتا ہے خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، کالا ہو یا گورا، آزاد ہو یا غلام۔ اسلام ان سب کو یکساں حقوق عطا کرتا ہے اور انہیں ایک ہی معاشرتی مرتبے پر فائز کرتا ہے، لہٰذا اسلامی معاشروں میں طبقات کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس معاشرہ میں اگر کسی کو برتری یا تفوق

حاصل ہوسکتا ہے تو وہ صرف تقویٰ کی بنیاد پر۔ مدینہ میں جب رسول اللہ کی تعلیمات کے نتیجے میں ایک اسلامی معاشرہ ابھرا تو وہ انہی خصوصیات کا حامل تھا، رسول اللہ نے حتمی طور پر یہ اعلان فرمادیا تھا کہ حسب نسب اب کسی کے کام نہیں آسکیں گے، اصل چیز تقویٰ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلی عصبیت اور آباء پر فخر کا طریقہ ختم کردیا ہے۔ اب یا تو کوئی متقی مومن ہوگا یا فاجر شقی، تمام لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، بجز تقویٰ کے۔'' [۵]

رسول اللہ اپنے خاندان اور قبیلہ پر بھی اس معاملہ میں سخت تھے کہ مبادا رسول اللہ سے نسبت ان میں بے جا فخر وغرور کے جذبات پیدا کردے اور وہ اسلامی مساوات کے اس راستے سے ہٹ جائیں جس کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے، ایک موقع پر اپنے افراد خانہ کو مخاطب کر کے آپ نے فرمایا تھا: ''اے آل محمد! ایسا نہ ہو کہ لوگ میرے پاس نیک اعمال لے کر آئیں اور تم حسب نسب لے کر آد، تم عمل کرو، میں تمہیں اللہ کی گرفت سے نہیں بچا سکتا۔'' [۶]

قرآن اور رسول اللہ کے ان بیانات کی روشنی میں یہ اصول متعین کیا جاسکتا ہے کہ اسلام تمام مسلمانوں کے درمیان معاشرتی مساوات کا قائل ہے۔ وہ مسلمانوں کو طبقات میں تقسیم کرنا نہیں چاہتا بلکہ انہیں ''امت واحدہ'' کے طور پر دیکھتا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر قرآن ان کے بارے میں کیا کہتا ہے جو نظریاتی طور پر مختلف ہیں (یعنی غیر مسلم ہیں) اس کا جواب پہلے دیا جاچکا ہے یہاں پر وضاحت کی جاتی ہے کہ اسلام ان کے ساتھ انسانی برادری کے حوالے سے تعلقات قائم کرنے اور انسانیت کے حقوق عطا کرنے پر زور دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ماں کے دو بچے اگر اپنے خیالات ونظریات میں مختلف ہیں تو ان کے طریق زندگی میں تو بہر حال فرق آئے گا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ

وہ ایک دوسرے کے بھائی نہیں رہے۔ بالکل اسی طرح اولادِ آدم میں اگر نظریاتی تفریق نے انہیں دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان سے آدمیت اور انسانیت کے تعلقات منقطع ہو گئے ہوں۔ اسوۂ نبوی سے اس کی مثال میثاق مدینہ کی دی جا سکتی ہے جس کے ذریعہ آپ نے یہودِ مدینہ کے ساتھ شہریت میں اشتراک کیا

○○○○○

ہر انسانی معاشرہ چند اداروں پر قائم ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ کے اہم اداروں میں خاندان، برادری، پڑوس (محلّہ) وغیرہ شامل ہیں۔

اسلامی معاشرت میں سب سے بنیادی اور اہم ادارہ "خاندان" ہے۔ یہ ادارہ تمدن انسانی کی بقا اور نشو ونما کا ضامن ہے۔ قرآن اس ادارہ کی اہمیت کے پیش نظر "خاندانی نظام" کے بارے میں بڑے واضح اصول متعین کرتا ہے مثلاً

خاندان کی بنیاد ایک مرد اور عورت کے ملنے سے پڑتی ہے۔ مرد اور عورت کے مابین اس تعلق کی صرف ایک صورت اسلام کے نزدیک جائز ہے اور وہ نکاح ہے۔ یہ ایک ایسا ذمہ دارانہ تعلق ہے جسے اسلام محض جائز ہی نہیں بلکہ ایک نیکی، ایک کارِ ثواب اور ایک عبادت قرار دیتا ہے۔ سن بلوغ کے بعد مرد اور عورت کے مجرد رہنے کو ناپسند کرتا ہے۔ اسلام رہبانیت کو نیکی نہیں سمجھتا بلکہ اسے فطرت سے بغاوت قرار دیتا ہے۔ نکاح کے علاوہ مرد و زن کے تعلق (زنا) کو حرام اور قانونی جرم قرار دیتا ہے۔ اس کے لیے سخت سزا تجویز کرتا ہے تاکہ معاشرہ میں ایسے تمدن کش تعلقات فروغ نہ پا سکیں بلکہ وہ معاشرے سے ان محرکات کا بھی خاتمہ کر دینا چاہتا ہے جو اس ناجائز تعلق کا سبب بن سکیں، یا اس کے مواقع پیدا کرتے ہوں۔ [۷] پردے کے احکام [۸] مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول کی ممانعت، موسیقی اور گانا بجانا [۹] مخلوط مجالس اور دیگر فواحش کی روک تھام کے پیچھے یہی بنیادی مقصد کارفرما ہے کہ اسلام، خاندان کے ادارہ

کومحفوظ اور مضبوط کرنا چاہتا ہے۔

خاندان کے اندر اسلام نے مرد کو ناظم کی حیثیت دی ہے اور اسے اپنی رعیت (یعنی بیوی، بچوں اور وہ جو اس کی کفالت میں ہیں) کا ذمہ دار بنایا ہے۔ یہ مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ خاندان کی معاشی ضروریات بھی پوری کرے اور خاندانی نظام میں انضباط پیدا کرے، اور اپنے اہل خانہ کی بہترین تعلیم و تربیت اور حفاظت کرے۔[۱۰] عورت (بیوی) کو ایک طرف شوہر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے دوسری طرف مرد کی غیر موجودگی میں اس کے گھر اور اہل کفالت افراد کی دیکھ بھال کا ذمہ دار بنایا گیا ہے، اس سلسلہ میں حقوق و فرائض کا تعین کر دیا گیا ہے تا کہ خاندانی نظام انتشار کا شکار نہ ہو۔

قرآن کہتا ہے:

''مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔ سو جو عورتیں نیک ہیں، اطاعت کرتی ہیں۔ مردوں کی عدم موجودگی میں اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہیں۔'' (النساء۔۳۴)

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ قرآن نے شخصی اعتبار سے مرد اور عورت کا ذکر مساویانہ حیثیت سے کیا ہے اور فضائل و خصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی تفریق نہیں کرتا۔ سورۂ نساء میں جہاں ازدواجی زندگی کے احکام کی تشریح ہے وہاں صاف صاف تشریح کر دی ہے کہ فضائل و محاسن کے لحاظ سے دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی راہیں رکھتے ہیں۔

للرجال نصیب مما اکتسبوا و للنسآء نصیب مما اکتسبن

(النساء۔)

ترجمہ: مردوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و

نتائج میں) ان کا حصہ ہے اور عورتوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات ونتائج میں) ان کا حصہ ہے۔

تاہم جب مرد اور عورت میں نکاح کے ذریعہ ایک تعلق قائم ہوتا ہے، اور ایک خاندان کی بنیاد پڑتی ہے تو مرد کو اس کی فطری موزونیت کی وجہ سے ناظم کی حیثیت دیتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ مرد کو گھر کا ایک جابر حکمران بنا دیا گیا ہے اور عورت ایک بے بس لونڈی کی حیثیت سے اس کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اسلام کے نزدیک ازدواجی زندگی کی اصل روح محبت اور رحمت ہے۔ عورت کا فرض اگر شوہر کی اطاعت ہے تو مرد کا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے اختیارات کو اصلاح کے لیے استعمال کرے۔ اسلام ایک ازدواجی تعلق کو اسی وقت تک باقی رکھنا چاہتا ہے جب تک اس میں محبت کی شیرینی یا کم از کم رفاقت کا امکان باقی ہو۔ جہاں یہ امکان باقی نہ رہے وہاں وہ مرد کو طلاق اور عورت کو خلع کا حق دیتا ہے اور بعض صورتوں میں اسلامی عدالت کو یہ اختیارات عطا کرتا ہے کہ وہ ایسے نکاح کو توڑ دے جو رحمت کے بجائے زحمت بن گیا ہو۔ [11] تاہم رسول اللہ کے نزدیک طلاق ''ابغض المباحات'' یعنی مباح امور میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ''خاندان'' کو اسلام میں کس قدر اہمیت حاصل ہے۔

خاندان کے بعد قرابت داروں اور رشتہ داروں پر مبنی برادری کا ادارہ اہم ہے جو لوگ خونی یا صہری تعلق سے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں، اسلام ان کو ایک دوسرے کا خیر خواہ اور ہمدرد دیکھنا چاہتا ہے لہٰذا قرآن میں جگہ جگہ ذوی القربیٰ یعنی رشتہ داروں سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ احادیث میں بھی صلۂ رحمی کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسے بڑی نیکی شمار کیا گیا ہے۔

اسلامی معاشرت میں ''ہمسائیگی'' کے تعلق کی حفاظت کی بھی تلقین کی گئی ہے۔ قرآن کی رو سے ہمسایوں کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں۔

۱ ایک رشتہ دار ہمسایہ

۲ دوسرا اجنبی ہمسایہ

۳ تیسرا عارضی ہمسایہ

جو ہمسایہ رشتہ دار بھی ہو ظاہر ہے اس کے حقوق بھی زیادہ ہوں گے ،لیکن اجنبی ہمسایہ کے علاوہ ان لوگوں کے ساتھ بھی اسلام حسن سلوک کی تاکید کرتا ہے جن سے تھوڑی دیر کے لیے ہمسائیگی رہتی ہے مثلاً دوران سفر، انتظار گاہوں میں، اسکول ، مدرسہ یا مارکیٹ میں کسی کے ساتھ تھوڑی دیر کی ہمسائیگی کو بھی نبھانے کی تاکید آئی ہے۔

رسول اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے ہمسایوں کے حقوق کی اتنی تاکید کی گئی ہے کہ میں خیال کرنے لگا کہ شاید اب انہیں وراثت میں بھی حصہ دار بنایا جائے گا۔آپ کے فرمان کے مطابق وہ شخص مومن نہیں ہے جس کا ہمسایہ اس کی شرارتوں سے امن میں نہ ہو۔ایک موقع پر آپ نے فرمایا: ''وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا رہ جائے۔'' خیالِ خاطرِ احباب کی انتہا یہ ہے کہ رسول اللہ نے یہاں تک تاکید فرمائی کہ اگر اپنے بچوں کے لیے پھل لاؤ تو یا تو ہمسائے کے گھر بھی بھیجو ورنہ کم از کم چھلکے باہر نہ پھینکو تا کہ غریب ہمسائے کا دل نہ دکھے۔الغرض پڑوسیوں کے مابین اسلام ایسی حسن معاشرت کی تاکید کرتا ہے کہ پڑوسی ایک دوسرے کے ضامن اور مددگار بن جائیں ،ایک دوسرے کے پہلو میں اپنی جان و مال ،عزت و آبرو کو محفوظ سمجھیں۔

پڑوس اور محلّہ کے بعد وسیع تر معاشرتی دائرے میں آتے ہیں۔قرآن ان اجتماعی معاشرت کے لیے بڑے واضح اصول متعین کرتا ہے۔یہ اصول قرآن میں جا بجا موجود ہیں۔سورۃ الحجرات میں اسلام کی پیش کردہ معاشرتی تعلیمات کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔اس سورت میں مسلمانوں کو ان بُرائیوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے جو اجتماعی و معاشرتی زندگی میں فساد برپا کرتی ہیں اور جن کی وجہ سے آپس کے تعلقات خراب ہوتے ہیں۔

قرآن مجید کی دوسورتوں یعنی سورۂ الانعام اور سورۂ بنی اسرائیل میں وہ بڑے بڑے بنیادی اصول پیش کیے گئے ہیں جن پر اسلام معاشرتی نظام کی عمارت قائم کرنا چاہتا ہے۔ سورۂ انعام مکی زندگی کے اواخر میں نازل ہوئی۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ یہ پوری سورہ مکہ میں بیک وقت نازل ہوئی۔ اس وقت رسول اللہ کو اسلام کی طرف دعوت دیتے بارہ سال گزر چکے تھے۔ اسلام قبول کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد قریش کے ظلم وستم سے تنگ آ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر چکی تھی اور مدینہ میں بھی اسلام کی دعوت پہنچ چکی تھی۔ ہجرت مدینہ سے ذرا پہلے سورۂ انعام نازل ہوئی۔ [۱۲] جس میں ان بڑے بڑے اخلاقی اصولوں کی تعلیم دی گئی ہے جن پر اسلام، ایک معاشرہ کی بنیاد اٹھانا چاہتا ہے۔

قرآن کہتا ہے:۔

''اے محمد! ان سے کہو آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں:

۱۔ یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو

۲۔ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو [۱۳]

۳۔ اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے

۴۔ اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی

۵۔ اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے، ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ [۱۴]

یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔

۶۔ اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ رشد کو پہنچ جائے۔

۷۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے۔

۸۔ اور جب بات کہو، انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔

۹۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔

ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے شائد کہ تم نصیحت قبول کرو۔

۱۰ نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ، یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو، اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اس راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے، شائد کہ تم کج روی سے بچو۔

(الانعام۔۱۵۱تا۱۵۳)

اسی طرح سورہ بنی اسرائیل ہے جو قریب قریب اسی زمانے میں نازل ہوئی جب سورۂ انعام نازل ہوئی تھی۔سورۂ بنی اسرائیل معراج کے موقع پر نازل ہوئی۔معراج کا واقعہ حدیث اور سیرت کی اکثر روایات کے مطابق ہجرتِ مدینہ سے ایک سال پہلے پیش آیا تھا گویا سورۂ الانعام کی طرح سورۂ بنی اسرائیل بھی مکی دور کے آخری زمانے میں نازل ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ کو اسلام کی دعوت دیتے بارہ برس کا عرصہ گزر چکا تھا اور مدینہ میں اوس وخزرج کے طاقتور قبیلوں میں ایک بڑی تعداد رسول اللہ کی حامی بن چکی تھی۔ہجرتِ مدینہ کا وقت قریب آرہا تھا، جو مدینہ میں ایک اسلامی ریاست اور ایک اسلامی معاشرہ کے قیام کا اہم ترین وقت تھا اس سورہ میں ایک بار پھر اسلامی فکر (عقائد وایمانیات) کے لیے دلائل دیئے گئے ہیں، نیز وہ بڑے بڑے تمدنی اور معاشرتی اصول بیان کیے گئے ہیں جن پر آگے چل کر ایک اسلامی معاشرہ کو قائم کرنا مقصود تھا یہ گویا اسلامی ریاست ومعاشرت کا ایک منشور تھا جو اسلامی ریاست کے قیام سے ایک سال قبل اہل عرب کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔قرآن کہتا ہے:۔

تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ:

۱۔ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اس کی

۲۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں

بوڑھے ہوکر رہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو۔ نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو" پروردگار ان پر رحم فرما، جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔" تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے، اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لیے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہوکر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔

۳۔ رشتہ دار کو اس کا حق دو، اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق

۴۔ فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

۵۔ اگر ان سے (یعنی ضرورت مند رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں سے) تمہیں کترانا ہو، اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اس رحمت کو جس کے تم امیدوار ہو، تلاش کر رہے ہو تو انہیں نرم جواب دے دو۔

۶۔ نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔

۷۔ اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی، درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔

۸۔ زنا کے قریب نہ پھٹکو، وہ بہت بُرا فعل ہے اور بڑا ہی بُرا راستہ

۹۔ قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو، جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔ مگر حق کے ساتھ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے۔ پس چاہئے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اس کی مدد کی جائے گی۔

۱۰۔ مال یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے۔

۱۱۔ عہد کی پابندی کرو، بے شک عہد کے بارے میں تم کو جوابدہی کرنی ہوگی۔

۱۲۔ پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو، تو لو تو ٹھیک ترازو سے تولو، یہ اچھا طریقہ ہے اور بہ لحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے۔

۱۳۔ کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی سے باز پرس ہونی ہے۔

۱۴۔ زمین میں اکڑ کر نہ چلو، نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ ان امور میں سے ہر ایک کا بُرا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں۔

(بنی اسرائیل۔۲۳ تا ۳۹)

اسلام معاشرتی نظام کی بہتر ترقی کے لیے حقوق و فرائض کا ایک باقاعدہ نظام دیتا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اس کا تحفظ کرتا ہے۔ اسلامی معاشرہ کی دو اہم خصوصیات ہیں۔

۱۔ عدل

۲۔ احسان

عدل سے مراد ہے توازن اور تناسب، ایک اسلامی معاشرہ عادلانہ معاشرہ ہوگا، جہاں لوگوں کے درمیان حقوق و فرائض میں توازن اور تناسب ہوگا۔ انسانوں کے ذاتی معاملات سے لے کر اجتماعی معاملات تک ہر معاملہ میں عدل پیش نظر رکھا جائے گا۔ یہ کم از کم مطلوبہ معیار ہے۔

اس سے اگلا درجہ احسان کا ہے یعنی حقدار کو اس کے حق سے زیادہ دینا اور خود اپنے

حق سے کچھ کم پر راضی ہو جانا، یہ فیاضانہ معاملہ ہی احسان ہے۔عدل اگر معاشرے کی بنیاد ہے تو احسان اس کا جمال اور کمال ہے ۔عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوش گواریاں اور شیرنیاں پیدا کرتا ہے،کوئی انسانی معاشرہ صرف اس بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کر دیکھتا رہے کہ اس کا حق کیا ہے اور اسے وصول کر کے چھوڑے،اور دوسرے کا کتنا حق ہے،اسے بس اتنا ہی دے دے،ایسے ٹھنڈے اور کھرے معاشرے میں کشمکش تو نہ ہوگی مگر وہ محبت ،شکرگزاری،عالی ظرفی ،ایثار،اخلاص اور خیر خواہی کی قدروں سے بھی محروم رہے گا۔[۱۵]

قرآن کہتا ہے:۔

ان الله يامر بالعدل و الاحسان

ترجمہ: بیشک اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔ (النحل۔۹۰)

اگر دیکھا جائے تو مطلوبہ اسلامی معاشرہ انہی اصولوں پر قائم ہو سکتا ہے۔یہ صرف دل خوش کن نظریات نہیں ہیں جو کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں بلکہ رسول اللہ اور ان کے خلفا نے فی الواقع ایسا معاشرہ قائم کر کے بھی دکھایا۔

OOOOO

حواشی وحوالہ جات

[۱] سابقون الاولون مسلمانوں کا وہ گروہ تھا جو رسول اللہ پر ابتداہی میں ایمان لے آیا تاہم بعض مورخین اس دائرہ کو وسیع کرتے ہوئے ان انصار ومہاجرین پر اس اصطلاح کا اطلاق کرتے ہیں جنھوں نے دونوں قبلوں کی طرف منھ کر کے نماز پڑھی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ وہ ابتدائی مسلمان ہیں جو جنگ بدر میں شریک ہوئے اور بعض کے خیال میں سابقون الاولون وہ ہیں جو بیعت الرضوان میں شامل تھے (ابن عبدالبر، الاستیعاب، جلد۱، ص۲، ۳، ۱۰، ۱۳، ۱۴، دارالجلیل، بیروت، ۱۹۹۴ء)

[۲] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، جلد۲، ص۱۴۳، دار صادر، بیروت، ۱۹۸۵ء

ابو جعفر محمد ابن جریر طبری، تاریخ الرسل والملوک، جلد۳، ص۱۶، (طبری لکھتا ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ نے سورۂ الحجرات کی تیرھویں آیت کی تلاوت کی تھی) دارالمعارف، مصر، ۹۔۱۹۶۱ء

[۳] ''عجمی'' کے لغوی معنی کند زبان یا گونگے کے ہیں، کیونکہ غیر ممالک کے لوگ عرب میں جا کر وہاں کی زبان نہیں بول سکتے تھے، اس وجہ سے اہل عرب انہیں عجمی یعنی گونگے کہا کرتے تھے، علاوہ ازیں یہ لفظ وہ کم شائستہ اور اجنبی آدمی کے لیے بھی بولتے تھے۔ ''عجمہ'' عربی لفظ ''فصاحت'' کی ضد ہے۔ عہد جاہلیت میں چونکہ عربوں میں غیر عربوں کے مقابلے میں احساس تفاخر اور احساس برتری بہت بڑھا ہوا تھا، لہٰذا لفظ عجمی حقارت کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔

[۴] جاحظ، ابوعثمان عمرو بن بحر، البیان والتبیین، جلد۲، ص۱۵۔۱۶، مطبعۃ الفتوح الادبیہ، مصر، ۱۳۳۲ھ

[۵] ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، جلد۵، ص۱۵۵

[۶] امام بخاری، صحیح بخاری، باب ۱۹، کتاب الوصایا، (هل یدخل النساء والولد فی الارقاب)، ص۴۶، محمد سعید اینڈ سنز، کراچی

[۷] تفصیلی احکامات کے لیے دیکھیے سورۂ النور۔

[۸] پردے کے تفصیلی احکامات کے لیے رجوع کیجیے سورۂ نور اور سورۂ احزاب

[۹] سورہ لقمٰن: ٦

[۱۰] قرآن سربراہ خاندان پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے بیوی، بچوں کی ایسی تعلیم وتربیت کا بندوبست کرے جو انہیں صالح افراد بنانے میں معاون ہو، اس کو صرف یہی فکر نہیں ہونی چاہئے کہ اس کے بال بچے دنیا میں خوشحال ہوں بلکہ اس سے بڑھ کر اسے یہ فکر ہونی چاہئے کہ آخرت میں ان کی نجات ہو سکے۔ بخاری میں حضرت عبداللہ ابن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک اپنی رعیت کے معاملہ میں جواب دہ ہے۔ حکمران راعی ہے اور وہ اپنی

رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے، مرد اپنے گھر والوں کا راعی ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بچوں کی راعی ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے۔" (مودودی، سید ابوالاعلیٰ تفہیم القرآن، جلد ۶، ص ۳۰)

[۱۱] مودودی، سید ابوالاعلیٰ، اسلامی نظام زندگی، ص ۱۰۶، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور

[۱۲] سورۂ انعام ایک تفصیلی سورہ ہے جس کے مضامین کو کم از کم سات بڑے عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے، انہی میں ایک وہ ضابطہ اخلاق ہے جسے اسلام، اسلامی معاشرت کی بنیادوں کے طور پر پیش کرتا ہے۔

[۱۳] یہ بات قابل غور ہے کہ والدین کے حق کو قرآن میں ہر جگہ توحید کے حکم کے بعد بیان کیا گیا ہے جس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بعد، بندوں کے حقوق میں سب سے مقدم حق کسی انسان پر اس کے والدین کا ہے۔

[۱۴] یعنی انسانی جان جو فی الاصل خدا کی طرف سے حرام ٹھہرائی گئی ہے، ہلاک نہ کی جائے مگر حق کے ساتھ، اب رہا یہ سوال کہ "حق کے ساتھ" کا کیا مفہوم ہے، تو اس کی تین صورتیں قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ انسان کسی دوسرے انسان کے قتل عمد کا مجرم ہو اور اس پر قصاص کا حق قائم ہو گیا ہو۔

۲۔ دینِ حق کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو، اور اس سے جنگ کیے بغیر چارہ نہ ہو۔

۳۔ اسلامی حکومت کا باغی ہو

دو مزید صورتیں احادیث میں ارشاد ہوئیں ہیں یعنی یہ کہ ۴۔ شادی شدہ زانی ہو یا ۵۔ مرتد ہو

[۱۵] مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، جلد ۲، ص ۵۶۴

باب بیست و نہم

اسلام کا سیاسی نظام

قرآن کریم کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے والا اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآن ہر اہم شعبہ ہائے حیات کے لیے ایک نظامِ اقدار و اصول (Value System) متعارف کراتا ہے۔ وہ انسان کو اپنے معاملاتِ زندگی طے کرنے کے لیے ایسا ضابطۂ ہدایت و اخلاق پیش کرتا ہے، جس کی بنیاد پر قانون سازی کر کے، زمان و مکان کے کسی بھی مرحلہ پر اپنے لیے ایک نظام (System) بنایا جا سکتا ہے۔ یہی ہمہ گیر ہدایت شریعت ہے۔

انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کی تربیت و تہذیب کے لیے جو ادارے قائم کیے ہیں ان میں ریاست کا ادارہ سب سے اہم اور بنیادی ہے۔ ریاست وہ ہئیت سیاسی ہے جس کے ذریعہ سے ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظام قائم کرتے ہیں اور اسے قوتِ قاہرہ اور قوت نافذہ کا امین قرار دیتے ہیں۔[۱]

اجتماعی زندگی کے لیے ریاست کا وجود ناگزیر ہے، انسان جب دوسروں سے معاملات کرتا ہے تو ان معاملات کی ضابطہ بندی کے لیے قانون کی اور اس قانون کو نافذ کرنے کے لیے اداروں کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ ریاست وہ ادارہ ہے جو معاشرتی تعلقات، معاشی لین دین اور دیگر تمدنی معاملات کی استواری کا نگران و محافظ ہے، فرد کو اپنے نشو و ارتقا کے لیے ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہے جس میں ایک طرف امن امان قائم ہو اور دوسری طرف وہ فرد کو ایسی تمام سہولتیں فراہم کر دے جو وہ خود حاصل نہیں کر سکتا۔ دفاع، قیامِ نظم و قانون، حصول عدل اور تعلیم وغیرہ وہ چیزیں ہیں جو ریاست کے ذریعہ سے انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔[۲]

قرآن اس اہم ادارے کے لیے واضح ہدایات دیتا ہے اور اس حوالے سے ایک ایسا

ضابطہ اخلاق فراہم کرتا ہے، جس کی بنیاد پر کسی بھی عہد اور کسی بھی مقام کے لیے قانون سازی کی گنجائش ہے۔

ایک اہم قدر جو اس حوالے سے قرآن متعارف کراتا ہے وہ سیاست کا اخلاقیات سے تعلق ہے۔ اسلام اخلاق اور سیاست کے مابین تعلق کو ایک بنیادی حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں دین اور سیاست دو جدا چیزیں نہیں ہیں۔[۳] لہٰذا بعض پیغمبران اسلام نے وسیع ریاستیں قائم کیں اور ان ریاستوں میں اسلامی شریعت کو نافذ کیا، ایسے پیغمبران میں حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی شامل ہیں جنھوں نے اپنے اپنے وقتوں میں نہ صرف یہ کہ اسلامی ریاست قائم کی بلکہ برسہابرس اسے عادلانہ انداز میں چلایا بھی۔

اسلام کا اپنا ایک معاشرتی، سماجی اور تہذیبی نظام اقدار (Value System) ہے، اس کا اپنا فوجداری اور دیوانی قانون ہے، وہ دفاع، تجارت اور معاملات کے لیے قانونی ہدایات دیتا ہے اگر اسے حکومت، اقتدار حاصل نہ ہوں تو اس کی شریعت کیسے نافذ ہو سکتی ہے، شریعت کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ ریاست و اقتدار حاصل ہو، علامہ ابن کثیر کا کہنا ہے:

''اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدباب کر دیتا ہے جن کا سد باب قرآن سے نہیں کرتا۔''[۴]

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ دین کے لیے ریاست اور ریاست کے لیے دین کی اہمیت کو سمجھتے تھے، ان کو جو دعائیں سکھائی گئی، ان میں ایک اہم دعا یہ تھی:

''اور (اے نبی) دعا کرو، اے پروردگار مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال، سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک سلطان (حکومت، اقتدار) کو میرا مددگار بنا دے۔'' (بنی اسرائیل۔۸۰)

یہ آیت ہجرت مدینہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی، اس تاریخی حوالہ سے اس کی

اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد حکومت الہیہ کا قیام بھی تھا کیونکہ حکومت الہٰی کا قیام اور اسلامی نظام وقوانین اور حدود کے اجرا کے بغیر، معاشرے میں مثبت اور نتیجہ خیز تبدیلی ممکن ہی نہیں۔ وہ نظام اقدار جو اسلام متعارف کرانا چاہتا ہے، اس کے نفاذ کے لیے جس قوت نافذہ کی ضرورت ہے وہ ریاست ہی پورا کرسکتی ہے۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کا پابند کیا ہے۔

"یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا تو وہ نماز قائم کریں گے، ادائے زکواۃ میں سرگرم ہوں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے، برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔"

(الحج۔۴۱)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلام میں جس قدر اہم فریضہ ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کے برپا کرنے کا مقصد یہی بتایا گیا ہے کہ

"جتنی امتیں لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان میں سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

(آل عمران۔۱۱۰)

اسی سورۃ میں مزید تاکید کی گئی ہے:

"تم میں ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہئے جو بھلائی کی دعوت دے، نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔" (آل عمران۔۱۰۴)

حکم اسی صورت میں دیا جا سکتا ہے جب کسی نہ کسی نوعیت کا اقتدار حاصل ہو، باپ اپنے بیٹے کو حکم دے سکتا ہے، مالک اپنے ملازم کو حکم دے سکتا ہے، ریاست اپنے باشندوں کو حکم دے سکتی ہے، اس اہم فریضہ کی بجا آوری کے لیے کسی نہ کسی درجہ کا اقتدار از بس ضروری ہے۔ صحیحین کی مشہور حدیث ہے:

''تم میں سے جو شخص کوئی بدی دیکھے اس کو ہاتھ سے بدل دے، اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے، اگر زبان سے بھی نہ روک سکے تو دل سے بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔''

ظاہر ہے ہاتھ سے بدی کو نیکی میں بدل دینے کے لیے قوت اور اختیار کی ضرورت ہے۔ زبان سے روکنے کے لیے بھی کسی قدر قدرت اور آزادی کی ضرورت ہے، تیسری صورت میں ایمان کے کمزور درجہ پر قناعت کرنی پڑے گی، جو دین اسلام کا مطلوب و مقصود نہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اسلام کی سربلندی کے لیے آزاد فضا حاصل کی جائے اور ایک اسلامی ریاست کے قیام کو ممکن بنایا جائے۔

فقہ کا ایک بنیادی مسئلہ ذہن میں رہنا چاہئے کہ ملت اسلامیہ کے لیے نصب امامت لازمی ہے، خلیفہ اور امام [۵] کا تقرر واجب ہے کیونکہ نظم ملت، قیام امن اور نفاذ احکام شریعت امامت و خلافت کے قیام کے بغیر ممکن نہیں، علامہ ابن حزم لکھتے ہیں:

''کل اہل سنت، مرجۂ شیعہ، خوارج سب کا اتفاق ہے کہ نصب امام واجب ہے اور یہ کہ امت پر ایسے امامِ عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام قائم کرے اور ان احکام شریعت کے مطابق ان کا سیاسی نظام قائم کرے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔'' [۶]

تقریباً تمام مسلمان سیاسی مفکرین نے نصبِ خلافت کو امتِ مسلمہ پر واجب قرار دیا ہے، شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

''مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کو مقرر کرنا، واجب بالکفایہ ہے، اور یہ حکم قیامت تک کے لیے ہے۔'' [۷]

الغرض یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری امت کا اجماع ہے۔ تمام فرقے اس پر متفق ہیں، اختلاف اگر ہے تو تقرر اور انتخاب کی تفصیل و جزئیات میں یا طریق و شرائط میں

ہے لیکن نصبِ امامت کے وجوب پر کوئی اختلاف نہیں۔ یہ اتنا اہم اور ضروری معاملہ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی صورت میں، ان کی تجہیز و تکفین سے پہلے امت مسلمہ نے طے کر لیا تھا، مسلمانوں کی تیرہ سو سال کی تاریخ میں انتشار و افتراق کے چند سالوں کو چھوڑ کر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ امتِ مسلمہ کسی "خلیفہ" کے بغیر رہی ہو۔ ۱۹۲۴ء میں الغائے خلافت کے بعد سے امت نے اس فریضہ سے غفلت برتی جس کے نتیجے میں وہ بدترین انتشار کا شکار ہے۔

اسلامی ریاست کی خصوصیات:

اسلامی تعلیمات پر مبنی جو ریاست قائم کی جائے گی وہ لازماً چند خصوصیات کی حامل ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں جو پہلی اسلامی ریاست قائم کی وہ انہی خصوصیات کی حامل تھی۔

(الف) نظریاتی ریاست:

دیگر ریاستوں کی طرح اسلامی ریاست کوئی قومی ریاست نہیں ہوگی۔ دیگر قومی ریاستوں کی بنیاد نسل، رنگ، زبان، وطن یا مشترکہ معاشی مفادات ہو سکتے ہیں، جبکہ اسلامی ریاست کی اصل بنیاد "نظریہ" ہے۔ چنانچہ یہ اسلامی نظریۂ حیات کی علمبردار، اس کی تابع اور اس کو قائم کرنے والی ہے۔ جو ریاست خدا کی سیاسی حاکمیت کا اعلان کرے اور اس کے قانون کو نافذ کرنے والی بنے وہ اسلامی ریاست ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر ریاست کی طرح اسلامی ریاست کے لیے بھی ایک متعین علاقہ اور آبادی کا ہونا ضروری ہے لیکن اس کی اصل دعوت یہ ہے کہ انسانیت، رنگ، نسل، زبان اور محدود وطنیت کی مصنوعی پابندیوں کو توڑ کر ایک نظریاتی قومیت اختیار کرے اور اسی بنیاد پر ایک عالمگیر ریاست قائم کرے۔ جب تک یہ نصب العین حاصل نہ ہو جغرافیائی حد بندیوں کو گوارا کرنا ہوگا، لیکن پوری امت کی وحدت یا کم از کم اس کی ایک دولت مشترکہ کا قیام ایسی ریاست کے پیش نظر رہے گا۔ اس اعتبار سے اسلامی ریاست،

ان ریاستوں سے مختلف ہوگی جو محض جغرافیائی قومیت پر مبنی ہیں اور جن کے پاس کوئی طاقت ور نظریہ اور دعوت نہیں۔[۸]

سورۃ نور میں ارشاد ہوتا ہے:

''تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی، اور جس دین کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اس کو ان کے لیے قوت دے گا اور خوف و ہراس کے بعد ان کو امن بخشے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کریں گے اور جو اس کے بعد نافرمانی کی روش اختیار کریں گے وہ فاسق ہیں، اور (اے مسلمانو!) نماز قائم کرو، اورزکواۃ کی ادائیگی کرتے رہو، اور رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔'' (النور۔۵۵۔۵۶)

گویا اسلام میں حکومت کا مقصد دین کو قائم کرنا ہے، اسی لیے یہ ایک نظریاتی اور مقصدی ریاست ہوگی۔ اسلامی ریاست میں ''نظریہ'' اور ''اصول'' کو بالادستی حاصل ہوگی اسلام میں قانون، حکومت و ریاست پر فوقیت رکھتا ہے اور خود حکومت خدا کے قانون کی پابند اور اس کے تابع ہوتی ہے۔ قرآن، اسلامی ریاست کے ہر فرد سے اللہ، اس کے رسول اور ''اولی الامر'' کی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے تا کہ نظم مملکت خوش اسلوبی سے چلایا جا سکے اور بلاوجہ محاذ آرائی پیدا نہ کی جائے۔ قرآن کہتا ہے:

''اے ایمان لانے والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں ''اولی الامر'' ہیں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔'' (النساء۔۵۹)

ضروری ہے کہ یہاں ''اولی الامر'' کی وضاحت کر دی جائے۔ اولی الامر سے مراد وہ

صاحبِ اقتدار ہیں جنھیں حکومت سازی وسیاست کاری میں فیصلہ کن اختیارات حاصل ہوں اور جو ریاست کی بنیادی حکمتِ عملی (State Policy) بنانے والے ہوں۔ سورۃ النساء کی درج بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ یہ ''اولی الامر'' مسلمانوں میں ہی سے ہونے چاہئیں۔ ''منکم'' (تم میں سے) کا اشارہ اسی حقیقت کی طرف ہے۔ اس لیے اسلامی ریاست میں حکومت کے کلیدی مناصب انہی افراد کے پاس ہونے چاہئیں جو مسلمان ہیں۔

اس نکتہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس طرح تو غیر مسلموں کے ساتھ ایک امتیازی رویہ کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ اعتراض برائے اعتراض ہے کیونکہ جب یہ طے کر دیا گیا کہ اسلامی ریاست ایک نظریاتی اور اصولی ریاست ہوگی اور اس حکومت کے قیام کا مقصد اس ''نظریہ'' کا تحفظ ہوگا، تو ایسی نظریاتی ریاست اپنا سربراہ یا کلیدی مناصب پر ایسے افراد کا تقرر نہیں کر سکتی جو اس نظریے کے ماننے والے نہ ہوں۔ یہ بات ایسی ہی ہے کہ ''اشتراکیت'' ایک نظریہ ہے۔ اس نظریہ پر قائم ہونے والی اشتراکی حکومت کا سربراہ یا کلیدی مناصب رکھنے والے غیر اشتراکی نہیں ہو سکتے۔ ایک سرمایہ دارانہ سوچ رکھنے والے ملک کا سربراہ اشتراکی نہیں ہو سکتا۔ آج کل سیاسی طور پر جمہوریت کا چلن ہے، لہٰذا جمہوری ممالک اس سوچ کی طرف جا رہے ہیں کہ کیا ان حضرات کو جو جمہوریت پر یقین نہ رکھتے ہوں برسرِ اقتدار لایا جا سکتا ہے؟۔ [۹]

مغربی ممالک کے دساتیر کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی وہ مذہبی اور نسلی بنیادوں پر اپنے شہریوں کے درمیان امتیاز کرتے ہیں۔ انگلستان میں سربراہِ ملک کے لیے پروٹسٹنٹ فرقہ میں بھی انگریزی کلیسا کا عیسائی ہونا ضروری ہے۔ آئر لینڈ کے صدر کے لیے کیتھولک ہونا ضروری ہے، ارجنٹائن کے دستور کی رو سے صدر یا نائب صدر صرف کیتھولک عیسائی ہی ہو سکتا ہے، ناروے اور ڈنمارک میں بادشاہ کے لیے صرف عیسائی ہی نہیں بلکہ ایونجلیکل چرچ (ایک خاص فرقہ) کا پیرو ہونا ضروری ہے۔ یہی قانون سویڈن کا بھی ہے بلکہ وہاں بادشاہ کے علاوہ اسٹیٹ کونسل کے اراکین کے لیے بھی ایونجلیکل ہونا ضروری ہے۔ یونان

میں بادشاہ کے لیے مشرقی مسیحی کلیسا کا پیرو ہونا ضروری ہے۔اسپین میں صدر مملکت کے لیے رومن کیتھولک ہونا ضروری ہے ۔تھائی لینڈ کے دستور میں صراحت ہے کہ اس کا سربراہ لازماً بدھ مت کا پیرو کار ہو------ سوال یہ ہے کہ اگر وہ ریاستیں جو بظاہر نظریاتی ریاستیں نہیں ہیں اور اپنے کو لادین (Secular) کہتی ہیں ''اولی الامر'' کے لیے ایک خاص مذہب (حتیٰ کہ فرقہ) کا پیرو ہونا ضروری سمجھتی ہیں تو اسلامی ریاست جو ہے ہی ایک نظریاتی ریاست، یہ کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ اس کے کلیدی مناصب پر وہ لوگ فائز ہوں جو اس نظریہ ہی کو نہ مانتے ہوں۔[۱۰]

المختصر ''اولی الامر'' کے حوالے سے یہ چند باتیں طے شدہ ہیں۔

اولاً یہ کہ وہ مسلمانوں میں سے ہی ہونے چاہئیں

ثانیاً اولی الامر کی اطاعت اور ان کی فرمانبرداری مسلمانوں پر لازم کی گئی ہے تاکہ زندگی کا نظام بہ حسن وخوبی چلتا رہے اور اس میں فساد رونما نہ ہو۔

ثالثاً اولی الامر کی اطاعت اللہ، اور اس کے رسول کی اطاعت کے تابع ہو، اگر اولی الامر یعنی صاحبِ اقتدار اپنی رعایا کو ایسے احکامات دیں جو قرآن وسنت کے منافی ہو تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی، بلکہ حسبِ استطاعت اس کی نشاندہی کر کے اصلاح کی کوشش کی جائے گی ۔اس کے بارے میں رسول اللہ کا واضح حکم موجود ہے۔آپ نے فرمایا: ''تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناپسندیدگی کیا وہ بری الذمہ ہوا، اور جس نے ان کو ناپسند کیا، وہ بھی بچ گیا، مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا، وہ ماخوذ ہوگا۔'' (مسلم)

گویا اسلامی ریاست میں ایک ایسی ''حزب اختلاف'' کا ہونا ضروری ہے جو صاحبان اقتدار کا احتساب کرتی رہے اور انہیں راہِ راست پر رکھے۔

۲۔شورائیت:

اسلامی ریاست کی دوسری خصوصیت اس کا جمہوری اور شورائی مزاج ہے، ریاست کے تمام شہری برابر ہیں، ان کے حقوق وفرائض متعین ہیں، حکومت ان حقوق کی ادائیگی کی ذمہ دار ہے۔اسلامی ریاست کا مزاج نہ آمریت (Dictatorship) کو برداشت کرسکتا ہے اور نہ موروثی بادشاہت پسندیدہ ہے، اس کا مزاج شورائی اور جمہوری ہے۔رسول اللہ معاملات، مشورے سے طے کرتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وشاورھم فی الامر

اوران سے معاملات میں مشورہ کرو۔ (آل عمران۔۱۵۹)

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں، میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو اپنے اصحاب سے مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا۔(بخاری وترمذی)

عام اولی الامر کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وامرھم شوری بینھم

اوران کے امورآپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں (الشوریٰ۔۳۸)

خطیب بغدادی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ ”میں نے عرض کیا، یارسول اللہ، آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترا ہو، اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو تو ہم کیا کریں۔آپ نے فرمایا: ”میری امت میں سے عبادت گزار اور اطاعت شعار لوگوں کو جمع کرو اور اسے آپس کے مشورے کے لیے رکھ دو، اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔“(روح المعانی)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری حدیث میں اسلامی معاشرہ کی صحیح حالت کا نقشہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

”جب تمہارے حکام تم میں نیک اور صالح ہوں، تمہارے اہل ثروت تم میں فیاض ہوں، اور تمہارے امور باہم مشورے سے طے پاتے ہوں۔“ (صحاح)

اس لیے علمائے قانون نے یہ کہا ہے کہ شوریٰ اسلامی نظام کی روح اور اس کا ایک لازمی جزو ہے۔ مشاورت کا یہ حکم ہر اہم معاملہ کے لیے ہے۔ اس کی شکل کیا ہو؟ اس کا تعین ہر زمانے کے حالات کے مطابق کیا جائے گا، لیکن اس کی روح یہ ہے کہ مشورہ ان لوگوں سے کیا جائے جو اہل الرائے اور اربابِ حل و عقد ہوں، فہم و بصیرت رکھتے ہوں، اور انہیں لوگوں کا اعتماد بھی حاصل ہو، اسلامی ریاست کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں تمام اہم معاملات مشورے سے طے ہوں اور کوئی شخص اپنی من مانی نہ کر سکے۔ کوئی معاملہ جن لوگوں سے متعلق ہو، ان سب کو یا ان کے نمائندوں کو شریک مشورہ کیا جائے۔ مشورہ آزادانہ، بے لاگ اور مخلصانہ ہو، اگر یہ امور پیش نظر رکھے جائیں، تو شوریٰ کا حق ادا ہو سکتا ہے۔

۳۔ فلاحی ریاست:

اسلامی ریاست کی ایک تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے نتائج کے اعتبار سے ایک فلاحی ریاست (Walfare State) ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت کا کام صرف یہی نہیں کہ امن و امان قائم کرے اور ملکی دفاع کی خدمت انجام دے، ان امور کے ساتھ ساتھ اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ ریاست کی حدود میں بسنے والے ہر شہری کو ان کے حقوق عطا کرے، ان کے درمیان مساویانہ رویہ رکھے، اپنے تمام شہریوں کو خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت دے، اگر ریاست کی حدود میں کہیں بھی فقر و فاقہ، غربت و افلاس اور ظلم و جور ہے تو اس کا تدارک کرے اور اپنی تمام قوتیں اور وسائل، انسانی مسائل کو حل کرنے کے لیے وقف کر دے۔ اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی نگران اور سرپرست ہوتی ہے، وہ اپنے ان شہریوں کی کفالت کا بندوبست بھی کرتی ہے جو مجبور، اپاہج، لاچار اور رزق سے محروم ہوں۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے:

۱۔ ''جو شخص مر جائے اور اس کے ذمہ قرض ہو اور وہ اسے ادا کرنے کے قابل مال نہ چھوڑے تو اس کا ادا کرنا میرے (اسلامی ریاست کے) ذمہ ہے اور اگر وہ مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔'' (ابوداؤد)

۲۔ ''جو شخص قرض چھوڑے یا ایسے پس ماندگان چھوڑے جن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو وہ میرے پاس آئے، میں ان کا سرپرست ہوں۔'' (ابوداؤد)

۳۔ ''جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے، اور جو ذمہ داریوں کا بار چھوڑ جائے تو وہ ہمارے (یعنی حکومت کے) ذمے ہے۔'' (بخاری ومسلم)

اس میں مسلم، غیر مسلم کی تخصیص نہیں تھی، حضرت خالد بن ولید نے حیرہ کے غیر مسلموں سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں بہ صراحت یہ موجود تھا کہ جو شخص بوڑھا ہو جائے گا یا جو کسی آفت کا شکار ہو گا یا جو مفلس ہو جائے گا اس سے جزیہ وصول کرنے کے بجائے مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی اور اس کے کنبے کی کفالت کی جائے گی۔''[۱۱]

فلاحی ریاست ایسی ریاست ہوتی ہے جہاں صرف بنیادی حقوق ہی حاصل نہ ہو ں، بلکہ بہت سے اضافی حقوق بھی حاصل ہوں، یعنی معاملہ صرف ''عدل'' کا ہی نہ ہو بلکہ ''احسان'' کا ہو۔ عدل تو یہ ہے کہ ہر شخص کو وہ ملے جو اس کا حق ہے اور احسان یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے حق سے تھوڑا زائد مل جائے، حکومت اور عوام کے درمیان یہ ایک ایسا خیر خواہانہ معاملہ ہے جو دونوں کے تعلقات میں خوشگواری کے جذبات لاتا ہے، ایسی حالت میں عوام، حکومت کے لیے دعاگو ہوتے ہیں اور یہ مثالی صورت حال ہے۔ اس کے برعکس صورت حال یہ ہے کہ حکومت اپنی عوام سے نفرت کرے اور عوام حکومت سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''تمہارے بہترین امام اور قائد وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو اور وہ تم کو چاہتے ہوں تم ان کو دعائیں دیتے ہو اور وہ تم کو دعائیں دیتے ہوں، اور تم میں بدترین رہنما وہ ہیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تم کو ناپسند کرتے ہوں، وہ تم پر لعنت بھیجتے

ہوں اور تم ان پر لعنت بھیجتے ہو۔'' (مسلم)

اب مختصراً ان سیاسی نظاموں کا ایک جائزہ پیش کیا جائے گا، جن کا تجربہ کیا جا چکا ہے یا کیا جا رہا ہے، یعنی لادینیت، تھیا کریسی اور جمہوریت وغیرہ

(ا) لادینی ریاست (Secular State)

لادینی ریاست وہ ریاست ہے جو اپنے معاملات چلانے کے لیے مذہب اور الہامی ہدایت پر عمل نہیں کرتی بلکہ اپنی عقل اور مصلحت پر انحصار کرتی ہے۔ وہ کسی بالاتر قانون کی پابند نہیں ہوتی، ایسی ریاست مذہب کے معاملہ میں غیر جانبدار بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی معاملات میں اس کی مخالف بھی۔

مغرب میں لادینی ریاست کا تخیل ایک خاص پس منظر کی پیداوار ہے، مغرب میں پاپائی نظام نے جو شکل اختیار کر لی تھی اور مذہب کے نام پر بادشاہوں سے گٹھ جوڑ کے ذریعے سے جن مظالم کو سندِ جواز دی گئی تھی انہوں نے ایک ردعمل پیدا کیا، عیسائیت کی مخالفت نے مذہب سے بغاوت کی شکل اختیار کر لی اور بغاوت اور ردعمل کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ لادینی ریاست کے تصور سے جڑ گئے، ایسی ریاست جو مذہبی احکامات کی پابند نہ ہو۔

سیکولرازم کی تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۸۳۲ء میں ہوا جب جیکب ہولیگ نے سیاست کو مذہب سے پاک رکھنے کے مسلک کا پرچار شروع کیا، جلد ہی اس مسلک کو مخصوص پس منظر کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہو گئی اور لوگوں میں یہ خیالات عام ہونے لگے کہ مذہب ہر شخص کا انفرادی معاملہ ہے لہٰذا مذہب کا دائرہ انفرادی زندگی تک محدود رہنا چاہئے اور اسے اجتماعی اور سیاسی زندگی میں کوئی مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔ شروع میں بات صرف مذہب کے معاملہ میں غیر جانب داری اور فرد کی کامل آزادی کی تھی، لیکن بعد میں اس تحریک کا ایک حصہ مذہب کی مخالفت اور جارحانہ مادیت یا اشتراکیت کا داعی بن گیا۔

مغرب کے پاس لادینیت کا ڈیڑھ سو سالہ تجربہ ہے۔ جس نے مغرب کو اخلاقی اور

روحانی طور پر شدید نقصان پہنچایا، سیکولرزم نے اہل مغرب میں تشکیک اور ذہنی پراگندگی پیدا کی۔ اسی ذہنی اور فکری انتشار نے اشتراکیت (Socialism) اور فسطائیت (Fascism) جیسی تحریکوں کو جنم دیا۔ آر۔این۔کریوھنٹ لکھتا ہے:

''اشتراکیت ان نظریات کے مجموعے کا نام ہے جنھوں نے ہماری زندگی کے اس خلا کو پُر کیا ہے، جسے منظّم مذہب کے انہدام نے پیدا کیا تھا اور جو زندگی پر لادینیت کے غلبے کا لازمی نتیجہ تھا۔''[۱۲]

اور جو لوگ اشتراکیت کی طرف نہیں گئے، وہ فکر پراگندگی، روحانی اضطراب اور مادہ پرستی کا شکار ہو گئے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ لادینیت (Secularism) نے جس فسطائیت (Fascism) کو جنم دیا وہ دو عظیم جنگوں کا باعث بنی جس میں لاکھوں افراد ہلاک اور معذور ہوئے اور انسانیت شدید بے چارگی اور جبر کا شکار ہوئی۔ لادینیت نے جس مادہ پرستی کو جنم دیا وہ انسان کو حقیقی مسرت سے بہت دور لے گیا، آرنلڈ ٹائن بی، سیکولرازم کے نتائج کا جائزہ لے کر کھلے الفاظ میں اس کی ناکامی کا اعتراف کرتا ہے:

''اب یہ واضح ہو گیا ہے کہ اگر صرف دنیاوی خوشی کو مقصد حیات بنایا جائے گا تو اس میں فرد کی مادی خوشحالی اور دنیاوی سکون کا حصول بھی ناممکن ہے، ہاں یہ قابل فہم ہے کہ اگر سیکولرازم سے بلند و بالا کوئی روحانی مقصد سامنے رکھا جائے تو ایک ضمنی نتیجے سے انسان کو دنیاوی خوشی بھی حاصل ہو جائے۔''[۱۳]

(۲) تھیاکریسی (Theocracy)[۱۴]

تھیاکریسی وہ نظام حکومت ہے جس میں حکم رانی کے اختیارات خدا کو ہوں اور مذہبی پروہتوں کا طبقہ اس کے نمائندے کی حیثیت سے یہ کام انجام دے۔ رواِنسٹون پائک ''مذہب

اور مذاہب کی قاموس'' میں اس کی یہ تعریف کرتا ہے:

''حکومت کی ایک ایسی قسم جس میں اقتدار اعلیٰ مرکز خدا یا خداؤں یا کسی اور کتابی قوت کو سمجھا جائے، حقیقی حکم ران پادری یا مذہبی پروہت ہوں اور قوانین کو احکام خداوندی سمجھا جائے۔'' [۱۵]

تاریخی حیثیت سے اس کی مثالیں یہودیوں، عیسائیوں اور برہمنوں وغیرہ میں ملتی ہیں۔

اسلامی ریاست خدا کی حاکمیت اعلیٰ پر مبنی ہے لیکن یہ تھیا کریسی سے بنیادی طور پر مختلف ہے اور وجوہ اختلاف مختصراً یہ ہیں:

۱۔ تھیا کریسی میں حاکمیت کے عملی اختیارات ایک مخصوص مذہبی طبقے کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں جو سیاہ وسفید کا مالک ہوتا ہے، جس کی رائے قانون ہوتی ہے، جس پر کوئی تنقید نہیں کر سکتا، جو خدا کے نام پر سارے اختیارات بلا روک ٹوک استعمال کرتا ہے اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا۔ اسلام میں ایسے کسی مستقل طبقے کا کوئی وجود نہیں۔ بندے اور خدا کے تعلق کو استوار کرنے کے لیے یہاں پروہتوں کے کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں۔ اسلام کی تعلیمات نہ صرف ہر مسلمان کے لیے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہیں بلکہ ان سے واقفیت ہر مسلمان کا فرض بھی ہے۔ سیاست میں بھی نظام حکومت چلانے والے خدا اور امت دونوں کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ اسلامی ریاست کے اصحاب امر کے لیے کوئی شرط ہے تو وہ علم اور تقویٰ کی ہے اور ان کے حصول کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔

۲۔ اسلامی تاریخ میں ہمیں کبھی اس قسم کی پاپائیت نظر نہیں آتی جیسی یورپ یا ہندوستان، جاپان اور تبت میں ملتی ہے۔ ہمارے یہاں علما حق کے علم بردار اور آزادی کے محافظ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ وہ خود ظلم وستم اور استبداد کا نشانہ بنے ہیں، ان کا ذریعہ نہیں۔ آزادی کی جدوجہد کے سرخیل علما رہے ہیں اور عالم بننے کا راستہ ہر شخص کے لیے کھلا رہا ہے۔ نیز عام سیاسی

تاریخ میں بھی کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ حکومت یورپ کے ''مذہبی دیوانوں'' کی طرح عوام کو نشانۂ ستم بناتی ہو۔اس کا اعتراف خود مغربی مورخین کرتے ہیں کہ مذہبی حکومت کے سلسلے میں یورپ کا تجربہ اور عالم اسلامی کا تجربہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے:

'' مشرق (مراد ہے عالم اسلام) میں تھیا کریسی کبھی بھی ذہنی استبداد کا موجب نہیں بنی۔ہم یہاں ظلمت پسندی، خیالات پر قدغن، اور علم پر پابندی کی کوئی ایسی مثال نہیں پاتے جس کے لیے مغربی دنیا یونان اور روم سمیت مشہور ہے۔'' [۱۶]

۳۔ دوسرے مذاہب اور تہذیبوں میں تھیا کریسی میں نام تو خدا کا تھا لیکن چوں کہ ان کے پاس زندگی کے ہمہ جہتی مسائل کے لیے کوئی واضح الہامی ہدایت موجود نہ تھی اس لیے پادریوں اور پروہتوں نے خدا کے نام پر اپنی رائے پیش کی اور خدا کے قانون کے بجائے اپنا قانون چلایا جو ان تمام کمزوریوں اور خامیوں سے آلودہ تھا جن سے انسانی قانون، خصوصیت سے جب وہ ایک طبقے کے مفاد کا محافظ بھی ہو، ہوا کرتا ہے، اسی لیے مذہبی طبقے کو تنقید سے بالا قرار دیا گیا تاکہ اس کی ہر بات بے چون وچرا تسلیم کر لی جائے، خواہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو ۔اسلام کا سیاسی نظام اس نظام سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں واضح الہامی ہدایت موجود ہے جو اپنی اصل شکل میں محفوظ ہے اور جس میں ایک شوشے کا تغیر بھی واقع نہیں ہوا ہے اور نہیں کیا جا سکتا۔اولی الامر سے اختلاف کی پوری پوری گنجائش ہے بلکہ ان پر تنقید اور محاسبہ فرض کیے گئے ہیں۔تاکہ وہ راہ صواب سے نہ ہٹیں۔ ہر شخص کو اپنی دلیل خدا کے کلام سے لانی ہے جو کسی کا اجارہ نہیں اور جس تک ہر شخص کی رسائی ہے۔ضرورت صرف علم کی ہے۔ یہ چیز اسلامی نظام کو تھیا کریسی سے بالکل مختلف کر دیتی ہے۔

۴۔ تھیا کریسی اور اسلام کے مزاج میں ایک اور بھی بڑا لطیف لیکن بے حد اہم فرق پایا جاتا ہے۔تھیا کریسی کا ایک بنیادی تصور یہ رہا ہے کہ یہ دنیا ایک بری چیز ہے، اس کی زندگی میں

گناہ کی پاداش میں اختیار کرنی پڑی ہے، اس کی حیثیت ایک ''دارالعذاب'' کی سی ہے اور تمام انسانوں کو اس سزا کو برداشت کرنا چاہئے۔ اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کی اصلاح اور درستگی اور اس کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنا یا جدوجہد کرنا ایک غیر مطلوب شے بن جاتے ہیں اور انسان ''تسلیم ورضا'' کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اسلام کا نقطہ نظر بالکل مختلف ہے۔ انسان خدا کا خلیفہ بنایا گیا ہے۔ زندگی کی نعمتیں اس کے لیے فراہم کی گئی ہیں اور ریاست کا مقصد زندگی کو نیکیوں اور اچھائیوں سے بھرنا اور ایک فلاحی معاشرہ قائم کرنا ہے۔ ضرورت صرف علم کی ہے۔ اس طرح جو نفسیاتی رویہ یہاں پیدا ہوتا ہے وہ تھیا کریسی کی بالکل ضد ہے۔

پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا نظام تھیا کریسی سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری یہ بحث ہمیں اس نتیجے پر لاتی ہے کہ اسلامی ریاست اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتی ہے اور وہ ایک اصولی، مقصدی اور نظریاتی ریاست ہے جو لادینیت اور تھیا کریسی دونوں سے مختلف ہے۔

(۳) اشتراکیت اور جمہوریت

اس بحث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام اشتراکی امریت اور مغربی طرز کی جمہوریت دونوں سے مختلف ہے۔

۱۔ اشتراکیت مذہب کی نفی پر مبنی ہے اور اسلامی ریاست خدا کے قانون کی تابع اور اسے قائم کرنے والی ہے۔

۲۔ اشتراکیت فرد کی مستقل اور جداگانہ شخصیت کو نہیں مانتی اور اسے طبقے میں ضم کر دیتی ہے اور ریاست کو ایک طبقے کا آلہ کار بنا دیتی ہے۔ اسلام ان میں سے کسی چیز کو بھی درست نہیں مانتا۔ وہ فرد کو بنیاد مانتا ہے اور اس کی شخصیت کو مستحکم کرنے اور نشو وارتقاء دینے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ وہ طبقات کی نفی کرتا ہے اور تمام انسانوں کو مساوی قرار دیتا ہے۔

۳۔ اشتراکیت کا نظام آمرانہ ہے جب کہ اسلام کا نظام شورائی ہے۔ اس میں تمام امور

لوگوں کی مرضی کے مطابق طے ہوتے ہیں، ان پر اوپر سے تھوپے نہیں جاتے۔

۴۔ اشتراکیت ریاست کے اختیارات کو غیر محدود کر دیتی ہے اور شخصی اور سیاسی آزادی کی کوئی حقیقی ضمانت نہیں دیتی۔ اسلام ریاست کے اختیارات کو ایک خاص دائرے میں محدود کر دیتا ہے اور معصیت میں اطاعت کو یا حقوق انسانی کے بلاحق شرعی ختم کیے جانے کے امکان کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ حکومت کو مسئول بناتا ہے اور اسے عوام کے مشورے کا پابند کرتا ہے۔ نیز شخصی اور سیاسی آزادی کی حقیقی ضمانت دیتا ہے۔ اسلامی ریاست ہمہ گیر تو ضرور ہے لیکن اشتراکیت کی طرح کلیت پسند نہیں ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر اسلامی ریاست اشتراکی آمریت سے بالکل مختلف ہے۔

پھر اسلامی ریاست خود مغربی جمہوریت سے بھی مختلف ہے۔ اسلام کو جمہوریت سے اس پہلو سے تو قطعاً اختلاف نہیں کہ امور سلطنت عوام کے مشورے سے ان کی مرضی کے مطابق اور ان کے اپنے نمائندوں کے ہاتھوں طے ہونے چاہئیں بلکہ وہ جمہوریت کے وکلا سے کچھ زیادہ ہی شد و مد کے ساتھ اس بات کو پیش کرتا ہے۔ نیز اسے جمہوریت [illegible] سے بھی اختلاف نہیں کہ بنیادی حقوق کی ضمانت ہونی چاہئے اور قانون کی حکم رانی کے اصول پر عمل ہونا چاہئے۔ اسی طرح انسانیت نے بہت سے تجربات کی روشنی میں عوام کی مرضی کو جاننے اور اس کو موثر بنانے کے لیے جو نظام اور جو ڈھانچہ وضع کیا ہے اس سے استفادہ کرنے اور [illegible] کے مطابق اسے ڈھالنے پر بھی اسلام کو کچھ اعتراض نہیں۔ اسلام جن چیزوں میں مغربی جمہوریت سے اختلاف رکھتا ہے، یہ ہیں:

(۱) حاکمیت اعلیٰ کے اختیارات انسان کو نہیں بلکہ خدا اور اس کے قانون کو حاصل ہیں۔ انسان کی حیثیت خدا کے خلیفہ کی ہے اور اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ خدا کی ہدایت کے مطابق اپنے معاملات کو طے کرے۔ بنیادی قانون قرآن و سنت کا قانون ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر صد فی صد افراد خدا کے قانون کو بدلنا چاہئیں تو بھی انہیں اس کا اختیار

نہیں۔ ہاں اس قانون کے تحت معاملات کو طے کرنے کا حق ان کو حاصل ہے۔ یا جن امور میں یہ قانون خاموش ہے ان میں عوام اور ان کے نمائندوں کو حق ہے کہ اسلام کی روح اور عام تعلیمات کو سامنے رکھ کر قانون سازی کریں۔ نیز جن امور میں صرف اجمالی وعمومی اور اصولی رہنمائی دی گئی ہے ان میں تفصیلات طے کریں۔ اس طرح جمہور کی قانون سازی کے اختیار مطلق کے مقابلے میں اسلام ان کے محدود اختیار کا تصور پیش کرتا ہے۔ اور اس باب میں وہ مغربی جمہوریت سے مختلف ہے جہاں کوئی مستقل اور اعلیٰ تر قانون موجود نہیں۔ ہمارے پاس ایک مستقل ضابطہ ہے اور ہم اپنے معاملات اس کے مطابق ہی طے کرتے ہیں۔

(۲) جمہوریت میں ہر لحظہ مخالفت اور پارٹی بازی کی جو فضا رہتی ہے اسلام اسے بھی پسند نہیں کرتا، وہ جو طریقہ پیش کرتا ہے، وہ یہ ہے:

وتعاونوا علی البرو التقوی ولاتعاونوا علی الاثم والعدوان

نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کرو

(المائدہ۔۲)

وہ تمام گروہوں اور عناصر کے درمیان خیر خواہی اور تعاون کی فضا قائم کرنا چاہتا ہے، اور اس طرح یہ نظام خود جمہوریت سے بھی بہتر اور اعلیٰ تر ہے۔

(۳) اسلام اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ لوگ عہدوں کے حریص ہوں اور ان کے لیے اپنا سب کچھ لٹاتے پھریں۔ وہ چاہتا ہے کہ ذمہ داری کے مناصب ان لوگوں کو دیئے جائیں جو ان کی طمع نہ رکھتے ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"بخدا ہم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی عہدے پر مقرر نہیں کرتے جس نے اس کی درخواست کی ہو یا جو اس کا حریص ہو۔" (بخاری و مسلم)

"ہمارے نزدیک تم میں سے سب سے بڑا خائن وہ ہے جو خود حکومت کے کسی عہدہ و منصب کا طالب ہو۔" (ابوداؤد)

اسی طرح اسلام ایک اخلاقی فضا بناتا ہے۔ نیز وہ عہدہ داروں اور ارباب امر کے لیے اخلاقی صفات بھی تجویز کرتا ہے جب کہ جمہوریت ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں کرتی۔

(۴) جمہوریت جغرافیائی قومیت کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہے جب کہ اسلامی ریاست اصولی اور نظریاتی ہے اور اس کا پیغام عالم گیر ہے۔

الغرض اسلامی ریاست کا مزاج لادینیت، تھیاکریسی، جمہوریت اور اشتراکیت سب سے جدا ہے۔ مسلمانوں نے اس اسلامی نظام کا ''خلافت'' کی صورت میں ایک طویل تجربہ کیا ہے، مسلمانوں میں خلافت کی تیرہ سوسالہ تاریخ میں یقیناً سب کچھ اچھا نہیں رہا، بہت سے امور اصلاح طلب سامنے آئے لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ ایک کامیاب تجربہ تھا، جسے زیادہ بہتر بنیادوں پر دہرایا جانا چاہئے۔ بہتر ہوگا کہ خلافت کے بارے میں بعض اہم تفصیلات فراہم کی جائیں۔

خلافت

''خلافت'' عربی کا ایک مصدر ہے اس کا مادہ ''خلف'' ہے، خلیفہ کے لغوی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں، قرآنی اصطلاح میں خلافت اور ''استخلاف فی الارض'' اور ''وراثت وتمکن فی الارض'' سے مقصود زمین کی قومی عظمت وریاست اور قوموں اور ملکوں کی حکومت وسلطنت ہے، قرآن کریم اس کو سب سے بڑی نعمت قرار دیتا ہے۔ جو اچھے یقین اور اچھے کاموں کے بدلے اقوام عالم کو دنیا میں مل سکتی ہے۔ قرآن کے نزدیک اس خلافت ارضی کا اہم مقصد یہ ہے کہ دنیا میں نوع انسانی کی ہدایت وسعادت کے لیے خاص ذمہ دار لوگوں کی حکومت قائم ہو۔ وہ اللہ کی عدالت کو دنیا میں نافذ کرے، ظلم و جور اور ضلالت و طغیان سے زمین کو پاک کرے اور امن وسکون کی فضا کو عام کرے اور عدل اجتماعی قائم کرے۔[۱۷]

پہلا انسان جس کی تخلیق کی گئی یعنی حضرت آدم علیہ السلام، وہ اس زمین پر اللہ کے نائب اور خلیفہ ہی تھے۔ اس پہلے انسان ہی کو ایسے اختیارات (ریاستی قوت) حاصل تھے جس کی بنیاد پر انہوں نے اولین گروہ انسانی کی راہنمائی کا فریضہ ادا کیا، اور زمین میں اللہ کی عبادت کا نظام قائم کیا۔ اس کے بعد زمین کی یہ وراثت وخلافت یکے بعد دیگرے مختلف اقوام سے پیوستہ ہوتی رہیں۔ مختلف آیاتِ قرآنی میں اسی طرف اشارا ہے۔ مثلاً حضرت ھود علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:

''اگر تم منہ پھیرتے ہو تو پھیر لو، جو پیغام دے کر میں تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں۔ (اگر تم نے اپنا فرض ادا نہ کیا تو) میرا پروردگار تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔'' (ھود۔۵۷)

سورۃ یونس میں فرماتا ہے:

''پھر ان قوموں کے بعد ہم نے تم کو ان کی جگہ دی تاکہ دیکھیں تمہارے کام کیسے ہوتے ہیں۔'' (یونس۔۱۴)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

''اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر، اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔'' (ص۔۲۶)

اسی چیز کو زمین کی وراثت سے تعبیر کیا گیا۔

''اور زبور میں بھی ہمارا اعلان یہی تھا کہ یقیناً زمین کی حکومت ہمارے صالح بندوں ہی کو وراثت میں آئے گی۔'' (الانبیاء۔۱۰۵)

''اس طرح ہم نے اس سرزمین (مصر میں) یوسف کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی۔'' (یوسف۔۵۶)

اور اسی خلافت کا مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا۔

''جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل انجام دیئے اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ انہیں زمین کی خلافت دے گا، ٹھیک اسی طرح جس طرح پچھلی قوموں کو دی جا چکی ہے۔ ان کے لیے ان کے پاس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا۔'' (النور۔۵۵)

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب ہجرت کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کی زندگی دشمنوں سے گھری ہوئی تھی۔ قلت تعداد اور بے سروسامانی کی حالت کے ساتھ ساتھ دشمنوں کے پے در پے حملوں کا یہ حال تھا کہ کسی بھی وقت مسلمان، ہتھیار اپنے جسم سے اتارتے نہیں تھے۔ اس وقت بعض مسلمانوں نے کہا: ''ایک دن ہم پر ایسا نہیں گزرا کہ امن و بے خوفی کے ساتھ صبح و شام بسر کرتے اور ہتھیار اپنے جسم سے الگ کر سکتے۔ ابو العالیہ راوی ہیں کہ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اللہ نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ مضطرب نہ ہوں، ایمان اور عمل صالح کا پھل عنقریب ملنے والا ہے جبکہ خوف کی جگہ امن ہوگا۔ مظلومی و بے چارگی کی جگہ کامرانی اور فرمانروائی ہوگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زمین کی خلافت انہی کے قبضہ اقتدار میں آ جائے گی۔[۱۸]

اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ قرآن حکیم کے نزدیک خلافت فی الارض زمین کی حکومت اور تسلط ہے، پس اسلام کا خلیفہ ہو نہیں سکتا جب تک بمو جب اس آیت کے زمین پر کامل حکومت و اختیار اسے حاصل نہ ہو، وہ مسیحیت کے پوپ کی طرح محض ایک آسمانی و دینی اقتدار نہیں ہے جس کے لیے دلوں کا اعتقاد اور پیشانیوں کا سجدہ کافی ہو۔ وہ کامل معنوں میں سلطنت و فرمانروائی ہے۔[۱۹]

اللہ کے تمام وعدوں کی طرح یہ وعدہ بھی پورا ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جب

انتقال ہوا تو تمام جزیرۂ عرب مسلمانوں کے قبضہ اقتدار میں آ چکا تھا، رومیوں کے مقابلے کے لیے اسلامی لشکر ترتیب دیا جا چکا تھا، تب ''خلیفہ رسول اللہ'' کے طور پر حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیعت ہوئی اور خلافت کا وہ سلسلہ چلا جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے مختلف مگر تسلسل کے اعتبار سے طویل ترین تھا۔ اس سلسلہ خلافت اسلامیہ کو اپنی خصوصیات و نتائج کے اعتبار سے دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ ہی میں دے دی تھی۔ اس بارے میں جو احادیث مذکور ہیں وہ کثرت وطرق، سیرت متن اور قبول طبقات کی بناء پر حد تواتر تک پہنچ چکی ہیں۔ اس کے حوالے سے خلافت کا پہلا دور خلفائے راشدین (حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ) کا تھا جسے ''خلافت علی منہاج النبوۃ'' بھی کہا جاتا ہے یعنی وہ صحیح اور کامل معنوں میں منصب نبوت کے جانشین اور رسول اللہ کے قائم مقام تھے۔ ان کا طریق کار ٹھیک طریق نبوت کے مطابق تھا۔ یہ دور تقریباً تیس برسوں پر محیط تھا۔

خلافت کا دوسرا دور جو اس کے بعد شروع ہوا وہ منہاج نبوت سے الگ مجرد حکومت و بادشاہت کا تھا جبکہ عجمی بدعتیں خالص اسلامی و عربی تمدن سے مل کر ایک نیا دور شروع کر رہی تھیں۔ یہ خلافت (یعنی اموی خلافت) بعد کی خلافتوں کے مقابلے میں خلافتِ راشدہ سے قریب تر تھی لیکن موروثی نظام نے اس میں ایسی استبدادیت پیدا کر دی کہ خلافِ راشدہ کے حقیقی خصائص کمزور پڑنا شروع ہو گئے اور جیسے جیسے خلافت کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا، یہ خلافت ملوکیت میں ڈھلتی گئی، باوجود اس کے کہ حکمران ''خلیفہ'' ہی کہلاتے تھے، ''بادشاہ'' نہیں۔ خلافتِ بنو امیہ سے لے کر ۱۹۲۴ء تک جو سلسلہ خلافتِ اسلامیہ جاری رہا وہ اسی دوسری قسم میں داخل ہے۔ پہلے دور کو ''خلافت خاصہ'' اور دوسرے دور کو ''خلافت ملوکی'' کہا جا سکتا ہے۔ [۲۰] مشہور حدیث کے مطابق ''الخلافة بعدی ثلثون عاماً ثم ملک بعد ذلک'' یعنی رسول اللہ نے فرمایا کہ میرے بعد تیس سال تک خلافت ہے پھر بادشاہت۔ اسی طرح

حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ ''الخلافۃ بالمدینۃ و الملک بالشام ''یعنی خلافت مدینہ میں اور بادشاہت شام میں ہوگی ۔ایک اور حدیث میں بالترتیب تین ادوار بتائے گئے ہیں۔

۱۔ عہد نبوت ورحمت (یہ دور رسول اللہ کی وفات پر ختم ہوگیا)

۲۔ عہد خلافت ورحمت (یہ دور حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے حضرت علیؓ تک رہا)

۳۔ عہد بادشاہی وفرمانروائی (یہ عہد خلافت بنوامیہ سے شروع ہوااور خاتمہ خلافت تک رہا)

یہ بات اہم ہے کہ احادیث میں نہایت کثرت کے ساتھ اسلام کے ایک آخری دور کی بھی خبر دی گئی ہے جو اپنے برکات کے اعتبار سے دور اول سے مشابہہ ہوگا اور جس کا حال یہ ہوگا کہ ''لایدری اولھا خیراً ام اخرھا ''یعنی نہیں کہا جا سکتا کہ امت کی ابتدا زیادہ کامیاب تھی یا اس کا اختتام؟ یہی وہ زمانہ ہوگا جب اللہ کا اعلان اپنے کامل معنوں میں پورا ہو کر رہے گا ،فرمان الٰہی ہے:

''یہ لوگ اپنے منھ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا ،خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو ،وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کردے ،خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔''

(الصف ۔۸،۹)

اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب دنیا میں اسلامی نظام سیاست کاری قائم ہو ۔نظام خلافت کے خاتمے کے بعد امتِ مسلمہ آج انتشار وافتراق کا شکار ہے ،لیکن قرآن ،احادیث بعض امکانات کی طرف اشارہ کررہے ہیں ،جن کے لیے امت مسلمہ کو مسلسل کوشش کرتے رہنا چاہئے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ خورشید احمد، اسلامی نظریہ حیات، ص ۴۶۶

۲۔ ایضاً

۳۔ اسی بنیاد پر علامہ اقبال کہتے ہیں ؎
جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

۴۔ ان اللہ لیزع بالسلطان مالا یزع بالقران (تفسیر ابن کثیر)

۵۔ یہاں خلافت اور امامت معنی و مفہوم کے اعتبار ایک دوسرے کے مترادف الفاظ ہیں

۶۔ ابن حزم، الفصل بین الملل و النحل، جلد ۴، ص ۸۷

۷۔ شاہ ولی اللہ، ازالتہ الخفاعن خلافتہ الخلفاء، فصل اول، حصہ اول

۸۔ اسلامی نظریہ حیات، ص ۴۷۴، ص ۴۸۳

۹۔ اسلامی نظریہ حیات، ص ۴۷۸، (حاشیہ)

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ اسلامی نظریہ حیات، ص ۴۹۷، (بحوالہ کتاب الخراج، ص ۸۵، از امام ابو یوسف)

۱۲۔ آر۔ این۔ کیری ہنٹ، تھیوری اینڈ پریکٹس آف کمیونزم، ص ۶، لندن ۱۹۵۱ء

۱۳۔ آرنلڈ۔ جے۔ ٹائن بی، Christianity among the religions of the world، ص ۲۹

۱۴۔ یہ متن پروفیسر خورشید احمد کی مرتبہ کتاب ''اسلامی نظریہ حیات'' ص ۴۸۳ تا ۴۸۶ لیا گیا ہے۔

۱۵۔ F.Royston Pike, Encyclopidia of Religions, Meridion Library, 1958, p.347

۱۶۔ Robert Briffault, The Making Humanity, p.113

۱۷۔ آزاد، ابوالکلام، مسئلہ خلافت، ص ۵ تا ۷، لاہور، ۱۹۷۸ء

۱۸۔ مسئلہ خلافت، ص ۸۔۹، (بحوالہ تفسیر طبری، جلد ۱۸، ص ۱۲۲)

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۰

۲۰۔ خلافت خاصہ اور خلافت ملوکی کی اصطلاحات ابوالکلام آزاد نے مسئلہ خلافت ص ۱۳۔۱۲ پر استعمال کی ہیں۔

باب بیست ودوئم

اسلام کا اقتصادی نظام

لغت کی زبان میں قصد اور اقتصاد "میانہ روی" اور "اچھے چلن" کا نام ہے مگر علمی اصطلاح میں ایسے وسائل کی "دریافت" کو کہتے ہیں جو دولت وثروت کے پیدا کرنے کے مناسب طریقے، اس کے خرچ کے صحیح استعمال اور اس کی ہلاکت و بربادی کے "حقیقی اسباب" بتا سکیں، اس لیے "علم الاقتصاد" اس علم کا نام ہے جو ان وسائل سے بحث کرنا اور ان کے صحیح و غلط ہونے پر مطلع کرتا ہو۔[۱]

علم اقتصادیات کا مترادف علم معاشیات ہے۔علمی دنیا کے قدیم و جدید مفکرین اور علماء مبصرین نے اقتصادی مسئلہ کو علمی اور عملی دونوں طریقوں سے حل کرنے کی برابر سعی کی ہے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، معاشیات کے حوالے سے نت نئے نظریات پیش کرنے اور تجربات کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔یونان کے مشہور فلسفی افلاطون [۲] (Plato) سے لے کر کارل مارکس[۳] تک معاشیات کے حوالے سے کاوشیں ہوئی ہیں، جن کی حیثیت صرف علمی نظریات کی نہیں بلکہ ان پر تجربات کر کے ان کا عملی پہلو بھی سامنے لایا گیا ہے۔خصوصاً کارل مارکس کے نظریہ اشتراکیت (Socialism) نے اپنے عملی پروگرام کے ذریعہ سے دنیا میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔کہیں اسے قبولیت عام حاصل ہوئی اور کہیں اسے سخت ردعمل کا سامنا کرنا پڑا لیکن ایک طویل تجربہ کے بعد بالآخر اربابِ دانش نے یہ جان لیا کہ جس طرح سرمایہ دارانہ نظام (Capatilism) انسانوں کے دکھ بڑھانے کا باعث بنا ہے اسی طرح اشتراکیت بھی انسانوں کی حالت میں کوئی مثبت تبدیلی نہیں لا سکی۔یہ دونوں نظام عام انسانوں میں خوشحالی اور معاشی عدل وانصاف کی فراہمی میں ناکام رہے۔اور سب سے زیادہ ناکامی اخلاقی حوالے سے آئی، ان دونوں معاشی نظریوں اور عملی تجربوں نے انسانی اخلاق کو تباہ کیا اور خالق ومخلوق

کے رشتے کو کمزور سے کمزور تر کیا، جس کے نتیجے میں دنیا میں فساد بڑھا اور امن و سلامتی کو سخت نقصان پہنچا۔ گویا نتائج کے اعتبار سے یہ دونوں نظام ہائے معاشیات ''فاسد معاشی نظام'' ثابت ہوئے۔

افلاطون اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''جمہوریہ'' (Republic) میں اقتصادی حیثیت سے انسانوں کے آزاد اور غلام دو طبقے ضروری قرار دیتا ہے اور اس طرح خدا تعالیٰ کی آقائی کی جگہ بندوں کی آقائی کی دعوت دیتا ہے اور زیردستوں پر زبردستوں کی چیرہ دستی کے لیے راہ ہموار کرتا ہے، ایک طرف صنفی تعلقات میں انارکی پیدا کر کے وہ معاشرتی نظام کو برباد کرتا ہے دوسری طرف معاشیات میں عوام و خواص کی تقسیم کو بڑی حد تک باقی رکھ کر معاشی عدل کا راستہ روکتا ہے۔ یورپ کی جمہوریت (Democracy) بھی اس دیو استبداد [۴] کی دوسری شکل ہے۔ جمہوریت میں بھی عام رفاہیت اور خوشحالی کے بجائے مخصوص مالدار طبقوں کا فائدہ ہوتا ہے، یہ عجب کرشمہ ہے کہ جمہوریت میں جس چیز کو عدل و انصاف کا نام دیا جاتا ہے وہ درحقیقت معاشی ظلم و استبداد ہے اور یہ بات جمہوریت (Democracy) کے طویل تجربے سے ثابت ہو چکی ہے۔

اسلام سے قبل یونان، روما اور فارس کا پُرشوکت تمدن اور اس کی خوش آئند حضارت، دنیائے انسانی کو مطمئن تو کیا کرتے، خود اپنی قوم اور اپنے ہم مذہب افراد کے لیے بھی دعوت عدل اور پیغام رفاہیت (خوشحالی) نہ دے سکے اور جو کچھ بھی کیا اس کا فائدہ طبقۂ امراء و سلاطین تک ہی محدود رہا۔ خصوصاً فارس کا وہ نظام تو قابلِ ذکر بھی نہیں جو مزدک [۵] کی تعلیم سے بہرہ اندوز ہوا۔ اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام دونوں نے اگرچہ عام خوشحالی اور رفاہیت کا پیغامبر بننے کی بہت کوشش کی مگر یہ دونوں دو سطحوں پر ناکام ہوئے۔

اولاً دونوں نظاموں کا تعلق ''اخلاقیات'' سے نہیں ہے، دونوں نے ایک طرف خدا سے بغاوت کر کے خالق و مخلوق کے رشتہ کو کمزور کیا اور دوسری طرف معاشرہ کو خودغرضی

مادیت پرستی اور بداخلاقی میں مبتلا کیا۔

ثانیاً: دونوں کے عملی تجربے نے معاشرے میں طبقاتی نظام کو جنم دیا، سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ داروں کا استحصالی طبقہ وجود میں آتا ہے اور اشتراکیت میں مزدور طبقے کی حکمرانی نظر آتی ہے۔

اس کے برعکس اسلام کا معاشی نظام ایک ایسے ہمہ گیر فلسفہ پر قائم ہے جس کا نام ''اسلام'' ہے جو عالمگیر دعوت اور ہمہ گیر انقلاب کا داعی ہے اور دنیائے انسانی کی صرف معاشی صلاح و فلاح کا ہی خواہشمند نہیں ہے بلکہ روحانی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی رشد و ہدایت کا بھی علمبردار ہے، اور ایک مکمل نظام حیات کا مدعی ہے۔ اس کی فکر یہ ہے کہ انسان کا منتہائے مقصود صرف دنیوی ترقی و کمال ہی نہیں ہے بلکہ سعادتِ ابدی اور رضائے الٰہی اصل مقصود ہے۔ اس لیے وہ ہر شعبۂ زندگی کے لیے ایک ''صالح نظامِ اجتماعی'' پیش کرتا ہے، اسی کا ایک شعبہ ''صالح معاشی نظام'' کا بھی ہے۔[۷]

چونکہ اسلام کا پیش کردہ ''معاشی نظام'' اسلامی اخلاقیات سے گندھا ہوا ہے، اسی لیے اسے بجا طور پر ''صالح معاشی نظام'' کہا جا سکتا ہے کہ اس نظام کے تجربے کی صورت میں معاشرہ میں انسانوں کی نہ صرف معاشی حالت سدھرتی ہے بلکہ معاشرہ کی اخلاقی حالت میں بھی بہتری آتی ہے۔ اسلام فرد و جماعت دونوں کے ذہن سے اس باطل نظریے کو ختم کرتا ہے کہ اخلاق اور مذہب کا تعلق معاشی زندگی سے نہیں اور ''تجارت تو بس تجارت ہے''۔ قرآن پاک بڑے بلیغ انداز میں معیشت اور اخلاق کا تعلق بیان کرتا ہے:

> ''مسلمانو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو تم اللہ کی یاد کی طرف دوڑو اور لین دین چھوڑ دو۔ اگر تم چاہتے ہو تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ پھر جب نماز ختم ہو جائے تو تم زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو۔ تاکہ تم فلاح پاؤ۔'' (الجمعہ: ۹۔۱۰)

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر معاش کو "فضل اللہ" کہا گیا ہے، اور اس سے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی ہے کہ یہ سب خدا کی عنایت سے ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ معاشی زندگی کو بھی انسان اسی طرح خدا کی حدود کا پابند بنائے جس طرح باقی تمام زندگی کو بناتا ہے۔ ناپ تول میں کمی اللہ کے نزدیک اتنا بڑا گناہ تھا جس کی وجہ سے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کو عذاب الٰہی کے نتیجے میں تباہ و برباد کر دیا گیا۔ یہ وہ بنیادی نقطہ نظر ہے جس کی وجہ سے اسلامی معاشیات کا انداز (approch) اخلاقی اور قدر شناسانہ (normative) [۸] ہے۔ ہر نظام کسی نہ کسی فکر کے تابع ہوتا ہے، اگر فکر صالح ہے تو ایک صالح نظام وجود میں آئے گا جو انسانیت کے لیے فائدہ مند ہوگا۔ اگر فکر فاسد ہے تو نتیجہ میں جو نظام سامنے آئے گا وہ بھی فاسد ہوگا اور اس کے عملی تجربے سے انسانیت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

اسلام کے پیش کردہ معاشی اصول:

قرآن میں ایسے معاشی اصول ملتے ہیں جن کی بنیاد پر کسی بھی زمانے میں عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ایک معاشی نظام تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ وہ اہم بنیادی اصول یہ ہیں۔

ا۔ حق معیشت میں مساوات:

یعنی ہر فرد کو معاشرے میں معاشی جدوجہد کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ اسلام کے پیش کردہ معاشی نظام کا پہلا اساسی اصول یہ ہے کہ اس نے حق معیشت میں تمام افراد کو مساوی رکھا ہے۔ ہر فرد کو اس بات کا یکساں حق ہے کہ وہ اپنے اور اپنے زیر کفالت لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اور حصول معاش کے لیے جدوجہد کرے۔ اسلام نے ساری زمین بلکہ پوری کائنات کو انسان کے لیے میدان عمل قرار دیا ہے اور انسان کو ترغیب دی ہے کہ وہ اپنی معاش کے حصول اور خلق خدا کی فارغ البالی کے لیے زیادہ سے زیادہ جدوجہد کرے۔ معاشیات کی اصطلاح میں اسے پیداوار کو بڑھانے (Maximisation of

(Production کی پالیسی بھی کہہ سکتے ہیں۔[۹] اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور بے شک ہم ہی نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی اور اس میں تمہارے لیے
سامانِ معاش پیدا کیے۔'' (الاعراف: ۱۰)

اس بنیادی حقیقت کے اظہار کے بعد اسلام نے انسانوں کو مختلف طریقوں سے محنت، معاشی جدوجہد اور حصولِ رزق کی کوششوں پر اکسایا ہے اور اس طرح ہر شخص کو فروغ پیداوار کے لیے سرگرمِ عمل کر دیا ہے۔ رسول اللہ کا فرمان ہے کہ جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنی روزی کی تلاش سے غافل ہو کر سوتے نہ رہو (کنز العمال) بے عملی، بے روزگاری اور گداگری سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا، اس پر سخت وعید سنائی گئی، ایک حدیث میں رسول اللہ نے فرمایا کہ تمہارے لیے کام کرنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ قیامت کے دن تم اپنے چہرے پر سوال کا داغ لیے ہوئے آؤ۔ (ابوداؤد)

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

''جو شخص دنیا کو جائز طریقے سے حاصل کرتا ہے تاکہ سوال سے بچے اور اہل و عیال کی کفالت کرے اور ہمسائے کی مدد کرے تو قیامت کے دن جب وہ اٹھے گا تو اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی مانند روشن ہوگا۔''[۱۰]

قرآن پاک میں اللہ کا ارشاد ہے:

''اور دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولو۔'' (القصص: ۷۷)

رسول اللہ نے فرمایا:

''حلال معیشت کا طلب کرنا اللہ تعالیٰ کے فریضہ عبادت کے بعد (سب سے بڑا) فریضہ ہے۔''
(کنز العمال)

رسول اللہ نے اسے بعض گناہوں کا کفارہ بھی بتایا ہے۔ فرمایا:

''بعض گناہوں میں سے ایسے گناہ ہیں جن کا کفارہ صرف طلبِ معیشت کی فکر اور جدوجہد میں

کاوش ہی سے ہو سکتا ہے۔''[۱۱]

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص بھی طلبِ رزق کی جدوجہد میں پست ہمت ہو کر نہ بیٹھ جائے۔''[۱۲]

یہی وجہ ہے کہ اسلامی فقہ میں معاشی جدوجہد کو فرض عین اور پیداوار کو فروغ دینے کی کوشش کو فرض کفایہ قرار دیا گیا ہے۔ الغرض اسلامی معاشیات کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ تمام انسانوں کے لیے سہولتیں فراہم کی جائیں۔ قدرت نے جو وسائل ودیعت کیے ہیں ان کو ترقی دی جائے۔ پیداوار کو امکانی حد تک بڑھایا جائے اور رزق کے خزانوں کو چند ہاتھوں میں اس طرح مرکوز نہ ہونے دیا جائے کہ دوسروں پر اس کے دروازے بند ہو جائیں۔

گویا معیشت اور اسبابِ معیشت خدائے تعالیٰ کے خزانہ عامرہ کی ایسی عطا و بخشش ہے کہ جس سے فائدہ اٹھانے کا ہر جان دار کو برابر کا حق ہے اور یہ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر فرد کے حقِ معیشت کی نگرانی کرے، اس کے دائرہ حکومت میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو حق معیشت سے محروم کر دیا گیا ہو۔

۲۔ درجاتِ معیشت میں تفاوت:

اسلامی معاشی نظام کا دوسرا اصول یہ ہے کہ اگرچہ حقِ معیشت میں سب مساوی ہیں لیکن درجاتِ معیشت میں مساوی نہیں اور معیشت میں درجات کا یہ تفاوت (فرق) ایک حد تک فطری ہے یعنی یہ ضروری نہیں کہ سب کے لیے سامان معیشت ایک ہی طرح کا ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ ہو سب کے لیے۔

تاہم اسلام تقاضا کرتا ہے کہ درجات کا یہ تفاوت حد اعتدال میں رہنا چاہیے اور کسی حالت میں بھی لوگوں کے درمیان وجہ ظلم نہیں بننا چاہیے۔ یعنی معاشرے میں تفاوتِ درجات تو ہو لیکن ایسا نہ ہو کہ وہ انسانوں کو اس طرح دائمی طبقات میں تقسیم کر دے کہ ایک کی ترقی دوسرے

کے فقر وافلاس کا سبب بنے اور دوسرا پہلے کے معاشی اغراض کا آلہ کار بن کر رہ جائے۔

قرآن کریم نے اس تفاوتِ درجات کو اس طرح بیان کیا ہے:

''دینوی زندگی میں ہم نے لوگوں کی معیشت ان کے درمیان تقسیم کر دی ہے اور اس کو اس طرح کر دیا کہ بعض کو بعض پر درجۂ معیشت میں بلندی حاصل ہے۔'' (سورۃ زخرف)

یہی بات اس طرح بیان کی گئی ہے:

''اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق میں فراخی دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگی ڈالتا ہے۔'' (سورۃ رعد)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ خالقِ کائنات نے ایسا کیوں کیا کہ دنیا میں بعض کو امارت عطا کی اور بعض کو غربت۔ اس کا جواب قرآن یہ دیتا ہے۔

''اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا، اور بعض کو بعض پر مرتبے دیئے، تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے۔''

(سورۃ انعام)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ درجاتِ معیشت میں تفاوت بغرض آزمائش ہے، امیروں کی آزمائش ان کی دولت و ثروت میں ہے، اللہ تعالیٰ نے کسی صاحبِ ثروت کو دولت اس لیے عطا نہیں کی کہ وہ غریبوں کی غربت میں اضافہ کا باعث بنے، بلکہ اس کی دولت اللہ تعالیٰ کی وہ امانت ہے جو اجتماعی نظام کے زیرِ فرماں، غرباء مساکین کی غربت کو کم یا ختم کرنے کے لیے استعمال ہونی چاہیے اسی طرح اسلامی معاشرے میں صاحبِ ثروت کی دولت، غربا و مساکین کے لیے عین راحت و رحمت ثابت ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل دولت کے اموال پر ان کے غریبوں کی معاشی حاجت کو بدرجہ کفالت پورا کرنا فرض کر دیا ہے پس اگر وہ بھوکے ننگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہوں گے محض اس لیے کہ اہل ثروت اپنا حق ادا نہیں کرتے تو اللہ

تعالیٰ قیامت کے دن ان سے باز پرس کرے گا اور اس کوتاہی پر ان کو عذاب دے گا۔[۱۴]

قرآن کہتا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی، پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جس کو زیادہ رزق دیا گیا ہے وہ اپنی روزی سے اپنے زیر دستوں کو لوٹا دے حالانکہ اس (روزی) میں سب برابر کے حق دار ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے؟۔'' (نحل)

گویا درجاتِ معیشت میں تفاوت کی مصلحت دراصل بندوں کی آزمائش ہے۔ بعض کو اللہ تعالیٰ دولت دے کر آزماتا ہے اور بعض کو غربت دے کر آزماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک طرف صاحب ثروت افراد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی دولت کو محض ذاتی ملکیت نہ سمجھیں بلکہ اس میں معاشرے کے مساکین کا حق ہے جو جس قدر زیادہ کمائے گا اس پر اسی قدر اجتماعی حقوق عائد ہوں گے پس وہ صرف اپنے لیے نہیں کماتا بلکہ جماعت کے دوسرے افراد کے لیے بھی کماتا ہے۔ دوسری جانب اسلام غربا سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ متمول افراد کی دولت و ثروت کو دیکھ کر خدا کے ساتھ ناشکری اور کفر کا رویہ اختیار نہ کریں اور نہ حسد اور بغض کو دل میں جگہ دیں بلکہ جو کچھ انہیں حاصل ہے اس پر قناعت کریں اور اللہ کے شکر گزار بندے بنے رہیں اور اگر ان میں صلاحیت ہے تو پھر عملی جدوجہد میں آگے بڑھ کر اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق ان تمام حقوق معیشت سے فائدہ اٹھائیں اور اگر خوشحال ہو جائیں تو اسے اپنی محنت سے زیادہ اللہ کی رحمت کا نتیجہ سمجھتے ہوئے دوسرے افرادِ معاشرہ کے حقوق کو اسی طرح ادا کریں جو اسلام کا اہل ثروت سے تقاضا ہے۔

۳۔ احتکار و اکتناز کی حرمت:

اسلام کا ایک اہم معاشی اصول یہ ہے کہ کہ وہ احتکار اور اکتناز کو حرام قرار دیتا ہے۔

''احتکار'' کا مطلب ناجائز وسائل معیشت سے مال اکٹھا کرنا اور ''اکتناز'' سے مراد ہے اجتماعی حقوق کو نظر انداز کر کے دولت کو خزانہ کرنا۔

جہاں تک احتکار کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ کا صرف یہی حکم نہیں ہے کہ رزق حلال کمایا جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ حلال ذرائع سے کمایا جائے۔اس کی مثال یہ ہے کہ تجارت ایک جائز ذریعہ معاش ہے لیکن شراب و منشیات کی تجارت حرام ہے۔کیونکہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں ایک فریق (تاجر) کا فائدہ، دوسرے فریق (خریدنے یا استعمال کرنے والے) کے یقینی نقصان پر مبنی ہے۔یہی معاملہ جوا، سٹہ اور لاٹری کا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

''یہ لوگ آپ سے شراب اور قمار کے متعلق دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے ان دونوں باتوں میں بڑا گناہ ہے۔'' (البقرہ)

اسی طرح دولت کو سمیٹ سمیٹ کر خزانہ بنانے کی بھی سخت ممانعت آئی ہے۔اسلام چاہتا ہے کہ دولت خاص حلقوں اور مخصوص طبقوں میں محدود نہ ہو جائے بلکہ زیادہ سے زیادہ تقسیم ہو اور گردش کرے۔

''اور جو لوگ خزانہ بنا کر رکھتے ہیں سونے اور چاندنی کو اور اس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔جس روز کہ اس مال پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی، پھر اس سے داغی جائیں گی ان کی پیشانیاں، پہلو اور ان کی پیٹھ (اور ان سے کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے واسطے گاڑ رکھا تھا، اور چکھو مزہ اپنے گاڑنے کا۔'' (سورۃ توبہ)

قرآن، خرچ کرنے کی حکمت یہ بتاتا ہے:

''فقرا، مساکین، قرابت داروں اور یتیموں وغیرہ پر اللہ نے جو خرچ کرنے کا یہ طریقہ بتایا ہے اس لیے ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت صرف دولت مندوں

میں ہی محدود ہو کر رہ جائے۔'' (سورۃ حشر)

قرآن بار بار خرچ کرنے کی تاکید کرتا ہے:

''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔'' (سورۃ البقرہ)

ان آیات میں مال کو جمع کر کے رکھنا سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے اس کی جگہ خرچ کرنے کی فضیلت آئی ہے۔ خرچ کرنے کے بہت سے طریقے ہیں، زکواۃ، صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کی مد میں رقم خرچ کی جاسکتی ہے۔ قانونِ وراثت بھی اسی حکمت پر مبنی ہے کہ دولت ایک جگہ جمع ہونے کے بجائے تقسیم ہو اور پھیلے تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد کو فیض پہنچ سکے۔ زکواۃ اور صدقات واجبہ کے علاوہ بھی اگر ضرورت محسوس ہو تو اسلامی حکومت کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں سے مزید مال بطور ٹیکس لے اور اسے استحکامِ ریاست، قیامِ انصاف اور فلاحِ عامہ کے لیے خرچ کرے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ: ''بے شک مال میں زکواۃ کے سوا اور بھی حق (حق سوئی زکواۃ) ہے۔'' (ترمذی)

۴۔ سرمایہ اور محنت میں عادلانہ توازن:

اسلام، محنت اور سرمایہ کے درمیان صحیح اور عادلانہ توازن قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ ایک کو دوسرے کے جبر و استبداد سے بچایا جا سکے۔ مزدور سے بیگار نہ لی جائے اور اس کو اس کی اُجرت پوری دی جائے۔ ناپ تول میں کمی نہ کی جائے، ربوا (سود) قمار (جوا) وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اللہ نے بیع (خرید و فروخت کے معاملات) کو حلال اور ربوا (سودی کاروبار) کو حرام کر دیا ہے۔'' (البقرہ)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

''بے شک! شراب، جوا بت اور پانسے ناپاک ہیں، کارِ شیطان ہیں، بس ان سے بچو۔'' (المائدہ)

ایک اور جگہ قرآن کہتا ہے:

''خرابی ہے کمی کرنے والوں کے لیے جب ماپ کرلیں تو لوگوں سے تو پورا پورا بھرلیں اور جب ان کو ماپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں۔'' (مطففین)

دراصل اسلام معاشی معاملات میں ''باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل'' کا خواہش مند ہے اور یہ تعاون ایسے صحیح اور صالح طریقوں پر مبنی ہونا چاہئے کہ اس سے نظامِ تمدن میں ابتری نہ پھیل جائے اور ایک کا فائدہ دوسرے کے نقصان پر موقوف نہ ہو جیسا کہ جوا (قمار) یا اس کی جدید اور ''مہذب'' طریقوں مثلاً سٹہ اور لاٹری وغیرہ میں ہوتا ہے۔ نیز اسلام میں وہ معاملات بھی ناجائز اور حرام ہیں جن میں اگرچہ بظاہر باہمی رضا مندی نظر آتی ہے لیکن اس کی تہہ میں زبردستی کے سوا اور کچھ نہ ہو مثلاً ربوا (یعنی سودی لین دین) جو سب سے بڑا معاشی ظلم ہے اور ایسے تمام معاملات جن میں ایک جانب سرمایہ دار کا سرمایہ ہے اور دوسری جانب ایک مفلس و نادار کی اضطراری ضرورت۔ سرمایہ دار، مفلس کے افلاس اور اس کی اضطراری حاجت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اجارہ رہن اور دوسرے معاملاتِ لین دین میں اس سے ایسی شرائط منظور کرالیتا ہے جو کسی طرح بھی عادلانہ نہیں، مگر مفلس کے افلاس اور ضرورت مند کی ضرورت نے ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس قسم کے تمام معاملات اگرچہ باہمی رضا مندی سے ہی طے پائیں، اسلام کے نزدیک ظلم ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے معاملات کا آخری نتیجہ عوام کی فلاکت و افلاس اور ایک مخصوص طبقہ کی اجارہ داری کے سوائے اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے اسلام کے معاشی نظام میں مہاجنی سودی کاروبار کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے اور سودی بینکوں کا نظام بھی ناقابل قبول ہے۔ نیز اس کے نزدیک تاجروں کے وہ تمام طریقہ ہائے تجارت بھی حرام ہیں جن میں اجیر (مزدور، محنتی) کے جائز اور عادلانہ اُجرت و حقوق کی حق تلفی ہو اور اس کے اضطرار

اور پریشان حالی سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہو۔ وہیں دوسری طرف اجیر کی وہ خیانت بھی ناجائز ہے جس سے صاحب سرمایہ کو ناحق نقصان پہنچایا جائے۔[۱۴]

۵۔ حلال و حرام کی تمیز:

اسلام اس بات کی پابندی کراتا ہے کہ آمدنی جائز ذرائع سے حاصل کی جائے۔ ہر نفع کو جو حرام ذرائع سے حاصل ہو، وہ دوزخ کی آگ قرار دیتا ہے۔ قرآن و حدیث میں رزق حلال کی جتنی اہمیت بیان کی گئی ہے وہ اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں صرف جائز اور حلال رزق کے فروغ کی کوششیں ہوں گی اور ان تمام ذرائع کا کلی انسداد کیا جائے گا جو حرام ہیں اور جن کو شریعت ناروا اور ناجائز قرار دیتی ہے۔ اسلام افراد کو پابند کرتا ہے کہ وہ جو کمائے وہ ''حلال'' ہو اور دوسرے یہ کہ جن طریقوں سے حاصل کیا جائے وہ ''طیب'' ہوں۔

قرآن کہتا ہے:

''اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال طیب کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو، بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔'' (البقرہ)

ایک اور جگہ فرمایا:

''پس اللہ نے جو کچھ تم کو رزق دیا ہے اس میں سے حلال، طیب کھاؤ۔'' (المائدہ)

یہ ایک ایسا اصول ہے جس سے آج کے دور کی معاشیات بالکل ناآشنا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی اشیا حرام ہیں اور کونسی حلال، نیز طیب ذرائع کیا ہیں اور خبیث ذرائع کیا ہیں۔ قرآن نے حرام و حلال اشیا کا تذکرہ کر دیا ہے، جیسے سود، شراب، جوا، قمار، سٹہ، بت اور پانسے وغیرہ۔ نیز ہر وہ مال بھی حرام ہے جو کسی کا حق مار کر حاصل کیا گیا ہو، اسی طرح ہر وہ ذریعہ (Source) بھی خبیث ہوگا جس میں ظلم کا شائبہ بھی ہو۔ اسلام نے جن چیزوں کو حرام کہا ہے

اگر ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ چیزیں ہیں جو یا تو فرد اور معاشرے کی جسمانی اور اخلاقی زندگی کو مجروح کرتی ہیں اور یا انسانوں کے مابین معاشی تعاون، اور خیر خواہانہ فضا کو مسموم کرتی ہیں اس کی ایک مثال سود ہے۔ اسلام نے سود کو اس کی ہر شکل میں حرام قرار دیا ہے، سود مفرد ہو یا مرکب، ذاتی قرضوں پر لیا جائے یا تجارتی اور پیداواری قرضوں پر، حرام ہے اور اس کے لینے والے کو خدا اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"اے ایمان والو! سود کے کئی کئی حصے بڑھا چڑھا کر نہ کھاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔" (آل عمران ۔۱۳۰)

ایک حدیث میں رسول اللہ نے سود کھانے والے پر، سودی دستاویزات لکھنے والوں پر، اور سودی کاروبار کے گواہوں پر لعنت بھیجی ہے اور سب کو برابر قرار دیا ہے۔ (صحیح مسلم) اسلام میں سود کی مخالفت محض اخلاقی بنیادوں ہی پر نہیں ہے بلکہ اس کے خطرناک اقتصادی، سماجی اور سیاسی مضمرات بھی ہیں۔ سود کی لعنت متعدد قدیم معاشروں کی تباہی کا سبب بنی ہے اور آج بھی جدید سرمایہ دارانہ معیشت کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ اس کی بنیاد استحصال اور ظلم پر ہے اور اس کی وجہ سے ملکی معیشت پر چند سرمایہ داروں کا اقتدار مسلط ہو جاتا ہے جو صحت مند معاشی جدوجہد کو ختم کر دیتا ہے اور معیشت میں عدم استحکام کا باعث ہوتا ہے۔

۶۔ صَرف میں میانہ روی:

کسبِ معاش کے بعد دوسرا مسئلہ صَرف وخرچ کا ہے، یعنی کہ جو مال حلال وطیب ذرائع سے کمایا ہے وہ کس پر اور کس قدر خرچ کیا جائے۔ اس کے لیے قرآن نے بہترین جواب "میانہ روی" اور "اعتدال" سے دیا ہے۔ یعنی خرچ کرتے ہوئے اسراف وتبذیر سے بھی بچا جائے اور بخل وکنجوسی سے بھی۔ کسی جائز کام میں حد سے زیادہ خرچ کرنا "اسراف" ہے، مثلاً

شادی بیاہ یا دیگر تہواروں پر بے دریغ خرچ کرنا اسراف ہے۔ ''تبذیر'' یہ ہے کہ لہو ولعب اور لغویات میں رقم اڑائی جائے۔ اور بخل یہ ہے کہ جہاں خرچ کرنے کی ضرورت ہے وہاں بھی خرچ نہ کیا جائے۔

البتہ یہاں ایک باریکی ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''مجاہد کہتے ہیں کہ اگر شخص نے ''حق'' کی خاطر سب کچھ خرچ کر ڈالا تو یہ اسراف نہیں ہے اور اگر اپنا تھوڑا مال بھی ''ناحق'' (یعنی باطل پر) خرچ کر ڈالا تو یہ تبذیر ہے۔ قتادہ کہتے ہیں تبذیر نام ہے مال کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، ناحق اور فساد کے موقع پر صَرف کرنے کا۔ [۱۵] اس کی مثال یہ دی جاسکتی ہے کہ جنگ تبوک کے موقع پر لشکر کی تیاری کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنا سارا مال رسول اللہ کے سپرد کردیا۔ اسے ''اسراف'' نہیں کہا جائے گا کیونکہ حق کے لیے کل مال بھی خرچ کر دیا جائے تو اسراف نہیں ہے اسی طرح لہو ولعب یا معصیت کے کاموں میں معمولی سی رقم کا خرچ کرنا بھی 'تبذیر' ہے۔ اسی طرح بخل سے بھی روکا گیا ہے اور بخیل کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

''اور اپنے ہاتھ کو نہ اپنی گردن کے ساتھ ہی باندھ لو (یعنی بخل نہ کرو) اور نہ بالکل ہی کھول دو (یعنی اسراف نہ کرو)۔'' (بنی اسرائیل)

گویا خرچ کرنے میں پسندیدہ راستہ میانہ روی اور اعتدال کا ہے لیکن خاص حالات میں 'ایثار علی النفس' اولیٰ اور افضل ہے یعنی اگر انسان ضبط نفس اور صبر و استقامت کے درجہ کمال پر فائز ہے تو انفاق فی سبیل اللہ میں تمام مال کو صرف کردینا محبوب ہے، تاہم اس کا مطالبہ ہر شخص سے نہیں کیا گیا ہے۔ کیونکہ ہر شخص ایمان کے اس درجہ کمال پر نہیں ہوتا کہ اپنا سب کچھ راہِ حق میں لٹا دے۔ اس کے لیے پھر میانہ روی ہی بہتر ہے۔ ایک مالدار شخص کے اس سوال پر کہ میں اپنا کل مال خدا کی راہ میں بذریعہ وصیت دینا چاہتا ہوں، رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے ورثا کو صاحبِ مال چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ وہ محتاج رہ جائیں اور بھیک مانگتے پھریں۔ [۱۶]

۷۔عدل اجتماعی کی ضمانت:

اسلام ریاست کے معاشی وظائف کا بھی ایک مثبت تصور پیش کرتا ہے اور سماجی فلاح اور معاشی انصاف کے قیام کو اس کی اولین ذمہ داری قرار دیتا ہے۔زکواۃ سماجی فلاح کی ایک اسکیم ہے جس کے نظام کو ریاست کے ہاتھوں قائم کیا جاتا ہے،معاشی قانون سازی اور عدلیہ کی طاقتوں کے ذریعہ ریاست عدل اجتماعی قائم کرتی ہے۔جس کا کوئی وارث نہیں اس کی ریاست وارث ہے اور جس کا کوئی ولی نہیں،اس کی ریاست ولی ہے۔ناداروں،اپاہجوں اور محتاجوں کی مدد ریاست کا فرض ہے اور یہ بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ تمام شہریوں کو ان کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرے۔

السلطان ولی من لا ولی له ۔

حکومت ہر اس شخص کی ولی (دست گیر و مددگار) ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔(بخاری)

ایک اور حدیث میں ہے:

من ترک کلا فالینا۔(بخاری،مسلم)

یعنی جس مرنے والے نے ذمہ داریوں کا کوئی بار (مثلاً قرض یا بے سہارا کنبہ) چھوڑا ہو وہ ہمارے ذمے ہے۔

حضرت عمرؓ نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

”خدا کی قسم! اگر میں زندہ رہا تو صفا کی پہاڑیوں میں جو چرواہا اپنی بکریاں چراتا ہے اس کو اس مال میں سے حصہ پہنچے گا اور اس کے لیے اس کو کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔“

اور یہ کہا:

”خدا کی قسم! اگر اہل عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لیے زندہ رہ گیا تو ان کو اس

حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد ان کو کسی اور امر کی مدد کی احتیاج باقی نہ رہے گی۔''

حضرت علیؓ نے اس بات کو اس طرح ادا کیا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے دولت مند لوگوں پر ان کے اموال میں اتنی مقدار مقرر کی ہے جو غربا کے لیے کافی ہو سکے۔ اس کے باوجود اگر وہ بھوکے، ننگے اور تنگ دست ہوں تو یہ صرف دولت مندوں کی عدم توجہی اور بخل کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ ان امرا سے قیامت کے دن محاسبہ کرے گا۔''

ان احکام کے مطابق جو نظام قائم ہوتا ہے اس میں زمین اپنے خزانے اُگل دیتی ہے اور آسمان اپنی نعمتوں کی بارش کرنے لگتا ہے اور افلاس و تنگ دستی ختم ہو جاتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''اے لوگو! صدقہ دو کیوں کہ تم پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ آدمی صدقہ لیے لیے پھرے گا مگر وہ کسی ایسے شخص کو نہ پائے گا جو اسے قبول کرے۔ (یعنی اس کا حاجت مند ہو)۔''

یہ ہے اسلام کا معاشی نظام، اور درحقیقت انسانیت کی نجات انہی اصولوں میں مضمر ہے۔ اس کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مرکزی تصور انسان اور اس کی معاشی اور اخلاقی فلاح ہے۔ وہ معاشی ترقی کو اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ سماجی انصاف، آزادی اور اخلاقی ترقی کو اولین اہمیت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے اس کا معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اپنے مقصد اپنے مزاج اور اپنے اصولوں کے اعتبار سے مختلف ہے اور ہر حیثیت سے ان سے اعلیٰ اور برتر ہے۔ [۱۷]

حواشی وحوالہ جات

[۱] سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، اسلام کا اقتصادی نظام، ص ۱۸، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۴ء

[۲] یونان کا مشہور فلسفی جس نے اپنی مشہور تصنیف ''جمہوریہ'' (Republic) میں بعض معاشی اصول بیان کیے ہیں، اس کتاب کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

[۳] مارکسی کمیونزم کا بانی کارل مارکس (KARL MARX) ۵ مئی ۱۸۱۸ء کو جرمنی میں پیدا ہوا، اس کا خاندان متوسط یہودی طبقہ سے تعلق رکھتا تھا تاہم اس کے باپ یائن رک مارکس نے یہودیت ترک کر کے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ کارل مارکس نے اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بون یونی ورسٹی سے قانون کی تعلیم حاصل کی، بعد ازاں برلن یونی ورسٹی سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مارکس ایک اخبار کا اڈیٹر بن گیا۔ اس دوران اس کی ملاقات فریڈرک اینگلز سے ہوئی۔ دونوں کے نظریات میں کافی ہم آہنگی تھی۔ دونوں نے مل کر کمیونسٹ تحریک منظم کی مگر حکومت نے انہیں جلاوطن کر دیا۔ یہ ۱۸۴۹ء کا سال تھا چنانچہ کارل مارکس لندن آ گیا، جلاوطنی کے دوران اس نے کمیونزم کا وہ منشور (Manifesto) تیار کیا جو بھاری اکثریت سے منظور ہو گیا۔ کارل مارکس نے کمیونسٹ مزدوروں کی پہلی جماعت قائم کی۔ وہ واپس جرمنی آ کر مختلف اخباروں میں مضامین لکھ کر گزر بسر کرتا رہا۔ اسی اثنا میں اس کے دو کم عمر بچے فوت ہو گئے اور وہ ان کے لیے کفن دفن کا انتظام بھی نہ کر سکا، بالآخر فریڈرک اینگلز نے اس کی مالی مدد کرنی شروع کر دی۔ مسلسل غربت وافلاس اور ناکامیوں کے باعث وہ سرمایہ داروں کا شدید مخالف ہو گیا۔

۱۴ ستمبر ۱۸۶۷ء کو کارل مارکس کی مشہور کتاب ''داس کیپٹل'' (Das Capital) شائع ہوئی۔ کارل مارکس کی یہ کتاب سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ایک فردِ جرم تھی جس میں سرمایہ دارانہ نظام کے استحصالی طریقوں کی اصلیت آشکار کی گئی تھی، مارکس نے اس کتاب میں ایک ایسے معاشرے کے خدوخال مرتب کیے جہاں ہر شخص سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق روٹی، کپڑا اور مکان فراہم کیا جائے اس کتاب نے دنیا پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ ۱۹۱۷ء کا انقلاب روس اس کتاب کی عملی تفسیر تھا۔

۱۸۸۱ء میں کارل مارکس کی بیوی سرطان میں مبتلا ہو کر مر گئی ایک ماہ بعد اس کی بڑی بیٹی بھی چل بسی ،۱۴، مارچ ۱۸۸۳ء کو کارل خود بھی انتقال کر گیا ، لندن کے ہائی گیٹ قبرستان میں دفن ہوا۔ فریڈرک اینگلز نے کارل کی نامکمل کتابوں کی تکمیل کی۔

[۴] علامہ اقبال، جمہوریت (Democracy) کو استبداد (ظلم) کا دیو کہتے ہیں ۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب   تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

[۵] مزدک کی اقتصادی تعلیمات کے لیے دیکھئے اسی کتاب کا باب پنجم "ایرانی تہذیب"

[۶] اسلام کا اقتصادی نظام، ص ۱۹

[۷] ایضاً، ص ۲۴

[۸] خورشید احمد، اسلامی نظریہ حیات، ص ۴۵۰، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۱۹۷۹ء

[۹] ایضاً، ص ۴۵۱

[۱۰] اسلامی نظریہ حیات، ص ۴۵۳، بحوالہ اساس تہذیب، از عبداللطیف، بحوالہ ابوالنعیم فی الحلیہ)

[۱۱] اسلام کا اقتصادی نظام، ص ۶۳، (بحوالہ الاوسط، از طبرانی والحلیہ از نعیم)

[۱۲] ایضاً، (بحوالہ احیاء العلوم، جلد۔۲، ص ۵۷)

[۱۳] ایضاً،

[۱۴] ایضاً، ص ۴۵

[۱۵] ابن کثیر، حافظ عماد الدین، تفسیر ابن کثیر، جلد۔۶، ص ۶۳

[۱۶] اسلام کا اقتصادی نظام، ص ۷۰، (بحوالہ بخاری، کتاب الوصایا)

[۱۷] اسلامی نظریہ حیات، ص ۴۶۳

کتابیات

(۱) ابن خلدون، مقدمہ، مترجم سعد حسن خان یوسفی، کراچی (تاریخ ندارد)

(۲) ابن قیم، علامہ، حافظ، زادالمعاد، مترجم سید رئیس احمد جعفری ندوی، نفیس اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۲ء

(۳) ارسطو، سیاسیات، انگریزی سے اردو ترجمہ سید نذیر نیازی، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۵۹ء

(۴) آرنلڈ، ٹی "دی لیگیسی آف اسلام" اردو ترجمہ میراث اسلام، مترجم عبدالمجید سالک، ترقی اردو ادب، لاہور (تاریخ ندارد)

(۵) اصلاحی، صدرالدین، اسلام ایک نظر میں، اسلامی پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۷۵ء

(۶) اقبال، ڈاکٹر محمد، فلسفہ عجم، مترجم میر حسن الدین، کراچی ۱۹۶۹ء

(۷) امام بخاری، صحیح بخاری، مترجم امجد العلی ودیگر، محمد سعید اینڈ سنز، کراچی

(۸) اے۔جے۔آربری، میراث ایران، مترجم سید عابد علی عابد، لاہور، ۱۹۶۲ء

(۹) بدخشانی، مقبول بیگ، تاریخ ایران، (دوجلدیں) لاہور، ۱۹۶۷

(۱۰) پلوٹارک، مشاہیر یونان وروما، مترجم سید ہاشمی، ۱۹۶۱ء

(۱۱) ٹائن بی، آرنلڈ جے، مطالعہ تاریخ (ASTUDY - OF - HISTORY) تلخیص ڈی۔سی۔سومرویل، مترجم غلام رسول مہر، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۳ء

(۱۲) جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، ایلیٹ پبلشرز لمیٹڈ، کراچی ۱۹۷۳ء

(۱۳) حتی، فلپ، تاریخ شام، مترجم غلام رسول مہر، طبع اول، ۱۹۶۲ء

(۱۴) دین محمد شفیقی، عہدی پوری، فلسفہ ہندویونان، لاہور ۱۹۶۲

(۱۵) دیانند سرسوتی، ستیارتھ پرکاش (مستند اردو ترجمہ) لاہور، ۱۹۲۷

(۱۶) سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن، ناشران قرآن

لمیٹڈ' لاہور' پہلا ایڈیشن
(۱۷) وہی مصنف' اسلام کا اقتصادی نظام' ادارہ اسلامیات' لاہور ۱۹۸۴ء
(۱۸) شاہین مکاریوس' تاریخ ایران' مصر' ۱۸۹۰ء
(۱۹) صدیقی' محمد ادریس' وادیٔ سندھ کی تہذیب' محکمۂ آثار قدیمہ' کراچی
۱۹۵۹ء
(۲۰) صدیقی' عبدالمجید' عقیدہ ختم النبوت کے چند عمرانی پہلو' طبع اول' مرکز
مطبوعات اسلامیہ لاہور۔ ۱۹۷۴ء
(۲۱) طبری' ابی جعفر محمد بن جریر' تاریخ طبری' مولوی سید محمد ابراہیم' دارالطبع
جامعہ عثمانیہ حیدر آباد - دکن
(۲۲) عابد حسین' ڈاکٹر سید' قومی تہذیب کا مسئلہ' انجمن ترقی اردو (ہند) علی
گڑھ' ۱۹۵۵ء
(۲۳) عین الحق' قدیم مشرق' مکتبۂ فریدی' اردو کالج' کراچی' ۱۹۵۸ء
(۲۴) وہی مصنف' تہذیبیں' طبع اول' کراچی ۱۹۶۶ء
(۲۵) غزالی' امام محمد' کیمیائے سعادت اردو ترجمہ' کراچی
(۲۶) وہی مصنف' احیاء العلوم' مترجم محمد احسن صدیقی' دارالاشاعت' کراچی
۱۹۷۹ء
(۲۷) گستاو لیبان' تمدن ہند' مترجم سید علی بلگرامی' مقبول اکیڈمی' لاہور
(۲۸) وہی مصنف' تمدن عرب' مترجم سید علی بگرامی' لاہور ۱۹۶۰ء
(۲۹) محمد قطب "شبہات حول الاسلام" اردو ترجمہ' اسلام اور جدید ذہن کے
شبہات' مترجم محمد سلیم کیانی' لاہور
(۳۰) محمد فواد' عبدالباقی' "معجم المفہرس" کراچی
(۳۱) مصطفیٰ سباعی' اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو' مترجم سید معروف شاہ
شیرازی' لاہور ۱۹۷۶ء

(۳۲) مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن (۶ جلدیں) ادارہ ترجمان القرآن۔ لاہور ۱۹۸۴ء

(۳۳) وہی مصنف، الجہاد فی الاسلام، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور ۱۹۸۸ء

(۳۴) وہی مصنف، اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۸۹ء

(۳۵) وہی مصنف، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۶۶ء

(۳۶) وہی مصنف، تفہیمات (۴ جلدیں) ادارہ ترجمان القرآن، لاہور ۱۹۸۹ء

(۳۷) ندوی، سید ابوالحسن علی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۷۶ء

(۳۸) ندوی، سید سلیمان، خطبات مدارس، کراچی ۱۹۶۶ء

(۳۹) وہی مصنف، سیرۃ النبی (جلد ۴) طبع دوئم، لاہور ۱۹۸۱ء

(۴۰) نعمانی، شبلی، سیرۃ النبی (جلد ۱) طبع چہارم، اعظم گڑھ (تاریخ ندارد)

(۴۱) وہی مصنف، الکلام و علم الکلام (۲ جلدیں) انوار المطابع، لکھنؤ ۱۳۴۰ھ

(۴۲) وہی مصنف، الفاروق، مدینہ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ، کراچی

(۴۳) نور احمد، مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے، مترجم رحمان مذنب، فیروز سنز، لاہور ۱۹۷۱ء

(۴۴) ولی اللہ، شاہ، حجۃ اللہ البالغہ (۲ جلدیں) مترجم خلیل احمد اسرائیلی، طبع اول، اسلامی اکادمی، لاہور ۱۹۷۷ء

(۴۵) المنجد، دارالاشاعت، کراچی، جولائی ۱۹۷۵ء

(۴۶) دائرہ معارف اسلامیہ (۲۴ جلدیں) دانش گاہ پنجاب، طبع اول، لاہور ۱۹۸۹ تا ۱۹۸۰

47) Adolf Hitler — Mein Kampf — Boston

48) Ameer Ali, S. — Sprite of Islam — London, 1923

49) Bernold Girn — The Time Table of History — New York, 1982

50) Gibbon — Decline & Fall of the Roman Empire — New York

51) Hurton Hunt — Sociology — 3rd. Edition, New York, 1972

52) Ibn Khaldun — The Muqaddimah. Translated by F. Rosenthal — London, 1967

53) Joseph, H. Fichter — Sociology — II Edition, University of Chicago Press, 1971

54) Nehru, J. Lal — Discovery of India — Bombay, 1964

55) Plato — The Statesman — Translated by J. B. Skemp — London, 1961

56) Robert Bierstedt — The Social Order — 4th Edition, New York, 1974

57) Historians History of the World (in 25 vol.) London, 1908

58) Harmsworth History of the World Revised Edition (in 15 vol.) London, 1914

59) Encyclopoedia of Social Sciences — New York, 1951

60) The Oxford English Dictionary — Oxford, 1978

کا ایک بڑا ذریعہ حج فراہم کرتا تھا۔ جب مختلف دبستان فکر اور مختلف مکاتیب کے اساتذہ وطالبان علم حج کے موسم میں ایک دوسرے سے ملتے تھے اور علوم فنون اور افکار ونظریات کا گہرا نہ تبادلہ عمل میں آتا تھا علم جغرافیہ کی ترقی میں بھی حج کا بڑا ہاتھ ہے۔ یا قوت رومی[۳۳] نے اپنے جغرافیہ تقویم البلدان کے مقدمہ میں مسلمانوں میں جغرافی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی حج کو قرار دیا ہے۔

جیسا کہ ارشاد کیا گیا حج ایک بین الاقوامی ایوان تجارت کا کام بھی دیتا ہے تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیاوی امور معلوم ہوتے ہیں لیکن سورہ مائدہ[۳۴] میں اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصول رزق کو بھی قرار دیا ہے کیونکہ حجاز کی خوشحالی و ترقی اسی میں پوشیدہ ہے اور خدا اس مرکز عظیم کو ویران و اجاڑ کرنا نہیں چاہتا۔

(۲) حج اسلامی وحدت کا ذریعہ ہے۔ یہ وحدت و اخوت مقامی پیانے پر نماز کے ذریعہ اور عالمی سطح پر حج کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے۔ حج کے مقررہ ایام میں پوری دنیا سے لاکھوں افراد مختلف راستوں سے اور مختلف ذرائع سے مکہ میں جمع ہوتے ہیں۔ ان کی شکلیں، رنگ، زبانیں اور لباس سب مختلف ہوتے ہیں لیکن میقات پر پہنچ کر سب ایک ہی طرز کا سادہ لباس (احرام) پہن لیتے ہیں۔ سب ایک مرکز (خانہ کعبہ) کے گرد گھومتے ہیں سب کی زبانوں پر ایک ہی زبان کا ایک ہی نعرہ (تلبیہ) ہوتا ہے۔ اخوت و وحدت کا اس سے شاندار نظارہ کوئی مذہب پیش نہیں کرسکا ہے شاہ و گدا اور امیر و غریب کی تخصیص کے بغیر سب ایک ساتھ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔ منیٰ میں سب اکٹھے قیام کرتے ہیں۔ عرفات میں اکٹھے وقوف ہوتا ہے۔ مزدلفہ میں رات کو چھاونی ڈالی جاتی ہے پھر سب ایک ساتھ منیٰ کی طرف پلٹتے ہیں ان تمام اعمال میں زبردست اجتماعیت اور وحدت و یک رنگی ہوتی ہے۔ جو ذہنوں پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تمام عصبیتوں کی نفی کرنے والی اس عبادت کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ ذہنوں کو فرقہ پرستی، مقامیت، گروہ بندیوں اور تفرقے سے پاک کرکے ان میں ایک روحانی آفاقیت کو جنم دیتی ہے۔